کلیاتِ پریم چند

2

مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

2

بازارِ حُسن

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ تعلیم (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

Kulliayt-e- Premchand-2

Edited by:
Madan Gopal

سنہ اشاعت : جنوری، مارچ 2000 شک 1921

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/76

سلسلہ مطبوعات : 846

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، ویسٹ بلاک 1۔ آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع: ویپ انٹرپرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1 سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے :
جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک،
تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ ''کلیاتِ پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

دیباچہ

اس سلسلے کے پہلی جلد میں ہم نے لکھا تھا کہ منشی پریم چند نے 1900 سے لے کر 1904 تک اردو میں تین اور ہندی میں ایک ناول لکھ ڈالے تھے۔ ہندی ناول اردو ناول کا ترجمہ تھا۔ اردو کے تین ناول تھے، اسرار معابد، کشنا، ہم خُرما و ہم ثواب۔ یہ تینوں ناول نواب رائے کے نام سے شائع ہوئے۔ تیسرے ناول کا ترجمہ پریما کے نام سے کیا گیا تھا۔ تینوں اردو ناولوں میں نومشقی کے سارے عیوب تھے۔ اس حقیقت کو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھے اپنے ایک خط میں قبول کیا ہے۔ اس کے بعد 11-1910 میں پریم چند نے ایک اور ناول لکھا۔ یہ تھا ''جلوہ ٔایثار'' اس کے مصنف بھی نواب رائے تھے اور پریم چند کو احساس تھا کہ یہ بھی کوئی اعلیٰ پایہ کی تصنیف نہیں ہے۔

اگلے چھ سالوں میں پریم چند مضامین لکھتے رہے یا افسانے انھیں شہرت بھی ملی، پھر ناول لکھنا شروع کیا۔ 1916 میں جب وہ اپنی زندگی کی چھتیسویں سال میں داخل ہوئے اور گورکھپور میں مقیم تھے، ایک ناول لکھا جس کا نام تھا بازارِ حُسن اور یہ پریم چند کا پہلا ضخیم ناول تھا۔ یہی پہلا ناول تھا جس کے مصنف کا نام ''ادیب فطرت نگار منشی پریم چند'' لکھا گیا تھا۔ اس میں مصنف نے ایک اخلاقی بے شرمی یعنی عصمت فروشی پر چوٹ کی۔

بازارِ حُسن کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے دوست زمانہ کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم کو 24جنوری 1917 کے خط میں لکھا تھا کہ ''میں آج کل ایک قصہ لکھتے لکھتے ناول لکھ چلا۔ یہ کوئی سو صفحے تک پہنچ چکا ہے ...... اب اس ناول میں ایسا جی لگ گیا ہے کہ دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔'' آگے لکھا کہ ''قصہ دلچسپ ہے اور مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ اب کی بار ناول نویسی میں بھی کامیاب ہوسکوں گا۔ لفظ ''بھی'' کا استعمال اہم ہے کیونکہ انھیں احساس تھا کہ افسانے کے فن میں وہ کامیابی حاصل کرچکے ہیں۔

پھر 2 مارچ کو لکھا "میرے پاس قصہ گوئی کے لیے نہ دماغ ہے نہ وقت۔ آج کل اپنا ناول لکھنے میں محو ہوں۔ یہ ختم ہوجائے تو اور کچھ کروں۔" ایک اور خط میں لکھا کہ افسانہ لکھنے کا کام اس لیے بند ہے کیونکہ دماغ ایک وقت میں کئی پلاٹ نہیں سنبھال سکتا۔

کام کتنی جلدی سے ہورہا تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ 12 مارچ 1917کو نگم صاحب کو اطلاع دی کہ ناول غالبًا ایک ماہ میں پورا ہوگا اور امید کرتا ہوں کہ مئی میں اُسے معائنے کے لیے حاضر کرسکوں گا۔ 8 اگست کو لکھا کہ ناول ختم کررہا ہوں۔

جب ناول مکمل ہوگیا تو اب مسئلہ درپیش اس کی اشاعت کا تھا۔ دارالاشاعت کے پروپرائٹر اور کہکشاں کے ایڈیٹر امتیاز علی تاج کو لکھا کہ " اِدھر اردو کے پبلشروں کا قحط ہے۔ایک نول کشور پریس ہے۔ جس نے اشاعت کا کام بندکر رکھا ہے اگر آپ کی معرفت وہاں (لاہور میں) انتظام ہوسکے تو فرمایئے۔" زمانہ پریس میں اشاعت کا کام نہیں ہورہا تھا۔ مسئلہ یہ تھاکہ ناول کیسے اور کہاں سے شائع ہو۔ تذبذب میں تھے سوچا کیوں نہ اسے کسی رسالے میں قسط وار شائع کیاجائے۔ زمانہ میں قسط وار کوئی ناول نہیں چھپا تھا۔ پھر بھی پریم چند نے نگم کو لکھاکہ "اگر آپ اس ناول کو مسلسل دینا چاہیں تو کیسا ہو؟ " اس کا جواب خودہی دے دیا۔ "رسالے کی موجودہ ضخامت بھی اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکتی۔"

پھرکہکشاں کے ایڈیٹر تاج کو بھی لکھا۔ "ناول کوئی تین سو صفحات کا ہے اس کے لکھنے میں میں نے اپنی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ کتاب کی صورت میں اب تک اس لیے نہیں نکال سکا کہ مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ تمام و کمال ایک بار صاف کرسکوں۔ ماہوار دس بیس صفحے تو ممکن ہیں لیکن یکبارگی تین سو صفحات کا خیال کرکے حوصلہ چھوٹ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہکشاں میرا ناول بازارِحُسن بالترتیب نکال سکے۔ (یہ بھی) ممکن ہے کہ اس کے نکلنے سے پرچہ کی اشاعت پر کچھ اثر پڑے۔" پھر جیسا زمانہ کے ایڈیٹر کو لکھاتھا ویساہی کہکشاں کے ایڈیٹر کو بھی لکھا۔"مگرجب تک کہکشاں کی اشاعت معقول نہ ہوجائے ناول نکالنے کا خیال قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔"

جہاں اردو کا یہ حال تھا وہاں ہندی کے ایک پبلشر کو دلچسپی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ جہاں اردو میں قاضی سرفراز حسین کا شاہدِرعنا اور مرزا ہادی رسوا کا امراؤجان ادا جیسے ناول موجود تھے، ہندی میں نہیں تھے۔ گورکھپور میں ایک پبلشر تھے مہابیرپرساد پوتدار انھوں نے ایک ہندی پُستک ایجنسی قائم کی تھی پھر کلکتہ میں پریس خرید لیا اور ایجنسی کی شاخ وہاں

بھی قائم کرلی تھی۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1916 کو امتیاز علی تاجؔ کو لکھا کہ بازارِ حُسن تقریباً تین سو صفحات کا ہوگا۔ لکھا ہوا تیار ہے محض عدم الفرصتی کے باعث اب تک صاف نہ کرسکا۔ اگر آپ اتنی بڑی کتاب چھاپ سکیں تو میں صاف کرنا شروع کروں ورنہ ابھی گرمی کی تعطیل تک ملتوی رکھوں۔ آپ کو تکلیف نہ دوں گا۔ کیونکہ صاف کرنے میں اکثر قصہ کے سین کے سین پلٹ جاتے ہیں۔ 10نومبر 1918 کو امتیاز علی تاج کو لکھا کہ ہندی پبلشر اُسے جلدی نکالنا چاہتا ہے، پریم چند نے اس کا ہندی ترجمہ کیا۔ پوتدار نے کلکتہ بلایا پریم چند گئے اور ہندی میں اس کی اشاعت کا انتظام ہوگیا۔ اس ناول کو نام دیا گیا سیوا سدن۔ اس کے پہلے ایڈیشن پر سنِ اشاعت لکھا ہے 1918۔ سیوا سدن کے نکلتے ہی دھوم مچ گئی۔ ہندی رسائل نے اس کی دل کھول کر تعریف کی۔ پریم چند نے نگم کو لکھا ''آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی ہے۔ اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ بازارِ حُسن کا ترجمہ ہے۔ بازارحسن اب صاف کررہا ہوں۔'' ہندی پُستک ایجنسی نے پریم چند کو معاوضے کے طور پر چارسو روپے دیے۔ پریم چند کو اردو میں اتنی رقم کی امید نہ تھی۔ ''21 سطری صفحہ حساب سے بارہ آنہ فی صفحہ منظور کرنے میں مجھے تامل نہیں ہوگا۔ یہ میرا پہلا ضخیم ناول ہے مجھے اس کی اشاعت کی فکر ہے۔''

بازارِ حُسن میں پھر تعویق ہوئی۔ ''یہ خیال ہوا کہ دس دن کی پھر تعطیل ہورہی ہے۔ ممکن ہے پانچ یا چھ سو صفحات اور نقل ہوجائیں تو اکٹھے بھیجوں۔ اس لیے روک دیا۔ خیر، رفتہ رفتہ صاف ہورہا ہے۔ ارادہ ہے ایک محرر رکھوں، کام جلدی سے ختم کروں۔'' ڈیڑھ مہینے بعد۔'' بازارِ حُسن کے تین سو صفحات ہوگئے ہیں۔ صرف دوسو باقی ہیں۔ آپ کو اگر فرصت ہوتو میں تین سو صفحات چلتا کروں۔ جب تک آپ دیکھیں گے کاتب لکھے گا تب تک دوسو صفحات پورے کردوں گا جو دو گھنٹہ روزانہ کے حساب سے ایک ماہ کا کام ہے۔'' 24مارچ 1920 ''بازارِ حُسن کے اب کل 38 صفحات باقی ہیں۔ ایک اپریل کو آپ کے پاس رجسٹرڈ پہنچ جائیں گے۔'' اور یہی ہوا ''پیکٹ بنا تیار ہے۔ آج ڈاک خانہ بند، آپ اسے ایک بار سرسری طور پر دیکھ جائیں اور تب اس کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ تاجؔ نے ناول کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو پریم چند نے لکھا ''آپ نے جو کچھ فرمایا ہے سب آپ کی قدر افزائی ہے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر جناب اس پر اپنی تبصرانہ رائے

سے بھی مطلع فرمائیں۔اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔ نقاد ہیں کہاں، مجھے تو اس کی آرزو رہتی ہے کہ کوئی مجھے خوب نیک و بد سمجھائے۔"

اب رہی معاوضہ کی بات، پریم چند نے تاؔج کو لکھا "بازارحسن آپ شائع کریں۔ شرائط کے متعلق عرض ہے۔ آپ پہلے اڈیشن کے لیے مجھے 20 فی صدی رائلٹی عطا فرمائیں۔ پہلا اڈیشن 1200 نسخوں کا ہو۔ غالبًا (ایک روپیہ آٹھ آنے) قیمت رکھی جائے۔ مجھے 240 جلدیں ملیں۔ یہ جلدیں خواہ مجھے جلدوں کی صورت میں دے دی جائیں یا روپے کی صورت میں۔ روپیہ کی صورت میں دینے سے وہی کمیشن جو میں کسی دوسرے بک سیلر مثلاً رسالہ زمانہ کو دوں گا آپ کو وضع کردوں گا۔ اگر آپ اسے پسند فرمائیں تو مجھے جلدیں ہی دے دیں۔ میں کسی طرح بیچوں یا بکاؤں گا اگر ان صورتوں میں کوئی پسند نہ ہو تو مجھے پہلے اڈیشن کے لیے 250 روپے پورے عطا فرمائیں۔ ہندی میں مجھے 500 روپے ملے۔ گجراتی اڈیشن کے 100روپے ،آپ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ 250 روپے غالبًا ضرورت سے زیادہ مطالبہ نہیں ہے۔ میری ڈیڑھ سال کی محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ اگر یہ شرطیں آپ کو ناگوار معلوم ہوں تو اپنی مرضی کے مطابق شائع کرکے مجھے جو چاہیں دے دیں۔

27 مئ 1920 بازارحسن کے متعلق۔ "آپ اسے اگر ہمیشہ کے لیے چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ میں اردو پبلشروں سے واقف ہوں یہاں ہمیشہ کے معنی ہے زیادہ سے زیادہ تین اڈیشن اور وہ دس سالوں میں یا اس سے بھی زیادہ۔ اس لیے میں ایسی شرطیں ہرگز نہیں پیش کرسکتا جو نامعقول ہوں۔ میرے خیال میں پہلے اڈیشن کے لیے آپ 20 فی صدی رکھیں اور بقیہ دو اڈیشنوں کے لیے 10 فی صدی یعنی کل رقم 350 روپے ہوتے ہیں۔ یہ حساب میں نے کل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو ناگوار نہ ہوگا۔"

25جون 1920 ۔"بہتر ہے بازارِحُسن دوحصوں میں شائع ہو میرے خیال میں بھی یہی تجویز تھی کتاب اور چھپائی کے کام میں وقت لگتا ہے۔"

18اگست 1921 ۔کو لکھا "بازارحسن کا اللہ ہی محافظ ہے۔"

ایک ہفتہ بعد۔"بازارحسن کی کتابت ہونے لگی بڑی خوشی کی بات ہے"؟

دوماہ بعد لکھا: "بہت خوش ہوں کہ بازارحسن کی کتابت ختم ہوئی بیشک شاؔنتا کے خط

کا ایک حصہ نقل کرنے سے رہ گیا۔ آپ نے خوب گرفت کی اسے پورا کیے دیتا ہوں۔
"میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ مجھ پر رحم کیجیے۔ یہاں کی حالت کیا لکھوں پتاجی گنگا میں ڈوب گئے آپ لوگوں پر مقدمہ چلانے کی صلاح ہورہی ہے۔ میری دوبارہ شادی ہونی قرار پائی ہے جلدی خبر لیجیے۔ ایک ہفتہ تک آپ کی راہ دیکھوں گی، اس کے بعد اس بیکس یتیم کی فریاد آپ کے کانوں نہ پہنچے گی۔"

آٹھ مہینے بعد۔ "مجھے مطلق خبر نہیں کہ بازار حسن کی اشاعت کا انتظام ہوا ہے اور اس میں ابھی کتنی دیر ہے۔"

پانچ مہینے بعد۔ "بازار حسن کی باقی کتابت ابھی ختم ہوئی یا نہیں کتاب کے شائع ہونے کا کب تک انتظار کروں" ۔ 18فروری 1922 کو لکھا: "میرا ہندی ناول ختم ہوگیا ہے اب اردو کا کام جلدی ہوگا۔ جب بازارِ حُسن پریس سے نکلے گا شاید نئے ناول کا حصہ اول آپ کی خدمت میں حاضر ہوجائے گا۔" ظاہر ہے 1921 کے آخری دنوں میں بازار حسن تقریباً تیار تھا۔ اس میں سنِ اشاعت 1921 لکھا ہے۔ اس طرح اس کو شائع ہونے میں پانچ سال لگے۔

مدن گوپال

گورکھپور کا وہ مکان جہاں پریم چند نے بازارِ حسن کی تخلیق کی تھی۔

بازارِ حُسن

انسان کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں۔ جب اُسے اپنی نیکیوں پر پچھتانا پڑتا ہے ۔ داروغہ کرشن چندر کی زندگی میں یہ ایسا ہی موقع تھا۔ اپنی پچیس سال کے دورانِ ملازمت میں انھوں نے اپنے دامن کو حرص سے پاک کررکھا تھا۔ اس زمانہ میں بھی جب طبیعت اسبابِ عیش کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ اورجب دل پر وارستگیوں کا نشہ چھایا رہتاہے۔ انھوں نے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی ثقاہت اور بے نیازی پرافسوس کررہے تھے۔ ان کی بیوی گنگاجلی نے انھیں ہمیشہ ترغیبوں سے بازرکھا تھا،لیکن اس وقت وہ بھی متفکر تھی۔ تسکین اور تشفی کے الفاظ اس کی زبان سے نہ نکلتے تھے۔

داروغہ کرشن چندر بڑے خلیق، خوش مذاق، نفاست پسند آدمی تھے۔ ماتحتوں کے ساتھ ان کا سلوک دوستانہ اور برادرانہ ہوتاتھا۔ لیکن ماتحتوں کی نگاہ میں ان کے اس برتاؤ کی قدر نہ تھی۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ یہاں ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ یہ نرمی و اخلاق نذرونیاز کا نعم البدل نہ ہوسکتی تھی۔ وہ لقمہ تر چاہتے تھے۔ خواہ اس کے ساتھ کچھ تیکھی کڑوی باتیں سننی پڑیں۔ افسر اور حکام بھی داروغہ جی سے خوش نہ رہتے تھے۔ دوسرے تھانوں میں ان کا دورہ ہوتا تو ان کی بڑی خاطر مدارات ہوتی۔ ان کے اہلمد، محرّر اور اردلی ہفتوں دعوتیں اُڑاتے اہلمد کو نذریں ملتیں۔ اردلی انعام پاتا۔ افسروں کو ڈالیاں پیش کی جاتیں۔پر کرشن چندر کے یہاں ان مدارات کا ذکر نہ تھا۔ اُن کی یہ بے نیازی سرکشی سے تعبیر کی جاتی تھی۔

مگر اس دیانت کے باوجود داروغہ جی کے مزاج میں کفایت کو دخل نہ تھا۔ وہ اپنے ذاتی مصارف میں بڑی احتیاط رکھتے تھے۔ پر اپنے اہل خاندان کو ہر ایک قسم کی آسائش پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ کثیر العیال نہ تھے بیوی کے سوائے دولڑکیاں اور تھیں۔ پر ان کی ساری کمائی اسی چھوٹے سے کنبے کی پرورش میں صرف ہوجاتی تھی۔ بازار میں طرح دار کپڑا

دیکھ کران سے صبر نہ ہوتا قنوج کا عطر، نگینہ کا قلمدان، آگرہ کی دریاں جہاں بکتے دیکھتے لٹو ہوجاتے۔ کوئی مالِ مفت پر بھی اس طرح نہ ٹوٹتا ہوگا۔

گنگا جلی سلیقہ شعار عورت تھی، انھیں سمجھایا کرتی کہ ذرا ہاتھ روک کر خرچ کرو زندگی میں اور کوئی کام نہیں ہے تو دولڑکیوں کی شادی تو کرنی ہی ہیں۔ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھروگے لیکن داروغہ جی ان باتوں کو ہنسی میں ٹال دیتے ۔ کہتے ''جس طرح اور کام چلتے ہیں۔ اسی طرح یہ کام بھی ہوجائے گا''۔ کبھی جھنجلا کر کہتے ''تم ایسی ایسی باتیں کہہ کر میرے اوپر فکر کا بوجھ مت ڈالو۔'' اس طرح دن گزرتے چلے جاتے تھے۔

دونوں لڑکیاں نازونعمت میں پرورش پاکر کنول کی طرح کھلتی جاتی تھیں ۔بڑی لڑکی سُمن نازک اندام ،چنچل، شریر، متکبّر، نفاست پسند تھی۔ چھوٹی لڑکی شانتا شیریں سخن، متین اور بھولی۔ سُمن ہمیشہ بہتر کی خواہشمند رہتی تھی۔ اگر بازار سے ایک ہی قسم کی دوساڑیاں آتیں۔ تو ان کی طرف سے منہ پھیرلیتی تھی۔ شانتا بے عذر تھی۔ اسے جو کچھ مِل جائے اسی میں خوش رہتی تھی۔

گنگا جلی پُرانے خیال کی عورت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح لڑکیوں کی شادی جلد ہوجائے۔ پر داروغہ جی ٹال کر کہتے،''یہ ابھی بہت کم سِن ہیں۔ شاستروں میں لکھا ہے کہ سولہ برس سے پہلے شادی نہ کرنی چاہیے''۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ ممکن ہے پردۂ غیب سے کوئی مدد مِل جائے۔ وہ اخباروں میں جب جہیز کی مخالفت کے ریزولیوشن پڑھتے تو بہت خوش ہوتے۔ گنگا جلی سے کہتے''سال دوسال میں یہ بیہودہ رسم مٹی جاتی ہے۔ زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔'' یہاں تک کہ سُمن کا سولہواں سال آگیا۔

اب داروغہ جی اپنے تئیں زیادہ دھوکا نہ دے سکے۔ اِن کی بے فکری وہ پُراعتماد بے فکری نہ تھی۔ جو اپنے مقدور کے صحیح انداز سے پیداہوتی ہے۔اس کی بنیاد سہل پسندی پر تھی۔ اس مسافر کی طرح جو دن بھر کسی سایہ دار درخت کے نیچے آرام سے سونے کے بعد شام کو چونکے۔ اور سامنے ایک اونچا پہاڑ دیکھ کر ہمّت ہار بیٹھے۔ داروغہ جی بھی گھبرا اُٹھے۔ بر کی تلاش میں دوڑنے لگے۔کئی جگہ سے زائچہ منگوائے۔ وہ تعلیم یافتہ خاندان چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے خاندانوں میں داد وستد کا ذکر نہ آئے گا۔ پر پھر انھیں یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ بَروں کی قیمت ان کی تعلیم کے اعتبار سے طلب کی جاتی ہے۔جب

زائچہ مطابق ہوجانے پر تفصیلوں کی نوبت آتی۔ تو کرشن چندر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھاجاتا۔ کوئی چارہزار سناتا۔ کوئی پانچ ہزار اور کوئی اس سے بھی آگے کی خبر لیتا تھا۔ بیچارے مایوس ہوکر لوٹ آتے۔ آج چھ ماہ سے وہ اسی تردد میں پڑے ہوئے تھے۔ لیکن مشکل آسان ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم یافتہ حضرات کو ان سے ہمدردی تھی، پر وہ ایک نہ ایک ایسی پیچ نکال دیتے تھے کہ داروغہ جی کو لاجواب ہوجانا پڑتا تھا۔ ایک صاحب نے فرمایا ''جناب میں اس بیہودہ رسم کا جانی دشمن ہوں۔ پر کروں کیا؟ ابھی پچھلے سال لڑکی کی شادی درپیش تھی۔ دوہزار روپے صرف جہیز کے دینے پڑے۔ دوہزار اور خوردونوش میں صرف ہوئے۔ آپ ہی فرمائیے یہ خسارہ کیوں کر پورا ہو؟'' ایک دوسرے صاحب نے فرمایا۔''جناب میں نے لڑکے کی پرورش کی ہے اس کی تعلیم میں ہزاروں روپیہ خرچ کیے ہیں۔ آپ کی لڑکی کو اس سے اتنا ہی فائدہ ہوگا۔ جتنا میرے لڑکے کو۔ توآپ ہی ازروئے انصاف فرمائیے۔ ان مصارف میں آپ کو شریک ہونا چاہیے یا نہیں؟'' اس منطق کا داروغہ جی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس طرح کے متواتر تجربات نے کرشن چندر کو مایوس کردیا۔ اپنی دیانت اور ثقاہت انھیں اپنی ہی نظروں میں ایک گناہ معلوم ہونے لگی۔ اور اس وقت وہ پچھتا رہے تھے۔ کاش میں اس حماقت میں نہ پڑتا۔ تو آج مجھے یوں ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں بڑی دیر کے بعد کرشن چندر بولے،''دیکھا۔ دنیا میں دیانت اور راستبازی کی یہ قدر ہوتی ہے۔ اگر میں نے بھی حلقہ کو لوٹ کر اپنا گھر بھر لیا ہوتا۔ تو آج میری لڑکی شادی کرنے کو لوگ دوڑتے۔ نہیں تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ شاید پرماتما بھی دیانت کا دشمن ہے۔ اب دوہی باتیں ممکن ہیں۔ یا تو لڑکی کو کسی کنگلے کے گلے مڑھ دوں یا سونے کی چڑیا تلاش کروں۔ پہلی بات تو ہونے سے رہی۔ بس اب سونے کی چڑیا کی فکر کرتاہوں۔ دیانت کا مزہ چکھ لیا۔ اب لوگوں کے گلے دباؤں گا۔ رشوتیں لوں گا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ دنیا یہی چاہتی ہے۔ قوم یہی چاہتی ہے۔ اور غالباً ایشور بھی یہی چاہتا ہے۔ میں بے گناہ ہوں مجھے بے ایمان بننے پر مجبور کیا جارہاہے۔ غریبوں کے ستانے کے لیے میرا گلا دبایا جارہاہے۔ ایسا ہی سہی آج سے میں بھی وہی کروں گا۔ جو اور لوگ کرتے ہیں۔''

گنگاجلی سرجھکائے شوہر کی یہ کلفت آمیز باتیں سُن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں

آنسو تھے اور زبان بند تھی۔

(۲)

داروغہ جی کے حلقے میں ایک مہنت رام داس رہتے تھے۔ وہ سنیاسیوں کی ایک گدّی کے مہنت تھے۔ ان کے یہاں سارا کاروبار بانکے بہاری نام پر ہوتا تھا۔ بانکے بہاری لین دین کرتے تھے۔ اور بتیس روپیہ فی صد سے کم سود نہ لیتے تھے۔ وہ بونے کے لیے غلّہ دیتے۔ اور ایک کے ڈیڑھ وصول کرتے وہی مقدمات دائر کرتے وہی رہن نامے، بیع نامے لکھواتے۔ بانکے بہاری کی رقم کو دبانے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ اور نہ اپنی رقم کے لیے کوئی دوسرا آدمی ان سے سخت تقاضا کرسکتا تھا۔ کیونکہ انھیں ناراض کرکے اس جوار میں رہنا مشکل تھا۔ مہنت رام داس کے یہاں دس بیس موٹے تازے سادھو مستقل طور پر رہتے تھے۔ وہ اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتے صبح کو بھینس کا تازہ دودھ پیتے۔ شام کو دودھیا بھنگ چھانتے اور گانجے و چرس کا تو سارے دن دورہ رہتا تھا۔ ایسے زبردست جتھے کے مقابلے میں سر اُٹھانے کی کون جرأت کرتا مہنت جی کی حکّام کے یہاں بھی خوب رسائی تھی۔ انھیں بانکے بہاری خوب موتی چور کے لڈّو اور موہن بھوگ کھلاتے۔ ان کے تبرّک سے کون انکار کرسکتا تھا۔ دُنیا میں آکر ایشور بھی اہلِ دُنیا کی پیروی کرتے تھے۔

مہنت جی جب اپنے علاقہ کی نگرانی کو چلتے تو ان کا جلوس شاہانہ کرّوفر کے ساتھ نکلتا تھا۔ آگے آگے بانکے بہاری جی کی سواری ہوتی تھی۔اس کے پیچھے پالکی پر مہنت رامداس ہوتے تھے۔ اس کے بعد سادھوؤں کی فوج رام نام کے جھنڈے لیے اپنا جلوہ دکھاتی تھی۔ اونٹوں پر خیمے، شامیانے، بیل گاڑیوں پر سازوسامان لدے ہوتے تھے۔ یہ فوج جس گاؤں میں جا نکلتی۔ اس کی شامت آجاتی تھی۔

امسال مہنت جی تیرتھ کرنے گئے تھے۔ وہاں سے واپس آکر انھوں نے ایک جشن کیا تھا۔ پانچ ہزار سادھوؤں کی دعوت تھی۔ مہینوں تک کڑھاؤ جلتے رہے اس یگیہ کے لیے علاقہ کے سارے اسامیوں سے ہل پیچھے پانچ روپیہ چندہ وصول کیا گیا تھا۔ کسی نے خوشی سے دیا کسی نے قرض لے کر دیا۔ اور کسی نے دستاویز لکھ دی۔ بانکے بہاری کے حکم سے کون سر پھیر سکتا تھا۔ اگر ٹھاکر جی کو ہار ماننی پڑی تو ایک اہیر سے جس کا نام چیتو تھا۔ چیتو بڈھا مفلس آدمی تھا۔ کئی سال سے اس کی فصل خراب ہورہی تھی۔ اس پر تھوڑے ہی دن

ہوئے بانکے بہاری جی نے اضافہ لگان کی نالش کرکے اسے قرض کے بوجھ سے اور بھی دبادیا تھا۔ چیتو نے یہ چندہ دینے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ رقعہ بھی نہ لکھا۔ بانکے بہاری کا قہر اس نافرمانی کو برداشت نہ کرسکا۔ ایک دن کئی چیلے اُٹھے۔ اور چیتو کو پکڑ لائے۔ مندر کے سامنے اس پر مار پڑنے لگی چیتو بھی بگڑا۔ ہاتھوں سے تو معذور تھا پر زبان سے لات گھونسوں کا جواب دیتا رہا۔ اور اس وقت تک باز نہ آیا۔ جب تک کہ زبان بند نہ ہوگئی وہ اس زد و کوب سے جانبر نہ ہوسکا۔ اور اسی رات کو چل بسا۔ اور علی الصباح چوکیدار نے تھانے میں رپٹ کی۔ داروغہ کرشن چندر کو ایسا معلوم ہوا کہ ایشور نے بیٹھے بٹھائے ایک سونے کی چڑیا ان کے پاس بھیج دی۔ تحقیقات کرنے چلے۔ لیکن اس علاقہ میں مہنت جی کی ایسی دھاک جمی ہوئی تھی کہ داروغہ جی کو کوئی شہادت نہ مل سکی۔ لوگ تخلیہ میں آکر ان سے سارا قصہ کہہ جاتے پر علانیہ کسی کو اپنا بیان دینے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔

اسی طرح تین چار روز گزر گئے۔ مہنت جی پہلے تو اکڑے رہے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ راز فاش نہ ہوسکے گا۔ لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ داروغہ جی نے کئی آدمیوں کو پھوڑلیاہے ۔ تو درپردہ سلسلہ جنبانی کرنے لگے ۔ اپنے مختار کو داروغہ جی کے پاس بھیجا ۔ داد و ستد کی گفتگو شروع ہوئی داروغہ جی نے کہا۔"میرا حال تو آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ رشوت کو کالا ناگ سمجھتاہوں۔" مختار نے جواب دیا۔"جی ہاں یہ تو معلوم ہے۔ پر فقرا پر تو عنایت کی نظر رہنی چاہیے۔" اس کے بعد دونوں آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ مختار نے کہا۔ "نہیں جناب پانچ ہزار بہت ہوتے ہیں مہنت جی کو آپ جانتے ہیں۔ وہ اپنی ضد پر آجائیں گے، تو چاہے پھانسی ہی ہوجائے۔ پر ایک جو بھر نہ ہٹیں گے۔ ایسا کیجیے کہ ان کو بھی تکلیف نہ ہو۔ اور آپ کا بھی مقصد حاصل ہوجائے۔" آخر تین ہزار پر معاملہ طے ہوا۔ پر کڑوی دوا خرید کرلانے، اس کا جوشاندہ بنانے اور اسے اُٹھاکر پینے میں بڑا فرق ہے۔ مختار تو مہنت کے پاس گیا۔ اور کرشن چندر سوچنے لگے کہ میں کیا کررہاہوں؟ ایک طرف تو سیم وزر کا ڈھیر تھا۔ اور ایک فکر جانکاہ سے آزاد ہونے کی اُمید۔ دوسری طرف اپنے ضمیر کا خون اور انجام کا خوف۔ نہ ہاں کرنے کی ہمت تھی نہ نہیں کرنے کی طاقت یا مدت العمر کی ثقاہت اور جرم کے بعد اس وقت اپنے ایمان کا خون کرنے میں داروغہ جی کو روحانی صدمہ ہورہا تھا۔ وہ سوچتے تھے۔ اگر یہی کرناتھا۔ تو آج سے پچیس سال پہلے کیوں نہ کیا؟ اب تک

تو سونے کی دیوار کھڑی کرلی ہوتی۔ تعلقے لے لیے ہوتے۔ زندگی بھر فقیرانہ قناعت سے بسر کرنے کے بعد آخری ایام میں یہ داغ سیاہ! مگر نفس سمجھاتا اس میں تمھاری کیا خطا ہے، تم سے جب تک نبھ سکا نباہا۔ اپنے عیش و آرام کے لیے نیت میں فتور نہیں آنے دیا لیکن جب قوم کے رسم و رواج اپنے بھائیوں کی حرص، اور ایک مقدس فرض تمھیں راہ مستقیم سے الگ ہونے پر مجبور کررہے ہیں۔ تو اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمھارا ضمیر اب بھی پاک ہے تم ایشور کے سامنے اب بھی بے گناہ ہو۔ اس استدلال سے داروغہ جی نے اپنے تئیں تشفی دی۔

لیکن اب دوسری منزل باقی تھی۔ انجام کا خوف داروغہ جی نے کبھی دستِ حرص نہیں بڑھایا تھا۔ ہمّت نہ کھلی تھی۔ جس شخص نے کبھی کسی پر ہاتھ نہ اُٹھایا ہو وہ یکایک کسی پر تلوار کا وار نہیں کرسکتا۔ وہ سوچتے تھے کہ کہیں رازافشا ہوجائے تو اپنی کیا حالت ہو! جیل خانہ کے سوائے اور کہیں ٹھکانہ نہیں۔ ساری زندگی کی نیک نامی خاک میں مِل جائے گی۔ ضمیر کو دلیلوں سے سمجھانا آسان ہے۔ لیکن خوفِ پاداش کو دلیلوں سے اطمینان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے اخفا کی ضرورت ہے۔ داروغہ جی نے حتی الامکان اس معاملہ کو خفیہ رکھا۔ مختار سے تاکید کردی کہ اس بات کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہ پڑنے پائے۔ تھانہ کے کانسٹبلوں اور عملوں سے بھی یہ باتیں پوشیدہ رکھّی گئیں۔

رات کے نو بجے تھے۔ داروغہ جی نے اپنے تینوں کانسٹبلوں کو کسی حیلہ سے تھانہ بھیج دیا تھا۔ چوکیدار بھی رسد کا سامان فراہم کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑا دیے گئے تھے اور وہ خود اکیلے بیٹھے ہوئے مختار کی راہ دیکھ رہے تھے۔ مختار ابھی تک نہیں لوٹا۔ کرکیا رہاہے؟ چوکیدار آکر گھیر لیں گے تو بڑی مشکل ہوگی۔ اسی لیے میں نے کہہ دیاتھا۔ کہ جلد آنا۔ اچھا مان لو جو مہنت تین ہزار پر بھی راضی نہ ہوا تو؟ نہیں اس سے کم نہ لوں گا۔ داروغہ جی دل میں حساب لگانے لگے۔ کہ کتنے روپے جہیز میں دوں گا۔ اور کتنے کھانے پینے میں صرف ہوں گے کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد مختار صاحب نظر آئے۔ اُمیدوبیم سے داروغہ جی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ وہ چارپائی پر سے اُٹھ بیٹھے۔ اور بے غرضی کے اظہار کے لیے پان لگانے لگے کہ اتنے میں مختار اندر آیا۔

کرشن چندر۔ کہیے؟

مختار۔ مہنت جی نے..........''

کرشن چندر نے دروازہ کی طرف دیکھ کر کہا ''روپیہ لائے یا نہیں؟''

مختار۔ جی ہاں لایا تو ہوں۔ پر مہنت جی نے..........

کرشن چندر نے پھر چاروں طرف چوکنی نگاہوں سے دیکھ کہا''میں ایک کوڑی بھی کم نہ لوں گا۔

مختار۔ اچھا میرا حق تو دیجیے گا نہ؟

کرشن چندر۔ اپنا حق مہنت جی سے لینا۔

مختار۔ پانچ روپیہ سیکڑے تو ہمارے بندھے ہوئے ہیں۔

کرشن چندر۔ اس میں سے ایک کوڑی بھی نہ ملے گی۔ میں اپنے ضمیر کا خون کررہاہوں لوٹ نہیں رہاہوں۔

مختار۔ آپ کی جیسی مرضی پر میری حق تلفی ہوتی ہے۔

فوراً بہلی تیار ہوئی اور دونوں صاحب بیٹھ کر چلے۔ بہلی کے آگے پیچھے چوکیداروں کی فوج تھی۔ کرشن چندر اُڑکر گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ گاڑی بان سے باربار ہانکنے کی تاکید کرتے۔ آخر گیارہ بجتے بجتے یہ لوگ تھانہ پہنچ گئے۔ گنگاجلی ابھی تک ان کی راہ دیکھ رہی تھی بولی۔ ''اتنی دیر کیوں کی؟''

کرشن چندر۔ کام ہی ایسا آپڑا اور دور بھی بہت ہے۔

کھانا کھاکر داروغہ جی لیٹے پر نیند نہ آتی تھی۔ گنگاجلی سے ان روپیوں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ باربار شوہر کے منہ کی طرف تاکتی تھی گویا پوچھتی تھی کہ بچے یا ڈوبے۔

آخر کرشن چندر بولے۔''اگر تم ندی کنارے کھڑی ہو اور پیچھے سے ایک شیر تمھاری طرف جھپٹے تو کیا کروگی؟''

گنگاجلی یہ کنایہ سمجھ کر بولی۔''ندی میں چلی جاؤں گی۔''

کرشن چندر۔ اچھا اگر تمھارے گھر میں آگ لگی ہو۔ اور دروازے بند ہوں تو کیا کروگی؟

گنگاجلی ۔ چھت پر سے نیچے کود پڑوں گی۔

کرشن چندر۔ اُن سوالوں کا مطلب سمجھاؤ۔

گنگا جلی نے کہا، "کیا ایسی بے سمجھ ہوں۔"

کرشن چندر۔ میں بھی کود پڑا۔ بچوں گا یا ڈوبوں گا۔ معلوم نہیں۔

(۳)

پنڈت کرشن چندر کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ مالِ حرام تنہا مشکل سے ہضم ہوتا ہے۔ رشوت ستانی کے فن میں ابھی نومشق تھے۔ انھوں نے تنہا خوری کی نیت سے اخفا کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ بدنامی کے خوف سے۔ لیکن ان کی یہ کوشش ان کے حق میں قاتل ثابت ہوئی۔ مختار نے اپنے دل میں کہا "ہمیں نے سب کچھ کیا اور ہمیں سے یہ چال! ہمیں کیا پڑی تھی۔ کہ دردِ سر مول لیتے۔ اور رات دن بیٹھے تمھاری خوشامد کرتے۔ مہنت پھنستے یا بچتے میری بلا سے۔ مجھے تو اپنے ساتھ نہ لے جاتے۔ تم خوش ہوتے یا ناراض میری بلا سے۔ میں نے جو اس قدر دوڑدھوپ کی وہ کچھ اُمید ہی رکھ کر کی۔"

وہ داروغہ جی کے پاس سے اُٹھ کر سیدھے تھانہ میں آئے۔ اور باتوں ہی باتوں میں سارا بھانڈا پھوڑدیا۔ عملوں نے کہا "واہ ہم سے یہ چال! ہم سے چھپا چھپا کے یہ رقمیں اڑائی جاتی ہیں۔ گویا ہم سرکار کے نوکر ہی نہیں! دیکھیں تو یہ مال کیسے ہضم ہوتاہے اس بگلا بھگت پن کا پردہ فاش نہ کردیا تو کہنا۔

کرشن چندر غفلت کے نشہ میں مست۔ شادی کی فکر کررہے تھے۔ ایک متمول گھرانے میں شادی تجویز ہورہی تھی۔ طرفین سے آمدورفت و گفت وشنید جاری تھی اور اُدھر حکام کے پاس خفیہ خطوط روانہ کیے جارہے تھے ان میں صورتِ حال ایسی صفائی سے بیان کی گئی تھی کہ شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ افسروں نے خفیہ تحقیقات کی۔ اور ان پر سارا قصہ روشن ہوگیا۔

ایک مہینہ گزرچکا تھا۔ شادی کی ابتدائی رسمیں شروع ہونے والی تھیں۔ داروغہ جی تھانہ میں تخت پر مسند لگائے لیٹے ہوئے تھے۔ کہ سامنے سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کئی کانسٹبلوں اور دوتھانہ داروں کے ساتھ آتے ہوئے نظر آئے۔ کرشن چندر گھبراکر اُٹھ بیٹھے ابھی تک انھیں مطلق علم نہ تھا کہ افسروں نے خفیہ تحقیقاتیں کرکے حقیقت حال دریافت کرلی ہے۔ اور مواخذہ کے لیے ثبوت فراہم کرلیے ہیں۔

ایک سب انسپکٹر نے جیب سے گرفتاری کا وارنٹ نکال کر کرشن چندر کو دکھایا ان کا

چہرہ زرد پڑگیا۔ ایک سکتے کی حالت میں سر جھکاکر کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہرہ پر خوف نہ تھا۔ ندامت تھی۔ یہ وہی دونوں سب انسپکٹر تھے۔ جن کے سامنے وہ غرور سے گردن اُٹھاکر چلتے تھے۔ جنھیں وہ حقیر سمجھتے تھے۔ ساری عمر کی نیک نامی ایک لمحہ میں خاک میں مل گئی۔ نفس نے کہا ،"اپنے اعمال کا خمیازہ اُٹھاؤ۔ میں نہ کہتا تھا کہ اس آگ میں نہ کودو۔ تم نے میرا کہنا نہ مانا اگر تم نے کسی معمولی خاندان میں شادی کرنے پر قناعت کی ہوتی۔ تو آج یہ نوبت کیوں آتی؟ مگر تمھیں تو اپنے عزّت اور وقار کی پڑی تھی۔ لو اب اس سودائے خام کا مزہ چکھو۔"

سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔"کرشن چندرتم اپنے بارے میں کچھ کہناچاہتا ہے؟" کرشن چندر نے سوچاکیا کہوں۔کیا یہ کہہ دوں کہ میں بالکل بے خطاہوں۔ یہ میرے دشمنوں کی شرارت ہے۔ انھوں نے میری دیانت سے تنگ آکرمجھے یہاں سے نکالنے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔

مگر ان سے یہ سینہ زوری نہ ہوسکی۔ وہ اس مکتب میں ابھی سادہ لوح تھے۔ احساس جرم نے انھیں اپنی نظروں میں گرادیا تھا۔ جس طرح بدنیت آدمیوں کو گناہ کی سزا شاذ ہی ملتی ہے۔ اسی طرح نیک نیت آدمیوں کو پاداش سے مفر نہیں ہوتا۔ ان کا چہرہ ، ان کی نگاہیں، ان کے حرکات و سکنات سب زبان گویا بن بن کر ان کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ ان کا ایمان خود ہی اپنا منصف بن جاتا ہے۔ سیدھے راستہ پر چلنے والا انسان پیچیدہ گلیوں میں پڑجائے تو اس کا بھول جانا یقینی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ نے پھر پوچھا۔"تم اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

کرشن چندر بولے۔"جی ہاں میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے گناہ کیا ہے اور مجھے اس کی سخت سے سخت سزا دی جائے۔ میرا منہ کالا کرکے مجھے سارے قصبہ میں گھمایا جائے۔ مجھے دہکتے ہوئے آگ کے کنڈ میں ڈھکیل دیا جائے۔ میں نے اپنا جھوٹا وقار قائم کرنے کے لیے، جھوٹی سُرخ روئی حاصل کرنے کے لیے محض نام نمود کے لیے ایک ناجائز فعل کیا۔ اور اب اس کی سزا چاہتا ہوں۔ ایمان کے تازیانے میرے لیے کافی نہ ہوئے۔ وہ مجھے راہِ راست پر قائم نہ رکھ سکے اس لیے قانون کی زنجیروں ہی کے قابل ہوں مجھے صرف ایک لمحہ کے لیے گھر میں جانے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد میں آپ کے ساتھ چلنے پر تیار ہوں۔"

کرشن چندر کی ان باتوں میں ندامت کے ساتھ غرور کی چاشنی بھی تھی۔ وہ ان دونوں تھانہ داروں کو دکھانا چاہتے تھے، کہ اگر میں نے جرم کیا ہے۔ تو اس کی سزا کے لیے بھی سینہ سپر ہوں اوروں کی طرح مکر و دغا نہیں کرتا۔

دونوں تھانہ داروں نے یہ باتیں سُنیں۔ تو حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے گویا کہہ رہے تھے کہ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے کیا؟ اپنے ہوش میں نہیں معلوم ہوتا۔ اگر ایماندار ہی بننا تھا تو یہ فعل کیوں کیا؟ عیب کیا مگر کرنا نہ جانا۔

سپرنٹنڈنٹ نے کرشن چندر کی طرف ترحم آمیز حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔

گنگاجلی بیٹھی چاندی کی تھالی میں تلک کے سامان سجا رہی تھی۔ کہ کرشن چندر نے آکر کہا۔ "گنگا راز فاش ہوگیا۔ میں حراست میں آگیا"۔

گنگاجلی نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ چہرہ کا رنگ اڑگیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اِس کا اسے اندیشہ تھا۔ اور وہ پورا ہوگیا۔

کرشن چندر نے کہا۔"روتی کیوں ہو۔ میرے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہورہی ہے میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا مل رہی ہے۔ غالبًا مجھ پر فوجداری کا مقدمہ چلے گا۔ تم اس کی کچھ پروا نہ کرنا۔ میں ہر ایک سزا کے لیے تیار ہوں۔ میرے لیے وکیلوں اور مختاروں کی ضرورت نہیں ہے میرے اس کفارہ سے وہ حرام کے روپے پاک ہوگئے ہیں۔ انھیں تم دونوں لڑکیوں کی شادی میں خرچ کرنا اس میں کی ایک پائی بھی مقدمہ میں مت لگانا۔ ورنہ مجھے صدمہ ہوگا۔ اپنے ایمان کا اور اپنی نیک نامی کا۔ اپنی زندگی کا خون کرنے کے بعد مجھے کم سے کم یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں لڑکیوں کے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔

گنگاجلی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے اپنی ناعاقبت اندیشی پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ کاش بدن میں آگ لگ جائے اور میں جل کر راکھ ہوجاؤں اور غم وافسوس کی ایک سوچ، بادل سے نکلنے والی دھوپ کی طرح اس کے دل پر آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے آسمان کی طرف یاس کی نگاہ سے دیکھا۔ کاش میں جانتی کہ یہ نوبت آئے گی تو اپنی لڑکی کو کسی کنگال سے بیاہ دیتی۔ یا اسے زہر دے کر مار ڈالتی۔ پھر وہ لپک کر اُٹھی اور

کرشن چندر کا ہاتھ پکڑ کر ایک وحشت آمیز انداز سے بولی۔''ان روپیوں میں آگ لگادو یا لے جاکر اسی ہتیارے رام داس کے سر پر پٹک دو۔ میری لڑکیاں بن بیاہی رہیں گی۔ ہائے ایشور میری عقل پر پردہ کیوں پڑا۔ لو میں خود صاحب کے پاس چلتی ہوں۔ اب شرم وحیا کیسی''۔

کرشن چندر۔ جو کچھ ہونا تھا ہوچکا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

گنگا جلی ۔ نہیں مجھے صاحب کے پاس لے چلو۔ میں ان کے پیروں پر گروں گی۔ اور کہوں گی کہ یہ آپ کے روپے ہیں لیجیے اور اگر سزا دینی ہے تو مجھے دیجیے۔ میں ہی بس کی گانٹھ ہوں۔ یہ پاپ میں نے بویاہے۔

کرشن چندر۔ اتنے زور سے نہ بولو۔ باہر آواز جاتی ہوگی۔

گنگاجلی ۔ مجھے صاحب کے پاس کیوں نہیں لے چلتے۔ انھیں ایک بیکس عورت پر ضرور رحم آئے گا۔

کرشن چندر۔ سنو یہ رونے دھونے کا موقع نہیں ہے۔ میں قانوں کے پنجے میں پھنس گیا ہوں اور کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ صبر سے کام لو اگر ایشور کو منظور ہوگا تو پھر ملاقات ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چلے۔ کہ دونوں لڑکیاں آکر ان کے پیروں سے چمٹ گئیں۔ گنگاجلی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر پکڑ لی۔ ایک کہرام مچ گیا کرشن چندر پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ انھوں نے سوچا اِن بیکسوں کی کیا حالت ہوگی! ایشور تم غریبوں کی آس ہو۔ ان کی خبر لینا۔

ایک لمحہ کے بعد وہ اپنے کو چھڑا کر باہر چلے گئے۔ گنگاجلی نے انھیں پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے پر اس کے دونوں ہاتھ کھلے رہ گئے۔ جیسے کسی زخم خوردہ طائر کے دونوں پَر کھلے رہ جاتے ہیں۔

(۴)

کرشن چندر سے ان کے محلے والے بدظن تھے لیکن اپنے قصبہ میں وہ بہت ہر دل عزیز آدمی تھے۔ یہ خبر سنتے ہی ساری بستی میں ایک ہل چل مچ گئی۔ کئی معزز آدمی ان کی ضمانت دینے آئے لیکن سپرنٹنڈنٹ نے کسی کی ضمانت قبول نہ کی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد حاکم پرگنہ کے اجلاس میں دونوں مقدمے پیش ہوئے۔ اور

کرشن چندر کی ان باتوں میں ندامت کے ساتھ غرور کی چاشنی بھی تھی۔ وہ ان دونوں تھانہ داروں کو دکھانا چاہتے تھے، کہ اگر میں نے جرم کیا ہے۔ تو اس کی سزا کے لیے بھی سینہ سپر ہوں اوروں کی طرح مکر و دغا نہیں کرتا۔

دونوں تھانہ داروں نے یہ باتیں سُنیں۔ تو حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے گویا کہہ رہے تھے کہ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے کیا؟ اپنے ہوش میں نہیں معلوم ہوتا۔ اگر ایماندار ہی بننا تھا تو یہ فعل کیوں کیا؟ عیب کیا مگر کرنا نہ جانا۔

سپرنٹنڈنٹ نے کرشن چندر کی طرف ترحم آمیز حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔

گنگا جلی بیٹھی چاندی کی تھالی میں تلک کے سامان سجا رہی تھی۔ کہ کرشن چندر نے آکر کہا۔ "گنگا راز فاش ہوگیا۔ میں حراست میں آگیا"۔

گنگا جلی نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ چہرہ کا رنگ اڑگیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اِس کا اسے اندیشہ تھا۔ اور وہ پورا ہوگیا۔

کرشن چندر نے کہا۔ "روتی کیوں ہو۔ میرے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہو رہی ہے میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا مل رہی ہے۔ غالبًا مجھ پر فوجداری کا مقدمہ چلے گا۔ تم اس کی کچھ پروا نہ کرنا۔ میں ہر ایک سزا کے لیے تیار ہوں۔ میرے لیے وکیلوں اور مختاروں کی ضرورت نہیں ہے میرے اس کفارہ سے وہ حرام کے روپے پاک ہوگئے ہیں۔ انھیں تم دونوں لڑکیوں کی شادی میں خرچ کرنا اس میں کی ایک پائی بھی مقدمہ میں مت لگانا۔ ورنہ مجھے صدمہ ہوگا۔ اپنے ایمان کا اور اپنی نیک نامی کا۔ اپنی زندگی کا خون کرنے کے بعد مجھے کم سے کم یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں لڑکیوں کے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔

گنگا جلی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے اپنی ناعاقبت اندیشی پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ کاش بدن میں آگ لگ جائے اور میں جل کر راکھ ہوجاؤں اور غم وافسوس کی ایک سوچ، بادل سے نکلنے والی دھوپ کی طرح اس کے دل پر آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے آسمان کی طرف یاس کی نگاہ سے دیکھا۔ کاش میں جانتی کہ یہ نوبت آئے گی تو اپنی لڑکی کو کسی کنگال سے بیاہ دیتی۔ یا اسے زہر دے کر مار ڈالتی۔ پھر وہ لپک کر اُٹھی اور

کرشن چندر کا ہاتھ پکڑ کر ایک وحشت آمیز انداز سے بولی۔ "ان روپیوں میں آگ لگادو یا لے جاکر اسی ہتیارے رام داس کے سر پر پٹک دو۔ میری لڑکیاں بن بیاہی رہیں گی۔ ہائے ایشور میری عقل پر پردہ کیوں پڑا۔ لو میں خود صاحب کے پاس چلتی ہوں۔ اب شرم وحیا کیسی"۔

کرشن چندر۔ جو کچھ ہونا تھا ہوچکا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

گنگا جلی ۔ نہیں مجھے صاحب کے پاس لے چلو۔ میں ان کے پیروں پر گروں گی۔ اور کہوں گی کہ یہ آپ کے روپے ہیں لیجیے اور اگر سزا دینی ہے تو مجھے دیجیے۔ میں ہی بِس کی گانٹھ ہوں۔ یہ پاپ میں نے بویاہے۔

کرشن چندر۔ اتنے زور سے نہ بولو۔ باہر آواز جاتی ہوگی۔

گنگاجلی ۔ مجھے صاحب کے پاس کیوں نہیں لے چلتے۔ انھیں ایک بیکس عورت پر ضرور رحم آئے گا۔

کرشن چندر۔ سُنو یہ رونے دھونے کا موقع نہیں ہے۔ میں قانوں کے پنجے میں پھنس گیا ہوں اور کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ صبر سے کام لو اگر ایشور کو منظور ہوگا تو پھر ملاقات ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چلے۔ کہ دونوں لڑکیاں آکر ان کے پیروں سے چمٹ گئیں۔ گنگاجلی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر پکڑ لی۔ ایک کہرام مچ گیا کرشن چندر پر بھی رقّت طاری ہوگئی۔ انھوں نے سوچا اِن بیکسوں کی کیا حالت ہوگی! ایشور تم غریبوں کی آس ہو۔ ان کی خبر لینا۔

ایک لمحہ کے بعد وہ اپنے کو چھڑا کر باہر چلے گئے۔ گنگاجلی نے انھیں پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے پر اس کے دونوں ہاتھ کھلے رہ گئے۔ جیسے کسی زخم خوردہ طائر کے دونوں پَر کھلے رہ جاتے ہیں۔

(۴)

کرشن چندر سے ان کے محکمے والے بدظن تھے لیکن اپنے قصبہ میں وہ بہت ہر دل عزیز آدمی تھے۔ یہ خبر سنتے ہی ساری بستی میں ایک ہل چل مچ گئی۔ کئی معزز آدمی ان کی ضمانت دینے آئے لیکن سپرنٹنڈنٹ نے کسی کی ضمانت قبول نہ کی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد حاکم پرگنہ کے اجلاس میں دونوں مقدمے پیش ہوئے۔ اور

دونوں مہینہ بھر تک چلتے رہے۔ آخر حاکم پرگنہ نے دونوں مقدمات سشن کے سپرد کردیے۔ وہاں بھی ایک مہینہ لگا۔ کرشن چندر کو پانچ سال کی قید سخت کی سزا ہوئی۔ مہنت رام داس کو سات برس کی۔ اور ان کے دو چیلے حبسِ دوام کے مستوجب سمجھے گئے۔

گنگا جلی کے ایک حقیقی بھائی پنڈت اوما ناتھ تھے۔ کرشن چندر کی ان سے ذرا بھی نہ بنتی تھی۔ وہ انھیں شعبدہ باز حریف کہا کرتے۔ اُن کے لمبے تلک کی چٹکی لیا کرتے۔ اس لیے اوما ناتھ ان کے یہاں بہت کم آتے تھے۔ لیکن اس حادثہ کی خبر پاکر اوما ناتھ سے نہ رہا گیا۔ وہ آکر اپنی بہن اور بھانجیوں کو اپنے گھر لے گئے۔ کرشن چندر کے حقیقی بھائی کوئی نہ تھا چچا کے دو لڑکے تھے پر وہ الگ رہتے تھے انھوں نے بات بھی نہ پوچھی۔

داروغہ جی نے گنگا جلی کو چلتے وقت سخت ممانعت کردی کہ رام داس کے روپیوں میں سے ایک کوڑی بھی مقدمہ میں نہ خرچ کی جائے۔ انھیں اپنی سزا کا یقین تھا۔ پر گنگا جلی سے صبر نہ ہوسکا۔ اس نے ممانعت کی پروا نہ کی اور بے دریغ روپے خرچ کیے۔ وکلا آخر دم تک یہی کہتے رہے کہ یہ بری ہوجائیں گے۔

جج کے فیصلہ کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر ہوئی۔ مہنت جی کی سزا بحال رہی۔ پر کرشن چندر کی سزا میں تخفیف ہوگئی۔ پانچ کے چار سال ہوگئے۔

گنگا جلی آنے کو تو میکہ آئی پر اپنی غلطی پر پچھتایا کرتی تھی۔ یہ وہ میکہ نہ تھا جہاں اس نے بچپن کی گڑیاں کھیلی تھیں۔ مٹی کے گھروندے بنائے تھے ماں باپ کی گود میں پلی تھی۔ والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ گاؤں میں کوئی پرانی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ کھیتوں کی جگہ درخت اور درختوں کی جگہ کھیت بن گئے تھے۔ وہ اپنا گھر بھی مشکل سے پہچان سکی۔ اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی۔ کہ وہاں اس کی محبت یا عزت نہ تھی۔ اس کی بھاوج جانھوی اس سے آمادۂ پرخاش رہتی۔ جانھوی کا اپنے گھر میں جی نہ لگتا۔ پڑوسنوں کے یہاں بیٹھی ہوئی گنگا جلی کے دکھڑے رویا کرتی۔ اس کے دو لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی سمن اور شانتا سے دُور دُور رہتیں۔

گنگا جلی کے پاس رام داس کے روپیوں میں سے کچھ نہ بچا تھا۔ وہی چار پانچ سو روپیہ رہ گئے تھے۔ جو اس نے اپنی کفایت شعاری سے جمع کرلیے تھے۔ اس لیے وہ اوما ناتھ سے سمن کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے۔ جہاں بات

چیت پکّی ہوئی تھی وہاں سے صاف جواب آچکا تھا۔

لیکن اوما ناتھ کو یہ فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی۔ انھیں جب فرصت ملتی دوچار روز کے لیے بَر کی تلاش میں نکل جاتے۔ جوں ہی وہ کسی گاؤں میں پہنچتے وہاں ایک غلغلہ سا برپا ہوجاتا۔ لوگ گٹھریوں سے وہ کپڑے نکالتے جو وہ باراتوں میں پہنا کرتے تھے۔ انگوٹھیاں اور موہن مالے مستعار لاکر پہن لیتے، مائیں اپنے بچوں کو نہلا دھلا کر آنکھوں میں کاجل لگا دیتیں اور دھلے ہوئے کپڑے پہنا کر کھیلنے کو بھیجتیں۔ شادی کے خواہش مند بڈھے نائیوں سے مونچھیں کترواتے اور پکے ہوئے بال چنوانے لگتے۔ جب تک اوما ناتھ وہاں رہتے عورتیں گھروں سے نہ نکلتیں۔ کوئی اپنے ہاتھ سے پانی نہ بھرتا۔ کھیت کے کام بھی بند ہوجاتے۔ پر اوما ناتھ کی نگاہوں میں ان ملمع کاریوں کا مطلق اثر نہ ہوتا۔ سمن کتنی حسین، کتنی سلیقہ شعار، کتنی تعلیم یافتہ لڑکی ہے ان گنواروں کے گھر پڑ کر اس کی زندگی تباہ ہوجائے گی۔

بالآخر اوما ناتھ نے فیصلہ کیا۔ کہ شہر میں کوئی بَر ڈھونڈھنا چاہیے۔ پر شہر والوں کی لمبی چوڑی باتیں سنیں تو ہوش اُڑ گئے۔ بڑے آدمیوں کا تو کہنا ہی کیا۔ دفتروں کے محرّر اور کلرک بھی ہزاروں کا راگ الاپتے تھے لوگ ان کی صورت دیکھتے ہی بدک جاتے۔ دوچار اصحاب ان کی خاندانی شرافت کی بنا پر آمادہ ہوئے پر کہیں تو زائچہ نہ ملا۔ اور کہیں اوما ناتھ ہی کی تشفی نہ ہوئی۔

اس طرح ایک پورا سال گزر گیا۔ اوما ناتھ دوڑتے دوڑتے تنگ آگئے ان کی حالت اس اشتہار تقسیم کرنے والے شخص کی سی ہوگئی۔ جو دن بھر خوش وضع آدمیوں کو اشتہار دینے کے بعد شام کو اپنے پاس اشتہاروں کا ایک بھرا ہوا پلندہ پائے۔ اور وضع کی قید ترک کرکے ہر کس و ناکس کو بانٹنے لگے کہ کسی طرح اس بوجھ سے سبکدوش ہوجائے۔ انھوں نے صرف خاندانی وقار کی شرط قائم رکھی۔ تعلیم، شکل و صورت اور معاش کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ خاندانی شرافت ان کی نگاہوں میں ان سب سے عزیز تر تھی۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ اوما ناتھ گنگا اشنان کرنے گئے تھے۔ گھر لوٹے تو سیدھے گنگاجلی کے پاس جاکر بولے۔ "لو بہن شادی ٹھیک ہوگئی"۔

گنگاجلی ۔ بھلا تمھاری دوڑدھوپ تو ٹھکانے لگی۔ لڑکا پڑھتا ہے نہ؟

اوما ناتھ ۔ پڑھتا نہیں نوکر ہے۔ ایک کارخانہ میں پندرہ روپے کا بابو ہے۔

گنگا جلی۔ گھر دوار ہے؟
اوما ناتھ۔ شہر میں جن کے گھر ہوتا ہے۔ وہ پندرہ کی نوکری نہیں کرتے۔
گنگا جلی۔ عمر کیا ہے؟
اوما ناتھ۔ یہی کوئی تیس سال ہوگی۔
گنگا جلی۔ اور شکل وصورت تو اچھی ہے نہ؟
اوما ناتھ۔ سو میں ایک۔ شہر میں کوئی بدصورت تو ہوتا نہیں۔ خوبصورت بال، سفید کپڑے سبھی کے ہوتے ہیں۔ نام گجا دھر پرشاد ہے۔
گنگا جلی نے مایوسانہ انداز سے کہا۔"جب تمھیں پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہی ہے۔
اوما ناتھ نے شادی کی تیاریاں پہلے ہی سے کررکھی تھیں۔ پھاگن میں شادی ہوگئی۔ گنگا جلی نے داماد کو دیکھا تو گویا سینہ میں ایک برچھی سی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے دشمن کو کنوئیں میں ڈال دیا۔
سُمن سسرال آئی تو یہاں کی حالت اس سے بھی ابتر دیکھی جیسا اس نے خیال کیا تھا۔ مکان میں صرف دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں اور ایک سائبان۔ دیواروں میں چاروں طرف لونی لگی ہوئی تھی۔ باہر سے نالیوں کی بدبو آتی رہتی تھی۔ دھوپ اور روشنی کا کہیں گزر نہ تھا۔ اس مکان کا کرایہ تین روپیہ ماہوار دینا پڑتا تھا۔
سُمن کے دو مہینے تو آرام سے گزرے۔ گجا دھر کی ایک بڈھی پھوپھو گھر کا سارا کام کاج کردیا کرتی تھی۔ لیکن گرمیوں میں شہر میں ہیضہ پھیلا اور بڑھیا چل بسی۔ گجا دھر کو بڑی تشویش ہوئی۔ چوکا برتن کرنے کے لیے مہریاں تین روپیہ سے کم پر راضی نہ ہوتی تھیں۔ دو دن گھر میں چولہا نہیں جلا۔ گجا دھر سُمن سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ دو دن بازار سے پوریاں لایا۔ وہ سمن کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ سمن کے حُسن پر فریفتہ ہوچکا تھا۔ تیسرے دن وہ ایک گھنٹہ رات رہے اٹھا اور سارے برتن مانج ڈالے۔ چوکا لگا دیا پانی بھر لایا۔ سمن جب سوکر اُٹھی ۔ تو یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ سمجھ گئی کہ یہ انھیں کی کرامات ہے۔ شرم کے مارے شوہر سے کچھ نہ پوچھا۔ شام کے وقت اس نے خود سارا کام کیا۔ برتن مانجتی تھی۔ اور روتی جاتی تھی! پر تھوڑے ہی دنوں میں اسے ان کاموں کی عادت پڑگئی۔ اور اپنی زندگی میں ایک خاص لطف حاصل ہونے لگا۔ گجا دھر کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جگ جیت

لیاہے۔ دوستوں سے سمن کی تعریف کرتا پھرتا۔ عورت نہیں دیوی ہے۔ اتنے بڑے گھر کی لڑکی اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرتی ہے۔ کھانا تو ایسا پکاتی ہے کہ کبھی سیری نہیں ہوتی۔ دوسرے مہینہ میں اس نے تنخواہ پائی۔ تو سب کی سب لاکر سمن کے ہاتھ میں رکھ دی۔ سمن کو آج آزادی کا پُرلطف احساس ہوا۔ اس نے سوچا اب مجھے ایک ایک پیسہ کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا۔ میں ان روپیوں کو جیسے چاہوں خرچ کرسکتی ہوں۔ جو چاہوں کھا پی سکتی ہوں۔ پر خانہ داری کے امور سے واقف نہ ہونے کے باعث وہ ضروری غیر ضروری مصارف میں تمیز نہ کرسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہینہ میں دس دن باقی ہی تھے اور سمن نے سب روپے خرچ کرڈالے تھے۔ اس نے انتظام خانہ داری کی نہیں۔ حظِ نفس کی تعلیم پائی تھی۔ گجا دھر نے یہ سُنا تو سناٹے میں آگیا۔ اس کے سر پر ایک پہاڑ سا ٹوٹ پڑا۔ اب مہینہ کیوں کر کٹے گا؟ اسے اس کا کچھ کچھ پہلے ہی سے گمان تھا۔ سمن سے تو کچھ نہ بولا۔ پر سارے دن اس پر فکر کا ایک بوجھ سوار رہا۔ بیچ میں روپیہ کہاں سے آئیں؟

گجا دھر نے سمن کو مالکن تو بنادیا تھا پر وہ خلقتاً بہت ہی خسیس تھا۔ ناشتہ کی جلیبیاں اسے زہر معلوم ہوتیں۔ دال میں گھی دیکھ کر اس کے کلیجہ میں درد سا ہونے لگتا۔ وہ کھانے بیٹھتا تو بٹلیوں کو دیکھا کرتا کہ زیادہ تو نہیں پک گیا۔ دروازہ پر دال چاول بکھرا ہوا دیکھ کر اس کے بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ پر سُمن کے حُسن کا دیوانہ ہوچکا تھا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا۔

مگر آج جب کئی آدمیوں سے اُدھار مانگنے پر بھی اسے روپے نہ ملے تو وہ بے صبر ہوگیا۔ گھر میں آکر بولا۔"روپے تو تم نے سب خرچ کردیے۔ اب بتاؤ کہاں سے آئیں"؟

سمن۔ میں نے کچھ اُڑا تو نہیں دیے۔

گجا دھر۔ پر یہ تو تمھیں معلوم تھا۔ کہ بیچ میں کہیں ایک کوڑی کا سہارا نہیں ہے۔

سمن۔ اتنے روپیوں میں برکت تھوڑی ہی ہوجائے گی۔

گجا دھر۔ تو میں ڈاکا تو نہ ماروں گا۔

باتوں باتوں میں تکرار ہوگئی گجا دھر نے کچھ سخت باتیں کہیں۔ آخر سُمن نے اپنی ہنسلی گروی رکھنے کو دی۔ اور گجا دھر غصہ میں بڑبڑاتا ہوا لے کر چلا گیا۔

لیکن سُمن نے نازونعمت میں پرورش پائی تھی اسے اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی عادت تھی۔ دروازہ پر خوانچہ والوں کی آواز سن کر وہ بیتاب ہوجاتی۔ اب تک وہ گجا دھر کو بھی شریک کرتی تھی۔ اب اس نے تنہا خوری سیکھی۔ لطف ذائقہ کے لیے شوہر سے دغا کرنے لگی۔

(۵)

رفتہ رفتہ سُمن کے حُسن کے چرچے محلّے میں پھیلے۔ پاس پڑوس کی عورتیں آنے لگیں۔ سُمن انھیں ذلّت کی نگاہ سے دیکھتی۔ ان سے کھل کر نہ ملتی۔ پر اس کے طور طریق میں وہ نفاست تھی۔ جو شرفا کا زیور ہے۔ پڑوسنوں نے بہت جلد اس کی اطاعت قبول کرلی۔ سمن ان کے درمیان رانی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پُرغرور طبیعت کو اس میں ایک خاص لُطف آتا تھا۔ وہ ان عورتوں کے سامنے اپنے کمالات کا خوب اظہار کرتی۔ وہ بے چاریاں اپنی قسمت کو روتیں۔ سمن اپنی قسمت کو سراہتی۔ وہ کسی کی غیبت کرتیں۔ تو سمن انھیں منع کرتی۔ وہ ان کے سامنے ریشمی ساڑی پہن کر بیٹھتی۔جو میکہ سے لائی تھی۔ ریشمی جاکٹ کھونٹی پر لٹکادیتی۔ اُن پر اس نمود کا اثر سمن کے حُسن و اخلاق سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ زیور و لباس کے معاملہ میں وہ اس کی رائے کو قولِ فیصل سمجھتیں۔ نئے گہنے بنواتیں تو سمن سے صلاح لیتیں۔ نئی ساڑیاں لیتیں تو سمن کو ضرور دکھاتیں۔ سمن بظاہر بے غرضانہ انداز سے انھیں صلاح دیتی۔ پر اس کے دل کو بہت صدمہ ہوتا۔ وہ سوچتی یہ سب نئے نئے گہنے بنواتی ہیں، نئے نئے کپڑے لیتی ہیں۔ اور یہاں روٹیوں ہی کے لالے ہیں! کیا دُنیا میں میں ہی سب سے بدنصیب ہوں؟

گجا دھر اِن دنوں سخت محنت کرتا۔ کارخانہ سے لوٹتے ہی ایک دوسرے مہاجن کے یہاں حساب کتاب لکھنے چلا جاتا۔ وہاں سے آٹھ بجے رات کو لوٹتا۔ اس کام کے لیے اُسے پانچ روپے اور ملتے تھے۔ پر اضافہ کے باوجود اسے اپنی مالی حالت میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔اس کی ساری کمائی کھانے پینے میں صرف ہوجاتی تھی۔ اس کی محتاط طبیعت اس بے مائیگی سے پریشان رہتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ سمن اس کے سامنے اپنی پھوٹی تقدیر کا رونا رورو کر اسے اور بھی متوحش کردیتی تھی۔ اسے صاف نظر آتا تھا کہ سمن کا دل میری طرف سے کھنچتا جاتاہے۔ اسے یہ نہ معلوم تھا کہ سمن کی زبان اس کے دل سے زیادہ ذوق

طلب ہے۔ اسے پیار کی میٹھی باتوں سے شیرینی زیادہ میٹھی معلوم ہوتی ہے۔ رنگین کپڑے رنگین شکایتوں سے زیادہ پسند ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنی محبّت و محنت کا خاطر خواہ صلہ نہ پاکر سمن سے بدظن رہنے لگا۔ رسی میں دونوں طرف س تناؤ ہونے لگا۔

ہماری عادتیں کتنی ہی استوار کیوں نہ ہوں، ان پر صحبت کا اثر ہونا یقینی ہے۔ سمن اپنی ہم سایوں کو جتنی تعلیم دیتی تھی۔ اس سے بہت زیادہ خود حاصل کرتی تھی ہم اپنے خانگی زندگی کی طرف سے کتنے بے فکر ہیں۔ اس کے لیے کسی تیاری یا تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ گڑیاں کھیلنے والی لڑکی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے والی دوشیزہ گھر کی مالک بننے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ اَلہڑ بچھڑے کے کندھے پر بھاری جوا رکھ دیاجاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہماری معاشرتی زندگی مسرّت انگیز نہ ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ جن عورتوں کے ساتھ سمن اُٹھتی بیٹھتی تھی۔ وہ اپنے شوہروں کو حظِ نفس کا ایک آلہ تصور کرتی تھیں۔ شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اچھّے گہنوں سے آراستہ کرے۔ اچھّے کھانے کھلائے۔ اگر اس میں یہ قابلیت نہیں ہے تو وہ نکھٹو ہے، اپاہج ہے۔ اسے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا وہ عزّت یا محبّت کا مستحق نہیں۔ سمن نے بھی یہی تعلیم حاصل کی۔ اور گجا دھر پرشاد اب اس سے ناراض ہوتے تو انھیں فرائض شوہری پر ایک طول طویل تقریر سُننی پڑتی تھی۔

اس محلہّ میں رنگین مزاج نوجوانوں اور نظر باز شہدوں کی کمی نہ تھی۔ مدرسہ سے جاتے ہوئے لڑکے سُمن کے دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے چلے جاتے۔ شہدے اِدھر سے نکلتے، تو رادھا اور شیام کے گیت یا کوئی پھڑکتی ہوئی غزل گانے لگتے۔ سمن چاہے کسی کام میں مشغول ہو۔ پر ان کی آواز سنتے ہی چق کی آڑ میں آکر کھڑی ہوجاتی۔ اس کی شوخ طبیعت کو اس تاک جھانک میں ایک عجیب لُطف حاصل ہوتاتھا۔ وہ محض اپنے حُسن کا جلوہ دکھانے کے لیے، محض دوسروں کو بیقرار کرنے کے لیے یہ کرشمہ دکھاتی تھی۔

(۶)

سُمن کے مکان کے سامنے بھولی نام کی ایک طوائف کا مکان تھا۔ بھولی نت نئے سنگار کرکے اپنے بالاخانے کے جھروکے پر بیٹھا کرتی۔ پھر رات تک اس کے کمرہ سے نغمۂ خوش آہنگ کی صدائیں آیا کرتیں۔ کبھی کبھی وہ فٹن پر سوار ہوکر ہوا کھانے جایا کرتی۔ سمن اسے حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

سُمن نے سُن رکھا تھا کہ طوائفیں بہت ہی ذلیل اور بدکار ہوتی ہیں وہ اپنے ناز و انداز سے نوجوانوں کو اپنے دام محبت میں پھنسالیا کرتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی ان سے بات چیت نہیں کرتا۔ محض شوقین لوگ رات کو چھپ کر ان کے یہاں جایا کرتے ہیں۔ بھولی نے کئی بار اسے چق کی آڑ میں کھڑے دیکھ کر اشارہ سے بلایا تھا پر سُمن اس سے بولنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ میں غریب سہی اپنی عصمت پر قائم ہوں۔ کسی شریف آدمی کے گھر میں میری روک تو نہیں۔ بھولی کتنا ہی عیش آرام کرے پر اس کی کہیں عزّت تو نہیں ہوتی۔ بس اپنے کوٹھے پر بیٹھی اپنی بے شرمی اور اپنی بے حیائی کا سوانگ دکھایا کرے۔ لیکن سمن کو بہت جلد معلوم ہوگیا، کہ اسے حقیر سمجھنا میری غلطی ہے۔

اساڑھ کے دن تھے۔ گرمی کے مارے سمن کا دم گھٹ رہا تھا۔ شام کے وقت اس سے اندر نہ رہاگیا۔ اس نے چق اٹھا دی اور دروازہ پر بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی تو کیا دیکھتی ہے کہ بھولی بائی کے دروازہ پر کسی تقریب کی تیاریاں ہورہی ہیں بھشتی پانی کا چھڑکاؤ کررہے تھے، صحن میں ایک شامیانہ تانا جارہا تھا، شیشہ آلات ٹھیلوں پر لدے چلے آتے تھے۔ فرش بچھایا جارہا تھا۔ بیسیوں آدمی اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اتنے میں بھولی کی نگاہ سُمن کی طرف اُٹھی۔ قریب آکر بولی۔ ”آج میرے یہاں مولود ہے دیکھنا چاہو توپردہ کرادوں“؟

سُمن نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں یہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لوں گی“۔

بھولی ۔ دیکھ تو لوگی پر سُن نہ سکوگی۔ ہرج کیا ہے اوپر پردہ کرادوں؟

سمن۔ مجھے سننے کی اتنی خواہش نہیں۔

بھولی نے اس کی طرف اِک نگاہ ترحم سے دیکھا۔ اور دل میں کہا یہ گنوارن شاید دیہات سے آئی ہے۔ اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھی ہے۔ آچھا آج تو دیکھ لے کہ میں کون ہوں اس نے زیادہ اصرار نہ کیا۔

رات ہورہی تھی۔ چولہے کی صورت دیکھ کر سمن کی روح کانپ رہی تھی پر طوعاً و کرہاً اُٹھی چولہا جلایا کھچڑی ڈالی اور پھر دروازہ پر آکر تماشہ دیکھنے لگی آٹھ بجتے بجتے شامیانہ گیس کی روشنی سے گنبدِ نور بن گیا۔ پھول پتوں کی آرائش سونے پر سہاگہ تھی۔ تماشائی چاروں طرف سے آنے لگے کوئی بائیسکل پر آتا تھا کوئی ٹمٹم پر۔ کوئی پیدل۔ تھوڑی دیر میں

دو تین نٹنیں بھی آ پہنچی۔ ایک گھنٹہ مین سارا صحن بھر گیا۔

اس کے بعد مولانا صاحب تشریف لائے۔ ان کے چہرے سے اِک جلال برستا تھا۔ اور وہ آراستہ تخت پر مسند لگا کر آ بیٹھے۔ اور مولود شروع ہوگیا۔ کئی آدمی مہمانوں کی تواضع و تکریم کرنے لگے کوئی گلاب چھڑکتا تھا کوئی خاصدان پیش کرتا تھا۔ سمن نے شرفا کی ایسی مجلس آج تک کبھی نہ دیکھی تھی۔

نو بجے گجا دھر پرشاد آئے۔ سمن نے انھیں کھانا کھلایا۔ گجا دھر بھی کھانا کھاکر اسی مجلس میں شریک ہوگئے۔ اور سمن کو تو کھانے کی سدھ ہی نہ تھی۔ گیارہ بجے رات تک وہ بیٹھی رہی پھر شیرینی تقسیم ہوئی۔ اور بارہ بجے مجلس ختم ہوئی۔ گجا دھر گھر میں آئے تو سمن نے کہا یہ "سب کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے"؟

گجا دھر۔ میں سب کو پہچانتا تھوڑے ہی ہوں۔ بھلے بُرے سبھی ہوں گے، شہر کے کئی رئیس بھی تھے۔

سمن۔ کیا یہ لوگ ایک طوائف کے گھر آنے میں اپنی توہین نہیں سمجھتے۔

گجا دھر۔ توہین سمجھتے تو آتے ہی کیوں۔

سمن۔ تمھیں تو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی ہوگی؟

گجا دھر۔ جب اتنے شرفا بیٹھے ہوئے تھے۔ تو مجھے کیوں شرم آنے لگی۔ وہ سیٹھ جی بھی آئے تھے۔ جن کے یہاں میں شام کو کام کرنے جایا کرتا ہوں۔

سمن نے پُرخیال انداز سے کہا۔"میں سمجھتی تھی کہ ان عورتوں کو لوگ بہت ذلیل سمجھتے ہیں!"

گجا دھر۔ ہاں ایسے بھی ہیں پر گنے گنائے۔ انگریزی تعلیم نے ان لوگوں کو آزاد بنادیا ہے۔ بھولی بائی کی شہر میں بڑی عزّت ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ گجا دھر پرشاد دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ چارپائی پر جاتے ہی سوگئے۔ پر سمن کو نیند نہ آئی۔

دوسرے دن شام کے وقت جب وہ پھر چق اٹھا کر بیٹھی تو اس نے بھولی کو چھجے پر بیٹھے دیکھا۔ وہ برآمدہ میں نکل کر خود بھولی سے بولی۔"رات تو آپ کے یہاں بڑی دھوم تھی۔

بھولی سمجھ گئی کہ میری فتح ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔"تمھارے لیے شیرینی بھیج دوں۔ حلوائی کی بنائی ہوئی ہے۔ اور برہمن لایا ہے"۔

سمن نے شرمائے ہوئے کہا۔"بھجوا دیجیے گا۔"

(۷)

سُمن کو سُسرال آئے ڈیڑھ سال کے قریب ہوچکے تھے۔ پر میکے جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ وہاں سے چٹھیاں آتی تھیں۔ سمن جواب لکھتی تو اپنی ماں کو بہت تشفّی دیتی۔ میری فکر مت کرنا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ پر اب اس کے جواب اپنی مصیبت کے قصّے سے پُر ہوتے تھے۔ وہ لکھتی میری زندگی کے دن رورو کر کٹ رہے ہیں۔ میں نے کیا خطا کی تھی۔ کہ تم نے مجھے اس اندھیرے کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ اس نے اپنی پڑوسنوں سے میکے کی تعریف کرنی چھوڑ دی۔کہاں تو ان سے اپنے شوہر کی بڑائی کیا کرتی تھی۔ کہاں اب اس کی شکایت کرنے لگی۔ میرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ گھر والوں نے سمجھ لیا کہ مر گئی گھر پر سب کچھ ہے میرے کس کام کا۔ اماں سمجھتی ہوں گی کہ یہاں میں پھولوں کی سیج پر سو رہی ہوں۔ اور میرے دل پر جو کچھ گزرتی ہے۔ وہ میں ہی جانتی ہوں۔

گجا دھر پرشاد کے ساتھ اس کا برتاؤ پہلے سے کہیں زیادہ روکھا ہوگیا وہ اسی کو اپنی بدحالی کا ذمّہ دار سمجھتی تھی۔ وہ دیر میں سو کر اُٹھتی۔ کئی کئی دن گھر میں جھاڑو نہ دیتی۔ اور کبھی کبھی گجا دھر کو بلا کھائے ہی دفتر جانا پڑتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ یہ کایا پلٹ کیوں ہو رہی ہے!

ایک دن گجا دھر آٹھ بجے لوٹے۔ تو گھر کا دروازہ بند پایا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔سوچنے لگے یہ رات کو کہاں گئی ہے۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔ کواڑ زور سے کھٹکھٹائے۔ کہ کہیں پڑوس میں ہوگی۔ تو سن کر چلے آئے گی۔ دل میں ٹھان لیا تھا کہ آج ان کی خوب مزاج پُرسی کروں گا۔ سمن اُس وقت بھولی بائی کے بالاخانہ پر بیٹھی ہوئیں باتیں کر رہی تھی۔ بھولی نے آج اسے بہت اصرار کرکے بلایا تھا۔ سمن انکار کیوں کرتی۔ دروازہ کا کھٹکھٹانا سُنا تو گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بھاگی ہوئی گھر آئی۔ باتوں میں اسے معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ کتنی رات چلی گئی۔ فوراً دروازہ کھولا۔ چراغ جلایا۔ اور چولہے میں آگ جلانے بیٹھی۔ اس کا دل اپنے قصور کا معترف تھا۔ دفعتاً گجا دھر نے خشمگیں انداز سے کہا۔"تم اتنی رات تک

وہاں بیٹھیں کیا کررہی تھیں؟ کیا بالکل ہی شرم و حیا گھول کرپی لی''؟

سُمن نے دبی ہوئی زبان سے کہا۔"اس نے کئی بار بلایا تو چلی گئی۔ کپڑے اُتارو۔ ابھی کھانا تیار ہوا جاتا ہے۔ آج تم اور دنوں سے جلد آئے ہو''۔

گجا دھر۔ کھانا پیچھے بنانا میں ایسا بھوکا نہیں ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم وہاں مجھ سے پوچھے بغیر کیوں گیئں۔ کیا تم نے مجھ کو بالکل مٹی کا لوندا ہی سمجھ لیاہے؟

سمن۔ سارے دن اکیلے اس کال کوٹھری میں بھی تو نہیں رہا جاتا۔

گجا دھر۔ تو اس لیے کیا رنڈیوں سے میل جول کروگی۔ تمھیں اپنی عزت و آبروکا بھی کچھ خیال ہے؟

سمن۔ کیوں بھولی کے گھر جانے میں کوئی حرج ہے؟ اس کے گھر تو بڑے بڑے آتے ہیں۔ میری کیا گنتی۔

گجا دھر۔ بڑے بڑے بھلے ہی آئیں۔ لیکن تمھارا وہاں جانا بڑی شرم کی بات ہے۔ میں اپنی بیوی کو رنڈیوں سے ناتا جوڑتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم کیا جانتی ہو کہ بڑے بڑے لوگ اس کے گھر آتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں۔ محض دولت سے کوئی بڑا نہیں ہوجاتا۔ دھرم کا درجہ دولت سے کہیں بڑھ کر ہے تم اس مولود کے دن کا جماؤ دیکھ کر دھوکے میں آگئی ہوگی۔ پر یہ سمجھ لو کہ ان میں ایک بھی شریف آدمی نہیں تھا۔ میرے سیٹھ جی لاکھ دھنی ہوں۔ پر میں انھیں اپنی چوکھٹ کے اندر قدم نہ رکھنے دوں گا۔ یہ لوگ دولت کے غرور میں دھرم کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اس کے آنے سے بھولی پاک نہیں ہوگئی ہے۔ میں تمھیں تاکید کردیتاہوں۔ کہ آج سے پھر کبھی اُدھر نہ جانا ورنہ اچّھا نہ ہوگا۔

یہ بات سمن کے دل میں بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں کیا جانتی ہوں کہ وہ کون لوگ تھے۔ دولت مند لوگ تو ایسی عورتوں کے غلام ہواہی کرتے ہیں۔ رام بھولی خود یہی بات کہہ رہی تھی۔ مجھے بڑا دھوکا ہوگیا تھا۔

اس خیال سے سمن کو بہت تشفی ہوئی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اُس دن کے حاضرینِ جلسہ ہوس کے بندے اور عیش پرست تھے۔ اب اسے اپنی حالت کچھ بہتر نظر آنے لگی۔ اسے اپنے تیئں بھولی سے اونچا سمجھنے کے لیے ایک سہارا مِل گیاتھا۔

سمن کا مذہبی اعتقاد بیدار ہوگیا۔ وہ بھولی پر اپنی مذہب پرستی کا سکہّ جمانے کے لیے

روزانہ گنگا اشنان کرنے لگی۔ ایک رامائن منگوائی اور کبھی کبھی اپنی پڑوسنوں کو اس کی کتھائیں سناتی کبھی کبھی خود اُسے خوش الحانی کے ساتھ پڑھتی۔ اس سے اس کی روح کو تو کیا تشفی ہوتی۔ پر نفس مغرور کو ضرور تقویت ہوتی تھی۔ چیت کا مہینہ تھا۔ رام نومی کے دن سمن کئی سہیلیوں کے ساتھ ایک بڑے مندر میں درشن کرنے گئی۔ مندر خوب سجا ہوا تھا۔ بجلی کی بتیاں روشن۔ اور ہجوم اتنا تھا کہ صحن میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ نغمۂ شیریں کی دل آویز صدائیں آرہی تھیں۔ سمن نے کھڑکی سے صحن میں جھانکا۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ وہی اس کی پڑوسن بھولی وسط مجلس میں بیٹھی ہوئی گارہی ہے۔ مجلس میں ایک سے ایک اہل کمال بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی ماتھے پر تلک لگائے۔ کوئی جسم پر بھبھوت لگائے۔کوئی گیروے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ ان میں کتنوں ہی کو سمن روزانہ گنگا اشنان کرتے دیکھتی تھی۔ وہ انھیں علم و کمال کا دیوتا خیال کرتی تھی۔ وہی لوگ یہاں اس وقت ایسے ہمہ تن گوش ہورہے تھے گویا جنّت میں پہنچ گئے ہیں۔

بھولی جس کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ لیتی وہ باغ باغ ہوجاتا تھا گویا اسے عرفان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ اس نظارہ نے سمن کے دل پر ایک بجلی سی گرادی اس کا غرور خاک میں مِل گیا۔ وہ سہارا جس پر وہ پیر جمائے کھڑی تھی نیچے سے سرک گیا۔ اس نے دیکھا کہ بھولی کے سامنے صرف دولت ہی سر نہیں جھکاتی۔ بلکہ سادھو مہاتما بھی اس کے شہید ناز ہیں۔ وہی عورت جسے میں اپنی مذہبی ریاکاری سے زیر کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں ٹھاکرجی کے مقدس مندر میں عزت اور تعظیم کے رتبے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور میرے لیے کہیں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں۔

سمن نے گھر پر آکر رامائن بستہ میں باندھ کر رکھ دی۔ گنگا اشنان کرنا چھوڑدیا۔ کشتئی لنگر شکستہ کی طرح اس کی زندگی پھر ڈانوا ڈول ہونے لگی۔

(۸)

گجا دھر پرشاد کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو چوروں کے درمیان اشرفیوں کی تھیلی لیے بیٹھا ہو۔ سُمن کا وہ حُسن جس پر وہ کبھی بھونرے کی طرح منڈلایا کرتا تھا۔ اب اس کی نظروں میں ایک شعلۂ سُرخ تھا۔ وہ اس سے دُور دُور رہتا۔ اسے خوف تھا کہ یہ شعلہ مجھے جلا نہ دے۔ عورتوں کا حسن ان کی عصمت ہے۔ اس کے بغیر وہ سچ مچ اِک شعلہ ہے

خوفناک اور قاتل۔ گجا دھر نے سمن کو آرام سے رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ پر اس کے لیے آسمان کے تارے توڑنا اس کے امکان سے باہر تھا۔ ان دنوں اسے سب سے بڑی فکر مکان تبدیل کرنے کی تھی۔ اندر گھر میں آنگن نہیں تھا۔ اس لیے جب کبھی وہ سمن سے کہتا کہ چق کے پاس مت بیٹھا کرو۔ تو فوراً جواب دیتی۔" کیا اس قفس میں پڑے پڑے مرجاؤں؟" اس کے سوا اس کا مقصود یہ بھی تھا کہ سمن کا ان عورتوں سے ساتھ چھوٹ جائے۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ انھیں کی بُری صحبت نے سمن میں یہ تغیر کردیا ہے۔ وہ دوسرے مکان کی تلاش میں چاروں طرف پھرتا پر کرایہ سُنتے ہی مایوس ہوکر لوٹ آتا۔

ایک دن وہ سیٹھ جی کے مکان سے آٹھ بجے رات کو لوٹا۔ تو دیکھا کہ بھولی بائی اس کی چارپائی پر بیٹھی سمن سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی ہے۔ غصہ کے مارے گجا دھر کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ بھولی اسے دیکھتے ہی فوراً باہر نکل آئی۔ اور بولی۔"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سیٹھ جی کے یہاں نوکر ہیں۔تو اب تک کبھی کی آپ کی ترقی ہوجاتی۔ یہ تو آج بہوجی سے معلوم ہوا۔ سیٹھ جی کی میرے اوپر خاص عنایت ہے۔" ان الفاظ نے گجا دھر کے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ یہ عورت مجھے اتنا فرومایہ سمجھتی ہے۔ کہ میں اس کی سفارش سے اپنی ترقی کراؤں گا۔ ایسی ترقی پر لعنت۔ اس نے بھولی بائی کو پھر جواب نہ دیا۔

سمن نے ان کے تیور دیکھے۔ تو سمجھ گئی۔ کہ آگ بھڑکا ہی چاہتی ہے۔ پر وہ اس کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ گجا دھر نے بھی اپنے غصّے کو چھپایا نہیں۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی بولا۔"تم نے پھر بھولی بائی سے میل جول پیدا کیا۔ میں نے اُس دن منع نہ کیا تھا؟"

سمن نے بیباکانہ جواب دیا۔"اس میں کوئی چھوت نہیں لگی ہے۔ عزّت اور حیثیت میں وہ کسی سے کم نہیں۔ پھر اس سے بات چیت کرنے میں میری کیا ہیٹھی ہوئی جاتی ہے۔ وہ چاہے تو ہم جیسوں کو نوکر رکھ لے۔"

گجا دھر۔ پھر تم نے وہی بے سرپیر کی باتیں کہیں۔ عزّت دولت سے نہیں ہوتی۔

سمن۔ پر دھرم سے تو ہوتی ہے۔

گجا دھر۔ تو کیا بھولی بڑے دھرم کی عورت ہے؟

سمن۔ یہ تو بھگوان جانے دھرم والوں میں اس کی عزّت ضرور ہوتی ہے۔ ابھی رام نومی

کے دن میں نے اسے بڑے بڑے پنڈتوں اور مہاتماؤں کی مجلس میں بیٹھ کر گاتے دیکھا ہے کوئی اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ سب اُس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ لوگ محض اس کی خاطر وتواضع ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے بات چیت کرنے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ دل میں وہ اس سے نفرت کرتے تھے یا نہیں پر دیکھنے میں تو اس وقت بھولی ہی بھولی دکھائی دیتی تھی۔

گجا دھر۔ تو تم نے ان لوگوں کے بڑے بڑے تلک دیکھ کر انھیں راستباز سمجھ لیا۔ آج کل دھرم ریاکاروں کا اڈا بنا ہوا ہے۔ اس پاکیزہ ندی میں ایک سے ایک خوفناک دریائی جانور پڑے ہوئے ہیں۔ بھولے بھالے بھگتوں کو نگل جانا ان کا کام ہے۔ لمبی جٹائیں لمبے لمبے تلک۔ اور لمبی لمبی داڑھیاں دیکھ کر لوگ دھوکے میں آجاتے ہیں۔ پر وہ سب کے سب محض رنگے ہوئے سیار ہیں۔ مذہب کے نام پر ٹکے کمانے والے۔ اسے بدنام کرنے والے۔ بھولی کی عزت ان کے یہاں نہ ہوگی تو کس کے یہاں ہوگی۔

سمن نے بھولے پن سے پوچھا ”مجھے پھسلا رہے ہو یا سچ کہہ رہے ہو؟“

گجا دھر نے اس کی طرف محبت آمیز انداز سے دیکھ کر کہا ”نہیں سمن واقعی یہی بات ہے ہمارے ملک میں سچے آدمی بہت کم ہیں۔ پر ابھی ملک اُن سے بالکل خالی نہیں ہے وہ رحم دل ہوتے ہیں۔ راستباز ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کیا کرتے ہیں۔ بھولی اگر پری بن کر جائے، تو وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں گے۔

سمن چپ ہوگئی۔ وہ گجا دھر کی باتوں پر غور کرنے لگی۔

(۹)

دوسرے دن سے سمن نے چق کے پاس کھڑا ہونا چھوڑدیا۔ خونچہ والے آتے اور پُکار کر چلے جاتے۔ دیدہ باز لوگ غزل گاتے ہوئے نکل جاتے۔ چق کی آڑ میں اب انھیں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بھولی نے کئی بار بُلایا۔ لیکن سمن نے بہانہ کردیا۔ کہ میری طبیعت اچھّی نہیں ہے۔ دوتین بار وہ خود آئی۔ پر سمن اس سے کھل کر نہ ملی۔

سمن کو آئے، یہاں اب دو سال ہوگئے تھے۔ اس کی ریشمی ساڑھیاں پھٹ چلی تھیں۔ قیمتی جاکٹ تارتار ہوگئے تھے۔ وہ اب اپنی سبھا کی رانی نہ تھی۔ اس کا وقار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا۔ اچھّے کپڑوں سے محروم ہوکر وہ اُس اونچے درجہ سے گرگئی تھی ۔سارے دن

اپنی کوٹھری میں پڑی رہتی۔ کبھی کچھ پڑھتی۔ کبھی سوتی۔

بند کمرے میں پڑے پڑے اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ سر میں درد ہوا کرتا۔ کبھی بخار آجاتا۔ کبھی دل میں دھڑکن ہونے لگتی۔ سوء ہضم کی علامتیں پیدا ہوگئیں۔ تھوڑی سی محنت سے بھی جی گھبرا جاتا۔ جسم نحیف ہوگیا۔ اور پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔

گجا دھر کو تشویش ہونے لگی۔ کبھی کبھی وہ سمن پر جھنجلاتا اور کہتا "جب دیکھو پڑی رہتی ہو جب تمھارے رہنے سے مجھے اتنا آرام بھی نہیں کہ ٹھیک وقت پر کھانا مل جائے تو تمھارا رہنا نہ رہنا دونوں برابر ہے۔" پر فوراً ہی اسے اپنی سخت کلامیوں پر افسوس ہوتا اپنی خودغرضی پر نادم ہوجاتا۔

رفتہ رفتہ اس پر روشن ہونے لگا کہ سمن کی ساری شکایتیں خراب ہوا کے باعث ہیں۔ کہاں تو اِسے چق کے پاس کھڑے دیکھ کر جل جاتا تھا۔ گنگا اشنان سے روکتا تھا۔ کہاں اب خود چق اُٹھا دیتا۔ اور سمن کو گنگا اشنان کے لیے تاکید کرتا۔ اس کے اصرار سے سمن کئی دن متواتر نہانے گئی۔ اور اس سے اسے کچھ نفع معلوم ہوا۔ پھر تو وہ بلا ناغہ نہانے جانے لگی۔ مرجھایا ہوا پودا پانی پاکر شگفتہ ہوگیا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ ایک دن سمن کی کئی پڑوسنیں بھی اس کے ساتھ نہانے چلیں۔ راستہ میں بنی باغ پڑتا تھا۔ اس میں انواع و اقسام کے جانور پلے ہوئے تھے۔ چڑیوں کے لیے لوہے کے پتلے تاروں سے ایک وسیع گنبد بنایا گیا تھا۔ لوٹتی بار سب کی صلاح ہوئی کی باغ کی سیر کرنی چاہیے۔ سمن بہت جلد لوٹ آیا کرتی تھی۔ پر آج سہیلیوں کی ضد سے اسے باغ میں جانا پڑا۔ وہ بہت دیر تک وہاں کے عجیب الخلقت مخلوق کو دیکھتی رہی۔ آخر تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ دفعتاً اس کے کان میں آواز آئی۔ "یہ کون عورت بنچ پر بیٹھی ہے۔ اُٹھ وہاں پر کیا سرکار نے تیرے ہی لیے بنچ رکھدی ہے۔"

سُمن نے سہمی نگاہوں سے پیچھے پھر کر دیکھا۔ باغ کا چوکیدار کھڑا ہوا ڈانٹ رہا تھا۔ وہ نادم ہوکر بنچ پر سے اُٹھ گئی۔ اور ذلت کو بھلانے کے لیے چڑیوں کو دیکھنے لگی۔ دل میں پچھتارہی تھی۔ کہ ناحق اس بنچ پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک کرایہ کی گاڑی چڑیا گھر کے سامنے آکر رُکی۔ چوکیدار نے دوڑکر گاڑی کے پٹ کھولے۔ دوعورتیں اترپڑیں۔ ان میں سے ایک وہی سمن کی پڑوسی بھولی بائی تھی۔ سمن ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئی۔ اور وہ دونوں

عورتیں باغ کی سیر کرنے لگیں۔ انھوں نے بندروں کو چنے کھلائے۔ چڑیوں کو دانے چگائے۔ کچھوے کی پیٹھ پر کھڑی ہوئیں۔ پھر تالاب میں مچھلیوں کو دیکھنے چلی گئیں۔ چوکیدار ان کے پیچھے پیچھے ایک نوکر کی طرح چل رہا تھا۔ وہ دونوں تو مچھلیوں کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ تب تک چوکیدار نے دوڑکر دوگلدستہ بنائے۔ اور ان عورتوں کے نذر کیے۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں آکر اس بنچ پر بیٹھ گئیں۔ جس پر سے سمن اُٹھادی گئی تھی۔ چوکیدار ادب سے ایک کنارے کھڑا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر سمن کی آنکھوں سے غصہ کے مارے چنگاریاں جھڑنے لگیں۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جسم تنکے کی طرح کانپنے لگا۔ دل میں اِک شعلۂ عظیم دمک اُٹھا۔ وہ آنچل میں منہ چھپاکر رونے لگی۔ جوں ہی دونوں طوائفیں وہاں سے چلی گئیں۔ سمن شیرنی کی طرح لپک کر چوکیدار کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور غصہ سے کانپتی ہوئی بولی۔"کیوں جی تم نے مجھے تو بنچ پرسے اُٹھا دیا۔ جیسے تمھارے باپ ہی کی ہے۔ پر ان دونوں رنڈیوں سے کچھ نہ بولے؟"

چوکیدار نے حقارت آمیز انداز سے کہا۔"وہ اور تم برابر!"

آگ پر گھی جو کچھ کرتاہے۔ وہی اس جملہ نے سمن کے دل پر کیا۔ ہونٹ چباکر بولی۔"چپ رہ پاجی کہیں کا ٹکے کے لیے رنڈیوں کی جوتیاں اُٹھاتاہے۔ اس پر شرم نہیں آتی ہے۔ دیکھ تیرے سامنے پھر اسی بنچ پر بیٹھتی ہوں۔ دیکھوں تو مجھے کیسے اُٹھاتاہے۔

چوکیدار پہلے تو کچھ ڈرا۔ مگر سمن کے بنچ پر بیٹھتے ہی وہ اس کی طرف لپکا۔ کہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھادے۔ سمن غیظ وغضب کی تصویر بنی ہوئی آتشیں نگاہوں سے تاکتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اس کی ایڑیاں اُچھلی پڑتی تھیں۔ اس کی سہیلیاں جو چاروں طرف سے گھوم گھام چڑیا گھر کے پاس آگئی تھیں۔ دور سے کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

یکایک پھر ایک گاڑی سامنے آپہنچی۔ چوکیدار بھی سمن سے ہاتھا پائی کرہی رہا تھا کہ گاڑی میں ایک مرد شریف اُتر کر چوکیدار کے پاس لپکتے ہوئے آئے۔ اور اسے زور سے دھکا دے کر بولے۔"کیوں بے ان کا ہاتھ کیوں پکڑتا ہے دُور ہٹ۔"

چوکیدار ہکا بکا ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بولا "سرکار کیا یہ آپ کے گھر کی ہیں؟"

مرد شریف نے غصہ سے کہا۔"ہمارے گھر کی ہوں یا نہ ہوں۔ تو ان سے ہاتھا پائی کیوں کررہاتھا۔ ابھی رپورٹ کردوں تو برخاست ہوجائے۔"

چوکیدار خوشامدیں کرنے لگا۔ اتنے میں گاڑی میں بیٹھی ہوئی خاتون نے سمن کو اشارہ سے بلایا۔ اور پوچھا۔"یہ تم سے کیا کہہ رہاتھا؟"

سمن۔ کچھ نہیں میں اس بنچ پر بیٹھی تھی۔ وہ مجھے اُٹھانا چاہتا تھا۔ ابھی دو رنڈیاں اسی بنچ پر بیٹھی تھیں۔ کیا میں ایسی گئی گزری ہوں کہ مجھے رنڈیوں سے بھی نیچے سمجھا۔

اس شریف عورت نے اسے سمجھایا۔ کہ یہ چھوٹے آدمی جس سے چار پیسے پاتے ہیں۔ اسی کی غلامی کرتے ہیں۔ ان کے منہ لگنا اچھا نہیں۔

دونوں عورتوں میں جان پہچان ہوگئی۔ اس حسینہ کا نام سوبھدرا تھا۔ وہ بھی سُمن ہی کے محلہ میں رہتی تھی۔ اس کے شوہر وکالت کرتے تھے۔ میاں بی بی گنگا اشنان کرکے گھر جارہے تھے۔ یہاں پہنچ کر جب اس کے شوہر نے دیکھا۔ کہ چوکیدار ایک شریف عورت سے جھگڑا کررہا ہے تو گاڑی سے اُترپڑے۔

سوبھدرا سمن کی شکل وصورت اور بات چیت پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھلا لیا۔ وکیل صاحب کوچ بکس پر جا بیٹھے۔ گاڑی چلی۔ سمن کو اس وقت ایسا معلوم ہورہاتھا کہ میں ہَوا کے تخت پر بیٹھی ہوئی جنت کو جارہی ہوں۔ سوبھدرا اگرچہ بہت حسین نہ تھی۔ اور اس کی وضع و قطع بھی سادہ تھی۔ پر وہ ایسی شگفتہ پیشانی اور خوش اخلاق تھی۔ کہ سمن کا دل اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ راستہ میں سمن نے اپنی سہیلیوں کو جاتے دیکھ کر ان کی طرف غرور سے تاکا۔ گویا کہہ رہی تھی کہ تمھیں بھی کبھی یہ عزت حاصل ہوسکتی ہے۔ پر اس غرور کے ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں سوبھدرا میرا مکان دیکھ کر مجھے ذلیل نہ سمجھنے لگے۔ضرور یہی ہوگا۔ یہ کیا جانتی ہے کہ میں ایسے پھٹوں حالوں میں رہتی ہوں۔

یہ کیسی خوش نصیب عورت ہے۔ شوہر کیا ہے دیوتا ہے۔ یہ نہ آجاتے تو اس بے رحم چوکیدار نے نہ جانے میری کیا درگت کی ہوتی۔ کتنی شرافت ہے کہ مجھے اندر بیٹھا دیا۔ اور آپ کوچبان کے ساتھ جابیٹھے۔ سمن انھیں خیالوں میں محو تھی کہ اس کا مکان آگیا۔ اس نے سوبھدرا سے شرماتے ہوئے کہا۔ "گاڑی رکوا دیجیے میرا مکان آگیا۔

سوبھدرا نے گاڑی رکوا دی۔ سمن نے ایک بار بھولی بائی کے گھر کی طرف تاکا وہ چھت پر ٹہل رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ بھولی نے گویا کہا۔"اچھا یہ ٹھاٹ ہیں" اور سمن نے نگاہوں سے جواب دیا۔" خوب دیکھ لو یہ کون لوگ ہیں تم مر بھی جاؤ تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا نصیب نہ ہو۔" سمن گاڑی سے اُتری۔ اور سوبھدرا کی طرف چشم پُر آب سے دیکھتی ہوئی بولی۔" اتنی محبت پیدا کرکے بھول نہ جایئے گا میری طبیعت لگی رہے گی۔"

سوبھدرا۔ نہیں نہیں ابھی تو تم سے کچھ باتیں بھی نہ کرنے پائی۔ میں تمھیں کل بلاؤں گی۔

گاڑی چلی گئی۔ سمن اپنے گھر میں گئی۔ تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سُہانا خواب دیکھ کر جاگ گئی ہے۔

گجا دھر نے پوچھا۔"یہ گاڑی کس کی تھی؟"

سمن۔ یہیں کوئی وکیل ہیں۔ بنی باغ میں ان کی بی بی سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے ضد کرکے گاڑی پر بٹھلا لیا۔ مانتی ہی نہ تھیں۔

گجا دھر۔ تو کیا تم وکیل صاحب کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

سمن۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ بیچارے تو کوچ بکس پر بیٹھے تھے۔

گجا دھر۔ تبھی اتنی دیر ہوئی۔

سمن۔ دونوں کے دونوں شرافت کے پتلے ہیں۔

گجا دھر۔ اچھا چل کر چولہا جلاؤ۔ بہت تعریف ہوچکی۔

سمن۔ تم وکیل صاحب کو جانتے تو ہوگے؟

گجا دھر۔ اس محلے میں تو ایک پدم سنگھ وکیل رہتے ہیں۔ وہی ہوں گے۔

سمن۔ گورے گورے لمبے آدمی ہیں۔ عینک لگاتے ہیں۔

گجا دھر۔ ہاں ہاں وہی ہیں۔ یہ کیا پورب کی طرف رہتے ہیں۔

سمن ۔ کوئی بڑے وکیل ہیں؟

گجا دھر۔ میں ان کا جمع خرچ تھوڑے ہی لکھتاہوں۔ آتے جاتے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں۔ آدمی اچھے ہیں۔

سمن تاڑ گئی کہ گجا دھر کو وکیل صاحب کا ذکر ناگوار گزرتا ہے۔ اس نے کپڑے بدلے اور کھانا پکانے لگی۔

(۱۰)

دوسرے دن سمن نہانے نہ گئی۔ وہ سویرے ہی سے اپنی ایک ریشمی ساڑی کی مرمت کرنے لگی۔ دوپہر کو سوبھدرا کی ایک مہری اسے لینے آئی۔ سمن سوچا تھا کہ گاڑی آئے گی۔ مہری کو دیکھ کر اس کا دل چھوٹا ہو گیا۔ وہی ہوا، جس کا اسے خوف تھا۔

وہ مہری کے ساتھ سوبھدرا کے گھر گئی۔ اور دو تین گھنٹے بیٹھی رہی اس کا وہاں سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا اس نے اپنے میکے کا رتی رتی حال کہہ سُنایا۔

دونوں عورتوں میں راہ و رسم بڑھنے لگی۔ سوبھدرا جب گنگا نہانے جاتی تو سمن کو ضرور ساتھ لے لیتی۔ سمن کو بھی روز ایک بار سوبھدرا کے گھر گئے چین نہ آتا۔

جیسے بالو پر تڑپتی ہوئی مچھلی ندی میں پہنچ کر خوش فعلیاں کرنے لگتی ہے اسی طرح سمن بھی سوبھدرا کے دریائے محبت میں اپنی مصیبتوں کو بھول کر محظوظ ہونے لگی۔

سوبھدرا کوئی کام کرتی ہوتی تو سمن اُسے خود کرنے لگتی۔ کبھی کبھی پدم سنگھ کے لیے ناشتہ بنادیتی۔ کبھی پان بناکر بھیج دیتی۔ اس کی نظر میں سوبھدرا جیسی بااخلاق عورت اور پدم سنگھ جیسا شریف مرد دنیا میں نہ تھا۔

ایک بار سوبھدرا کو بخار آنے لگا۔ سمن کبھی اس کے پاس سے نہ ٹلتی۔ اپنے گھر ایک لمحہ کے لیے جاتی۔ اور کچا پکا کھانا پکا کر پھر بھاگ آتی۔ پر گجا دھر اس کی ان باتوں سے جلتا تھا۔ اِسے اب سمن پر اعتماد نہ تھا۔

پھاگن کے دن تھے۔ سمن کو یہ فکر تھی کہ ہولی کے لیے کپڑوں کا کیا انتظام کروں گجا دھر کو اِدھر ایک مہینہ سے سیٹھ جی نے جواب دے دیا تھا۔ اِسے اب صرف پندرہ روپیوں ہی کا بھروسہ تھا۔ سمن نے ایک تن زیب کی ساڑی اور ریشمی ململ کی جاکٹ کے لیے گجا دھر سے کئی بار کہا تھا۔ پر وہ ہوں ہاں کر کے ٹال جاتا تھا۔ وہ سوچتی یہ پرانے کپڑے پہن کر سوبھدرا کے گھر ہولی کھیلنے کیسے جاؤں گی۔

اسی اثناء میں سمن کو اپنی ماں کے انتقال کی خبر ملی۔ سمن کو اس کا اتنا صدمہ نہ ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کا دل اپنی ماں کی طرف سے پھٹ گیا تھا۔ لیکن ہولی کے لیے

نئے اور نفیس کپڑوں کی فکر سے نجات ہوگئی۔ اس نے سوبھدرا سے کہا۔"بھوجی اب میں بیکس ہوگئی۔ اب گہنے کپڑے کی طرف تاکنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت پہن چکی۔ اس غم نے شوق سنگار کی آرزو ہی باقی نہ رکھی۔ ایک بدن سے جان نہیں نکلتی۔ لیکن دل پر جو گزری ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔" اپنی سہیلیوں سے بھی اس نے ایسی ہی غمناک باتیں کیں۔ سب کی سب اس کی سعادت مندی کی تعریف کرنے لگیں۔

ایک دن وہ سوبھدرا کے ساتھ بیٹھی ہوئی رامائن پڑھ رہی تھی کی پدم سنگھ خوش خوش گھر میں آکر سوبھدرا سے بولے۔"آج بازی مار لی۔"

سوبھدرا نے بیتاب ہوکر کہا۔"سچ"؟

پدم سنگھ۔ کیا ابھی کوئی شک تھا۔

سوبھدرا۔ اچّھا تو لائیے میرے روپئے دلوائیے۔ وہاں آپ کی بازی تھی یہاں میری بازی ہے۔

پدم سنگھ۔ ہاں ہاں تمھارے روپے ملیں گے۔ ذرا صبر تو کرو۔ دوستوں کا تقاضا ہورہا ہے کہ دھوم دھام سے اس تقریب میں جشن منایا جائے۔

سوبھدرا۔ ہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اور مناسب بھی ہے۔

پدم سنگھ۔ میں نے دعوت کی تجویز کی تھی۔ لیکن کوئی اسے منظور نہیں کرتا۔ لوگ بھولی بائی کا مجرا کرانے کے لیے اصرار کررہے ہیں۔

سوبھدرا۔ اچّھا تو انھیں کی مان لو۔ کون سا چھپن ٹکے کا خرچ ہے۔ ہولی بھی آگئی ہے۔ ایک پنتھ دو کاج ہوجائے گا۔

پدم سنگھ۔ خرچ کی بات نہیں۔ اصول کی بات ہے۔

سوبھدرا۔ بھلا اب کی بار اصول کی خلاف ہی سہی۔

پدم سنگھ۔ بٹھل داس زندہ نہ چھوڑیں گے۔

سوبھدرا۔ نہیں بکنے دو۔ ساری دنیا ان کا کہا تھوڑی ہی مان جائے گی۔

پنڈت پدم سنگھ آج کئی سال کی ناکام کوشش کے بعد میونسپلٹی کے انتخاب میں کامیاب ہوئے تھے۔ اسی کے جشن کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ اگرچہ وہ خود بڑے بااُصول آدمی تھے۔ تاہم اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی صلاحیت ان میں نہ تھی کچھ تو مروّت سے

کچھ اپنی سادہ نفسی سے اور کچھ دوستوں کے طعنے کے خوف سے وہ اپنے اصول پر اڑ نہ سکتے تھے۔ بابو بٹھل داس ان کے گہرے دوست تھے۔ وہ طوائفوں کے ناچ کی ہمیشہ مخالفت کرتے تھے۔ اس مذموم رسم کو مٹانے کے لیے ایک اصلاحی انجمن قائم کی تھی۔ پنڈت پدم سنگھ ان کے اِنے گنے معاونوں میں تھے پنڈت جی اسی لیے بٹھل داس سے ڈرتے تھے۔ لیکن سوبھدرا کی تحریک نے ان کی جھجک دور کردی۔ وہ اپنے شوقین مزاج دوستوں سے متفق ہوگئے۔ طے ہوگیا کہ بھولی بائی کا مجرا ہوگا۔ اس کے چار دن کے بعد ہولی آئی اور رات کو پدم سنگھ کے دیوان خانہ نے رقص گاہ کی صورت اختیار کی۔ احباب خوش نما قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بھولی بائی اپنے سازندوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھی ہوئی بھاؤ بتا بتاکر میٹھے سُروں میں گارہی تھی۔ کمرہ بجلی کی شفاف روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ عطر اور گلاب کی بوچھاڑ ہورہی تھی۔ لُطف و مذاق کا بازار گرم تھا۔

سمن اور سوبھدرا دونوں شہ نشین پر بیٹھی ہوئی چلمن کی آڑ سے یہ جلسہ دیکھ رہی تھیں سوبھدرا کو یہ گانا بالکل بے مزہ معلوم ہوتا تھا۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ لوگ اس قدر محو ہوکر اسے کیوں سُن رہے ہیں۔ بہت دیر کے بعد چیز اس کی سمجھ میں آئی۔ سمن کا مذاق زیادہ نفیس تھا اُسے موسیقی سے فطرتاً لگاؤ تھا۔ گیت کان میں آتے ہی اس کے لوحِ دل پر نقش ہوجاتے تھے بھولی بائی نے گایا۔

ایسی ہولی میں آگ لگے۔

"پیا پردیس میں دوارے ٹھاڑھی۔ دھیرج کیسے رہے۔

ایسی ہولی میں آگ/ لگے۔"

سُمن نے بھی اس گیت کو آہستہ آہستہ گنگناکر گایا۔ اور اپنی کامیابی پر خوش ہوئی صرف زمزمہ نہ ادا ہوسکے۔ لیکن اس کی ساری توجہ گانے ہی پر تھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ صدہا آنکھیں بھولی بائی پر جمی ہوئی ہیں۔ ان نگاہوں میں کتنی پیاس تھی کتنا اشتیاق کتنی التجا۔ پتلیاں بھولی کے ایک ایک ادا پر ناچتی تھیں چمکتی تھیں۔ جس کی طرف وہ مخاطب ہوجاتی۔ وہ وجد میں آجاتا تھا۔ جس سے دوایک باتیں کرلیتی اِسے کونین کی دولت مل جاتی تھی۔ اس خوش نصیب انسان پر رشک کی نگاہیں پڑنے لگتیں۔ اس محفل میں ایک سے ایک خوش وضع ایک سے ایک شکیل۔ ایک سے ایک عالم اور دولت مند اصحاب جمع تھے۔ پر سب

کے سب اس عورت پر مٹے جاتے تھے۔ کاش اور حیف سب کے چہرہ پر کھنچا ہوا تھا کون تھا جو اس کے اشاروں پر قربان نہ ہوجاتا۔

سازندے واہ واہ کی ہانک لگارہے تھے۔ اور سارا مکان نغمہ سے گونج رہا تھا مگر جلسہ میں کچھ ایسے حضرات بھی تھے۔ جنھیں ملکی معاملات پر سرگوشیاں کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ منشی ابوالوفا نے کہا۔"ان حضرات کو کچھ چلتی چلاتی نہیں۔ یہ سب ٹھلٹ ہی ٹھلٹ ہے" تیغ علی نے جواب دیا۔"یہ آج کل وکیل ہوگئے۔ کل ان کے باپ جوتیاں چٹخاتے تھے۔"

ایک طرف دو صاحب اپنی حق تلفیوں کا مرثیہ گارہے تھے"جناب یہی انصاف ہے۔ مرمر کے کام کیا۔ اور آج جب ایک چندروزہ عوضی کا موقع ملا تو وہ ایک سفارشی ٹٹو کو دے دی گئی۔"

ایک گوشے میں مسٹر کپاٹے ۔مسٹر رودرا سے کہہ رہے تھے"جناب میں تو ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہوں۔ دبوں کیوں۔ ڈروں کیوں؟ اُنھوں نے مبارک حسین کو مقرر کیا۔ بندہ نے گوبندرام کو مقرر کیا انھوں نے گرجا سہائے کو برخواست کیا۔ میں نوازش علی کو چٹ کرگیا۔ انھوں نے حق تلفی کی میں نے بھی حق تلفی کی۔ یہ لوگ اسی برتاؤ سے خوش ہوتے ہیں۔"

مسٹر رودرا نے فرمایا۔"آپ کے باعث سے یہاں بڑی دل جمعی ہے۔ ورنہ معلوم نہیں۔ ان کی ریشہ دوانیاں کیا غضب ڈھاتیں۔"

مسٹر کپاٹے نے اندازِ تفخر سے کہا۔"اجی دیکھتے جایئے۔ اگر ان کا ناطقہ نہ بند کردیا تو کہیے گا۔ اب کی مویشی خانے کے معائنوں کو چلتا ہوں۔ دوچار شکار ضرور ہی پھانسوں گا۔ اب ذرا اس زیادتی کو دیکھیے کہ قاضی گنج کے قاضیوں نے ابھی پارسال کے مطالبہ بھی نہیں ادا کیے۔حال کا کیا ذکر۔ مگر ان سے تقاضا تک نہ ہوا۔ اور بگھوا کے ٹھاکروں پر محض حال کی ایک قسط نہ دینے کی علت میں سمّن جاری کردیے گیے۔ وزیرعلی کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار سے کم نہیں، ان پر ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ بیچارے غریب داس کی آمدنی مشکل سے ایک ہزار ہوگی۔ مگر اس کی بہیوں پر اعتبار نہیں کیا گیا۔ پانچ ہزار کا مطالبہ وصول کرلیاگیا۔ اس قسم کی بدعنوانیاں روز ہورہی ہیں۔ اور اب میں نے بھی وہی وطیرہ اختیار کرلیاہے۔"

مسٹر رودرا نے فرمایا۔"ہماری قوم کے لوگوں میں اخلاقی جرأت نہیں۔ وہ اپنی قوم پر جان دیتے ہیں۔"

مگر سمن اور ہی خیالوں میں غرق تھی۔ اُس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ اس عورت میں کون سا جادو ہے؟ جادوئے حُسن؟ ہاں اس کی صورت ضرور لبھانے والی ہے۔ مگر میں بھی تو ایسی بُری نہیں۔ وہ سانولی ہے میں گوری ہوں۔ وہ موٹی ہے میں چھریری ہوں۔ سوبھدرا کے کمرہ میں ایک بڑا شیشہ تھا۔ وہ اس شیشہ کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اپنا سراپا دیکھا۔ گلال اور عبیر کی سرخی نے اس کے چمپئی رنگ پر ہلکی ہلکی سرخی پیدا کردی تھی اس نے بھولی بائی کی خیالی تصویر سے اپنے خط و خال کا موازنہ کیا۔ اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ میں اس سے کتنی حسین ہوں۔ تب اُس نے آکر سوبھدرا سے کہا۔"بہوجی ایک بات پوچھوں بُرا نہ ماننا۔ کیا یہ اِندر کی پری مجھ سے زیادہ سُندر ہے؟"

سوبھدرا نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اور مُسکراکر بولی۔"یہ کیوں پوچھتی ہو؟" سُمن نے شرم سے سر جھکاکر کہا۔"کچھ نہیں یوں ہی۔ بتلاؤ؟"

سوبھدرا۔"وہ عیش کرتی ہے۔ اس لیے اس کا بدن نازک ہے۔ مگر رنگ و روپ میں وہ تمھارے برابر نہیں۔"

سُمن نے پھر سوچا، تو کیا اس کے بناؤ سنگار۔ زیور و لباس پر لوگ اس قدر ریجھے ہوئے ہیں؟ میں بھی ویسا ہی بناؤسنگار کروں۔ ویسے ہی گہنے کپڑے پہنوں۔ تو میرا رنگ و روپ اور نہ نکھرجائے گا؟ کیا میرا حُسن اور نہ چمک جائے گا؟ لیکن کہاں ملیں گے۔

کیا لوگ اس کے گانے پر لٹو ہورہے ہیں؟ اس کے گلے میں لوچ نہیں۔ میری آواز اس سے بہت اچھی ہے۔ اگر کوئی مہینہ بھر بھی مجھے سکھادے تو میں اس سے بہت اچھا گانے لگوں۔ میں بھی ترچھی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہوں مجھے بھی آنکھیں نیچی کرکے مُسکرانا آتا ہے۔

سمن وہاں بہت دیر تک بیٹھی معلول سے علت کی تحقیق میں تخرجہ و موازنہ سے کام لیتی رہی۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ آزاد ہے۔ میرے پیروں میں بیڑیاں ہیں اس کی دکان کھلی ہوئی ہے۔ اس لیے گاہکوں کی بھیڑ ہے۔ میری دکان بند ہے۔ اس لیے کوئی کھڑا نہیں ہوتا۔ وہ کتّوں کے بھونکنے کی پروا نہیں کرتی۔ میں سرگوشیوں سے ڈرتی ہوں۔ وہ پردہ کے باہر ہے۔ میں پردہ کے اندر ہوں۔ وہ ڈالیوں پر چہکتی ہے۔ میں پنجرے کے اندر بند تڑپتی ہوں۔ اس نے شرم چھوڑدی ہے۔ میں اس کا دامن پکڑے ہوئے ہوں۔ اس حیا

نے اس بدنامی کے ڈر نے مجھے دوسروں کی لونڈی بنا رکھا ہے۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ مجلس برخاست ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے سمن بھی اپنے گھر کی طرف چلی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سمن کے دل میں بھی مایوسی کا کچھ ایسا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ گھر کی طرف جاتی تو تھی۔ پر بہت آہستہ آہستہ۔ غرور جیسے افلاس سے دُور بھاگتا ہے۔ اسی طرح اس کا دل اس گھر سے دُور بھاگتا تھا۔

گجا دھر حسب معمول نو بجے گھر آیا۔ کواڑ بند تھے۔ چکرایا کہ اس وقت سمن کہاں گئی! پڑوس میں ایک بیوہ درزن رہتی تھی۔ جاکر اس سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ سوبھدرا کے گھر کسی کام کو گئی ہے۔ کنجی مل گئی۔ آکر کواڑ کھولے۔ کھانا تیار تھا۔ وہ دروازہ پر بیٹھ کر سمن کا انتظار کرنے لگا۔ جب دس بج گئے۔ تو اس نے کھانا پرسا۔ لیکن غصّہ میں کچھ نہ کھایا گیا۔ اس نے سب چیزیں اُٹھاکر باہر پھینک دیں اور اندر سے کواڑ بند کرکے سو رہا۔ دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ آج کتنا ہی سر پٹکے۔ کواڑ نہ کھولوں گا۔ دیکھیں کہاں جاتی ہے مگر اسے بہت دیر تک نیند نہیں آئی ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو وہ ڈنڈا لیے ہوئے کواڑ کے پاس آجاتا۔ اس طیش میں اگر سمن اسے مل جاتی۔ تو اس کی خیریت نہ تھی۔ گیارہ بجنے کے بعد نیند کے دیو نے اُسے دبالیا۔

سمن جب اپنے دروازہ پر پہنچی۔ تو اس کے کان میں ایک بجنے کی آواز آئی وہ آواز اس کی ایک ایک رگ میں گونج اُٹھی۔ وہ ابھی تک دس گیارہ کے دھوکے میں تھی۔ روح خشک ہوگئی۔ اس نے کواڑ کی درازوں سے جھانکا۔ کپّی جل رہی ہے تھی۔ اس کے دھوئیں سے کوٹھڑی بھری ہوئی تھی۔ اور گجا دھر ہاتھ میں ڈنڈا لیے چت پڑا زور سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ سمن کا دل کانپ اُٹھا۔ کواڑ کھٹکھٹانے کی ہمت نہ پڑی۔

پر اس وقت جاؤں کہاں؟ سوبھدرا کے گھر کا دروازہ بھی بند ہوگا۔ دونوں کہاں سوگئے ہوں گے۔ بہت چیخنے چلّانے سے کواڑ تو کھل جائیں گے۔ لیکن لوگ اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھیں۔ نہیں وہاں جانا مناسب نہیں۔ کیوں نہ یہیں بیٹھی رہوں ایک بج ہی گیا ہے تین چار گھنٹہ میں سویرا ہوجائے گا۔ یہ سوچ کر بیٹھ گئی۔ مگر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی مجھے اس طرح یہاں بیٹھے دیکھ لے تو کیا ہو۔ سمجھے گا کہ چور ہے۔ گھات میں بیٹھا ہے۔ واقعی سمن اپنے ہی گھر میں چور بنی ہوئی تھی۔

پھاگن میں رات کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ سمن کے جسم پر صرف ایک پھٹی ہوئی ریشمی کرتی تھی۔ ہوا تیر کی طرح اس کی ہڈیوں میں چبھی جاتی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹرے جاتے تھے۔ اس پر نیچے کی نالی سے ایسی بدبو آرہی تھی کہ سانس لینا مشکل تھا۔ تاریکی کے بادل چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔ صرف بھولی بائی کے بالاخانہ پر سے روشنی کی شعائیں اندھیری گلی کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تاک رہی تھیں۔

سمن نے سوچا میں کیسی بدنصیب ہوں۔ ایک وہ عورتیں ہیں کہ آرام سے تکیہ لگائے سورہی ہیں۔ لونڈیاں پیر دباتی ہیں۔ ایک میں ہوں کہ یہاں بیٹھی ہوئی اپنی تقدیر کو روتی ہوں۔ میں یہ سب مصیبتیں کیوں جھیلتی ہوں؟ ایک جھونپڑی میں ٹوٹی کھاٹ پر سوتی ہوں۔ روکھی روٹیاں کھاتی ہوں۔ اور روز گھرکیاں سنتی ہوں۔ کیوں؟ محض نام کے لیے نہ۔ لیکن دُنیا میری اس نفس کشی کو کیا سمجھتی ہے؟ اس کی نگاہوں میں اس کی کیا قیمت ہے؟ کیا یہ مجھ سے چھپاہے۔ دسہرے کے میلے میں۔ محرم کے میلے میں۔ بنی باغ میں۔ مندروں میں سبھی جگہ تو دیکھ رہی ہوں۔ آج تک میں سمجھتی تھی۔ کہ بُرے لوگ ہی ان عورتوں پر جان دیتے ہیں۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا، کہ ان کی پہنچ شریفوں میں بھی کم نہیں ہے۔وکیل صاحب کتنے شریف آدمی ہیں۔ لیکن آج وہ بھولی بائی پر کیسے لٹو ہورہے تھے۔ اس طرح سوچتے سوچتے وہ اُٹھی۔ کہ کواڑ کھٹ کھٹاؤں۔ جو کچھ ہونا ہے ہوجائے۔ ایسا کون سا عیش کررہی ہوں۔ جس کے لیے یہ آفتیں سہوں۔ یہ مجھے کون سونے کے کور کھلادیتے ہیں۔ کون پھولوں کی سیج پر سلادیتے ہیں۔ دن بھر چھاتی پھاڑتی ہوں۔ تب جاکر ایک روٹی کھاتی ہوں۔ اس پر یہ دھونس۔ لیکن گجا دھر کے ڈنڈے کو دیکھتے ہی پھر چھاتی دہل گئی۔ حیوان انسان پر غالب آگیا۔

دفعتاً سمن نے دو کانسٹبلوں کو کندھے پر لٹھ رکھے آتے دیکھا۔ تاریکی میں وہ دیو معلوم ہوتے تھے۔ سمن کا خون خشک ہوگیا۔ کہیں چھپنے کہ جگہ نہ تھی۔ سوچا کہ اگر میں بیٹھی رہوں۔ تو یہ سب ضرور ہی کچھ نہ کچھ پوچھیں گے۔ میں کیا جواب دوں گی! وہ لپک کر اُٹھی اور زور سے کواڑ کھٹ کھٹائے۔ اورچلاّ کر بولی۔

"کھولو۔ دوگھڑی سے چلا رہی ہوں سنتے ہی نہیں!"

گجا دھر چونکا۔ پہلی نیند پوری ہوچکی تھی۔ اُٹھ کر کواڑ کھول دیے۔ سمن کی آواز میں

کچھ خوف تھا۔ اس وجہ سے وہ ضبط نہ کرسکا۔ اندر جاتے ہی سمن نے غصہ کے انداز سے کہا۔ "واہ رے سونے والے۔ گھوڑے بیچ کر سوئے ہو کیا۔ دو گھڑی سے کھڑی چلا رہی ہوں۔ سنتے ہی نہیں۔ ٹھنڈ کے مارے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔"

اسے سامنے دیکھ کر گجا دھر کا غصہ تازہ ہوگیا۔ وہ بولا۔ "مجھ سے اڑو مت بتاؤ ساری رات کہاں رہیں؟"

سمن بے گانہ انداز سے بولی۔ "کیسی ساری رات؟ نو بجے سوبھدرا کے گھر گئی تھی بلاوا آیا تھا۔ دس بجے ان کے یہاں سے لوٹ آئی۔ دو گھنٹہ سے تمھارے دروازہ پر کھڑی چلا رہی ہوں۔ بارہ بجے ہوں گے۔ تمھیں اپنی نیند میں کچھ خبر بھی رہتی ہے؟"

گجا دھر۔ تم دس بجے آئی تھیں؟

سمن نے دلیری سے کہا "ہاں ہاں دس بجے۔"

گجا دھر۔ بالکل جھوٹ ہے۔ میں بارہ کا گھنٹہ اپنے کانوں سے سن کر سویا ہوں۔

سمن۔ سنا ہوگا نیند میں سر پیر کی خبر تو رہتی نہیں۔ گھنٹے گنتے بیٹھے تھے۔

گجا دھر۔ اب یہ دھاندلی ایک نہ چلے گی۔ صاف صاف بتاؤ۔ تم اب تک کہاں رہیں۔ میں تمھارا رنگ آج کل خوب دیکھ رہا ہوں۔ اندھا نہیں ہوں۔ میں نے بھی تریاچرتر پڑھا ہے۔ صاف صاف بتلادو۔ نہیں آج جو کچھ ہونا ہے۔ ہوجائے گا۔

سمن۔ ایک بار تو کہہ دیا کہ میں دس گیارہ بجے یہاں آگئی۔ اگر تمھیں یقین نہیں آتا۔ نہ آوے۔ جو گہنے گڑھاتے ہو وہ مت گڑھانا۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ جب دیکھو تلوار میان سے باہر ہی رہتی ہے۔ نہ جانے کس بوتے پر۔

یہ کہتے کہتے سمن چونک گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ میں حد سے بڑھی جاتی ہوں ابھی دروازہ پر بیٹھے ہوئے اس نے جو باتیں سوچی تھیں۔ اور جس فیصلہ پر پہنچی تھی۔ وہ سب اسے فراموش ہوگئے۔ رواج اور دل میں جمے ہوئے خیالات ہم کو زندگی میں کسی فوری انقلاب سے روکتے ہیں۔

گجا دھر۔ سُمن کی یہ بے باکانہ باتیں سن کر سناٹے میں آگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سمن نے ایسی سخت کلامی کی جرأت کی تھی غضبناک ہوکر بولا۔ "کیا تو چاہتی ہے جو کچھ تیرا جی چاہے کیا کرے۔ اور میں چوں نہ کروں؟ تو ساری رات نہ جانے کہاں رہی۔ اب جو پوچھتا ہوں۔

تو کہتی ہے مجھے تمھاری پروا نہیں ہے۔ تم میرے لیے کیاکردیتے ہو! مجھے معلوم ہوگیا کہ شہر کا پانی تجھے بھی لگا۔ تونے بھی اپنی سہیلیوں کا رنگ پکڑا بس اب میرے ساتھ تیرا نباہ نہ ہوگا۔ کتنا سمجھاتا رہا کہ ان چڑیلوں کے ساتھ مت بیٹھ، میلے ٹھیلے مت جا۔ لیکن تونے نہ سنا مجھے تم جب تک نہ بتاؤگی۔ کہ ساری رات کہاں رہیں۔ تب تک میں تمھیں گھر میں بیٹھنے نہ دوں گا۔ نہ بتاؤگی تو سمجھ لو کہ آج سے تم میری کوئی نہیں۔"

سُمن نے خائف انداز سے کہا۔"وکیل صاحب کے گھر کو چھوڑکر میں اور کہیں نہیں گئی۔ تمھیں یقین نہ آئے تو آپ جاکر پوچھ لو۔ وہیں چاہے جتنی دیر لگی ہو۔ گانا ہورہاتھا، سوبھدرا دیبی نے آنے نہیں دیا۔"

گجا دھر نے طعنہ دیکر کہا۔"اچھا تو اب وکیل صاحب سے من ملاہے۔ یہ کہو، پھر بھلا مجھ مجورے کی پرواکیوں ہونے لگی۔"

یہ طعنہ سمن کے دل پر کٹار کی طرح لگا۔ جھوٹا الزام کبھی نہیں سہاجاتا۔ وہ تیور بدل کر بولی۔"کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔ حق ناحق ایک بھلے مانس کو بدنام کرتے ہو۔ مجھے آج دیر ہوگئی ہے۔ جو چاہو کہو۔ مارو پیٹو۔ ان کو کیوں بیچ میں گھسیٹتے ہو۔ وہ بے چارے تو جب تک میں گھر میں رہتی ہوں۔ اندر قدم نہیں رکھتے۔"

گجا دھر بولا۔"چل چھوکری مجھے نہ چڑا۔ ایسے ایسے کتنے بھلے مانس آدمیوں کو دیکھ چکاہوں۔ وہ دیوتا ہیں تو انھیں کے گھر جا۔ یہ گھر تیرے رہنے کے لائق نہیں۔ تیرے حوصلے بڑھ رہے ہیں۔ اب تیرا گزر یہاں نہ ہوگا۔"

سمن دیکھ رہی تھی کہ بات بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر اپنی باتیں کسی طرح واپس ہوسکتیں۔ تو انھیں واپس لے لیتی۔ لیکن نکلا ہوا تیر کب لوٹتا ہے۔ وہ رونے لگی۔ اور بولی"میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔ اگر میں نے ان کی طرف تاکا بھی ہو۔ اگر میں نے ان سے باتیں کی ہوں۔ تو میری زبان گرپڑے۔ ذرا من بہلانے سوبھدرا کے پاس چلی جاتی ہوں اب منع کرتے ہو نہ جاؤں گی۔"

دل میں جب ایک بار کوئی شبہ پیدا ہوجاتاہے۔ تو اس کا نکلنا مشکل ہوتاہے۔ گجا دھر نے سمجھا کہ سمن اس وقت محض میرا غصہ فرو کرنے کے لیے اتنی نرم پڑرہی ہے۔ کرخت لہجہ میں بولا"نہیں جاؤ۔ وہاں اونچی اٹاری سیر کو ملے گی۔ پکوان کھانے کو ملیں گے مخمل

گدتوں پر سوؤ گی۔ ہمیشہ راگ رنگ کی دھوم رہے گی۔"

طعنے اور غصّے میں آگ اور تیل کا تعلق ہے۔ طعنہ دل کو یوں پارہ پارہ کردیتا ہے جیسے چھینی برف کے ٹکڑے کو۔ بے جا اتہام کبھی برداشت نہیں ہوتا۔ سمن غصہ سے بے تاب ہوکر بولی۔"اچھا زبان سنبھالو۔ بہت ہوچکا۔ گھنٹہ بھر سے منہ میں جو اناپ شناپ آتا ہے۔ بکتے جاتے ہو۔ میں طرح دیتی جاتی ہوں۔ یہ اسی کا پھل ہے مجھے کوئی ہرجائی سمجھ لیا ہے۔

گجا دھر۔ میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

سمن۔ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔ ایشور تم سے سمجھیں گے۔

یہ وہی سمن ہے۔ جس کی گجا دھر کبھی پرستش کرتا تھا جس کی ایک نگاہِ مست اسے بے تاب کردیتی تھی۔ پر محبت غرض کا دوسرا نام ہے۔ جل کر بولا"مجھے کوس مت جہاں سینگ سمائے وہاں چلی جا۔"

سمن۔ ہاں یوں کہو مجھے رکھنا نہیں چاہتے جھوٹا الزام کیوں لگاتے ہوکیا تمھیں میرے اَن داتا ہو؟ جہاں مزدوری کروں گی۔ وہیں پیٹ پال لوں گی۔

گجا دھر۔ جاتی ہے کہ کھڑی گالیاں دیتی ہے۔

سمن جیسی مغرور عورت یہ ذلت نہ برداشت کرسکی۔ گھر سے نکالنے کی دھمکی نے اس کے خوفناک ارادوں کو پورا کردیا تھا۔ فیصلہ کن انداز سے بولی۔"اچّھا لو جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ مگر پھر ٹھٹک گئی۔ فیصلہ میں لغزش آگئی۔

گجا دھر ایک منٹ کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔"اپنے گہنے کپڑے لیتی جا۔ یہاں کچھ کام نہیں ہے۔"

ان الفاظ نے اُمید کے ٹمٹاتے ہوئے چراغ کو بجھادیا۔ سمن کو یقین ہوگیا۔ کہ اب یہ گھر مجھ سے چھوٹا۔ روتے ہوئے بولی۔" "میں لے کر کیا کروں گی؟"

مگر گجا دھر نے اس کی صندوقچی اٹھاکر زور سے باہر کی طرف پھینک دی۔ رشتۂ اُمید کا آخری دھاگا ٹوٹ گیا۔ اس نے صندوقچی اٹھالی۔ اور دروازہ سے نکل آئی۔ مگر اس کی اُمید میں ابھی تک جسم سربُریدہ کی تڑپ باقی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ گجا دھر اب بھی مجھے منانے آئے گا۔ اس لیے وہ دروازہ کے سامنے سڑک پر خاموش کھڑی رہی۔ روتے روتے اس کا آنچل

بھیگ گیا تھا۔ دفعتاً گجا دھر نے زور سے دونوں کواڑ بند کرلیے۔ یہ گویا اُمید کے دروازے تھے۔ سمن اب وہاں کھڑی ہوکر کیا کرتی۔ گجا دھر پر اس کی گریہ وزاری کا اب کیا اثر ہوسکتا تھا؟ سوچنے لگی کہاں جاؤں؟ اسے اب ندامت اور افسوس کے بجائے گجا دھر پر غصہ آرہا تھا۔ اُس نے اپنی دانست میں کوئی ایسا فعل نہیں کیا تھا۔ جس کی ایسی سخت سزا ملنی چاہیے تھی۔ اُسے گھر آنے میں دیر ضرور ہوگئی تھی۔ اس کے لیے دوچار گھڑکیاں کافی تھیں۔ یہ ستم خانہ برانداز سراسر ناروا تھا، اس نے گجا دھر کو منانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ منّت کی، خوشامد کی، روئی مگر اس نے سمن کی تحقیر ہی نہیں کی، بلکہ اس پر ایک بے جا الزام لگایا۔ اس وقت اگر گجا دھر سمن کو منانے بھی آتا تو وہ راضی نہ ہوتی۔ اس نے چلتے وقت سمن سے کہا تھا۔جاؤ اب منہ مت دکھانا یہ الفاظ سمن کے کلیجے میں چبھ گئے تھے۔ کیا میں ایسی بدنصیب ہوں۔ کہ وہ میرا منہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ کیا سنسار میں سب عورتوں کے شوہر ہوتے ہیں؟ کیا بیکس عورتیں نہیں ہوتیں؟ میں بھی اب بیکس ہوں۔ مزدوری کروں گی۔ بھیک مانگ کھاؤں گی مگر انھیں اب منہ نہ دکھاؤں گی۔ بسنت کی ہوا اور گرمی کی لُو میں کِتنا فرق ہے۔ ایک فرحت بخش و حیات پَرور ہے۔ دوسری مسموم و آتشیں محبت ہوائے بسنت ہے۔ نفرت گرمی کی لُو ہے جس پھول کو بسنت کی ہوا مہینوں میں کھِلاتی ہے۔ اسے لُو کا ایک جھونکا جلاکر خاک کردیتا ہے۔

(۱۱)

سُمن کے مکان سے تھوڑی دُور پر ایک خالی برآمدہ تھا۔ وہاں جاکر اس نے صندوقچہ سرھانے رکھ لیا۔ اور لیٹ گئی۔ تین بج چکے تھے۔ دوگھنٹہ اس نے یہ سوچنے میں صرف کیے۔ کہ کہاں جاؤں؟ اس کی ہم جلیسوں میں ہریا نام کی ایک بدقماش عورت تھی۔ وہاں پناہ مل سکتی تھی مگر سمن اُدھر نہ گئی۔ خودداری کا احساس ابھی باقی تھا۔ اب وہ ایک طرح سے آزاد تھی۔ اور ان فاسد خیالات کو عمل میں لاسکتی تھی۔ جن کے لیے اس کا دل برسوں سے بے قرار ہورہاتھا۔ اب اس پر لُطف زندگی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن جس طرح لڑکا کسی گائے یا بکری کو دُور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ پر اس کے قریب آتے ہی خوف سے منہ چھپالیتا ہے۔ اسی طرح سمن آرزوؤں کے دروازے پر پہنچ کر بھی اندر نہ داخل ہوسکی۔ شرم،افسوس، نفرت، نے مل کر اس کے پیروں میں بیڑی سی ڈال

دی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ سوبھدرا کے گھر چلوں۔ وہیں کھانا پکا دیا کروں گی کچھ خدمت کروں گی اور پڑی رہوں گی۔ آئندہ ایشور مالک ہے۔

اس نے صندوقچی آنچل سے چھپالی۔ اور پنڈت پدم سنگھ کے گھر آ پہنچی۔ موکل منہ ہاتھ دھو رہے تھے۔ کوئی آسن بچھائے دھیان کررہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہیں میرے گواہ نہ بگڑ جائیں۔ کوئی مالا پھیرتا تھا۔ مگر ان کے دانوں سے روپیوں کا حساب لگا رہاتھا۔ جو آج سے خرچ کرنے پڑیں گے۔ مہتر کھڑا ہوا رات کی بچی ہوئی پوریاں سمیٹ رہاتھا۔ سمن کو اندر جاتے ہوئے کچھ جھجک ہوئی۔ لیکن جیتن کہار کو آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔ سوبھدرا نے حیرت سے پوچھا۔"آج اِتنے سویرے کیسے چلیں؟"

سمن نے حسرت ناک انداز سے کہا۔"گھر سے نِکال دی گئی ہوں۔"

سوبھدرا۔ ارے کس بات پر؟

سمن۔ اس لیے کہ رات مجھے یہاں سے جانے میں دیر ہوگئی۔

سوبھدرا۔ تو اس ذرا سی بات کا اتنا بتنگڑ۔ دیکھو میں انھیں بلواتی ہوں عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

سمن۔ نہیں نہیں اُنھیں نہ بُلوانا۔ میں رودھوکر ہار گئی۔ لیکن اس بے رحم کا دل ذرا بھی نہ پسیجا اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔ اُسے گھمنڈ ہے کہ میں ہی اس کی پرورش کرتا ہوں۔ میں اس کا یہ گھمنڈ توڑدوں گی۔

سوبھدرا۔ چلو ایسی باتیں نہ کرو۔ میں اُنھیں بُلواتی ہوں۔

سمن۔ میں اب اس کا مُنہ دیکھنا نہیں چاہتی۔

سوبھدرا۔ تو کیا ایسا بگاڑ ہوگیا ہے؟

سمن۔ ہاں اب ایسا ہی ہے۔ اب اس سے میرا کوئی ناتا نہیں۔

سوبھدرا نے سوچا ابھی غصہ تازہ ہے۔ دو ایک دن میں راہِ راست پر آجائے گی۔ بولی۔"اچھا منہ ہاتھ تو دھولو! آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رات بھر سوئی نہیں ہو۔ کچھ دیر سولو۔ پھر باتیں ہوں گی۔

سمن۔ آرام سے سونا ہی ہوتا تو کیا ایسے کمینے آدمی سے پالا پڑتا۔ اب تو تمھاری پناہ میں آئی ہوں۔ رکھوگی تو رہوں گی۔ نہیں تو کہیں منہ میں کالکھ لگاکر ڈوب مَروں گی۔ مجھے ایک

کونہ میں تھوڑی سی جگہ دے دو۔ وہیں پڑی رہوگی۔ اپنے سے جو کچھ ہوسکے گا تمھاری چاکری بجالاؤں گی۔

جب پنڈت جی اندر آئے۔ تو سوبھدرا نے سارا واقعہ ان سے بیان کیا۔ پنڈت جی بڑی تشویش میں پڑے۔ ایک انجان عورت کو اس کے شوہر سے پوچھے بغیر اپنے گھر میں ٹھہرانا غیر مناسب معلوم ہوا۔ قانونی آدمی تھے۔ اس معاملہ کے قانونی پہلو پر بھی نگاہ گئی۔ ارادہ کیا کہ چل کر گجا دھر کو بلواؤں۔ اور سمجھاکر میاں بیوی میں میل کرا دوں۔ اس عورت کا یہاں سے چلاجانا ہی اچھا ہے۔ باہر آکر فوراً گجا دھر کے بُلانے کے لیے ایک آدمی بھیجا۔ لیکن گجا دھر گھر پر نہ ملا۔ کچہری سے آکر پنڈت جی نے پھر گجا دھر کو بُلوایا۔ مگر اب کے بھی وہی کیفیت ہوئی۔ اِدھر گجا دھر کو جوں ہی معلوم ہوا کہ سمن پدم سنگھ کے گھر گئی ہے۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ گھوم گھوم کر شرما جی کو بدنام کرنے لگا۔ پہلے بٹھل داس کے پاس گیا۔ انھوں نے اس کی باتوں کو وحی سمجھا۔ یہ قوم کا خادم۔ اور تمدنی نقائص کا دشمن۔ فراخدلی اور کم ظرفی کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ اس کے وسیع دل میں ساری دنیا کے لیے ہمدردی تھی۔ مگر اپنے مخالف کے لیے ذرا بھی جگہ نہ تھی۔ مخالفت سہل الیقین ہوتی ہے۔ زود یقینی نفرت کا خاصہ ہے۔ جب سے پدم سنگھ نے مجرے کی تجویز کی تھی۔ بٹھل داس کو ان سے بغض للہ ہوگیا تھا۔ وہ یہ ماجرا سنتے ہی پھُولے نہ سمائے۔ شرماجی کے احباب اور ہم پیشہ برادروں کے پاس جاکر یہ بشارت پہنچائی لوگوں سے کہتے۔ ”دیکھا آپ نے میں کہتا نہ تھا۔ کہ یہ جلسہ ضرور رنگ لائے گا۔ ایک برہمنی کو اس کے گھر سے نکال کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ بے چارہ شوہر چاروں طرف روتا پھرتاہے۔ یہ ہے اعلیٰ تعلیم کا معیار، یہ ہے تہذیب کی برکت۔ میں تو اس برہمنی کو ان کے یہاں آتے جاتے دیکھ کر سمجھ گیاتھا کہ ضرور دال میں کالا ہے۔ عورت نہایت حسین مگر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اندر ہی اندر یہ گل کھل رہاہے“۔ طرفہ یہ کہ جولوگ شرماجی کے بڑے دوست تھے۔ اور ان کی عادات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے بھی اس پر باور کرلیا۔ ایسی خبروں کے لیے ہم تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔

دوسرے دن جیتن علی الصّباح کسی کام کو بازار گیا۔ چاروں طرف یہی چرچا سُنا۔ دوکاندار پوچھتے تھے۔ ”کیوں جیتن! نئی مالکن کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟ کیوں چودھری! نئی بہو

تم سے پردہ کرتی ہیں یا سامنے نکلتی ہیں؟"

جیتن یہ پھبتیاں سُن کر گھر آیا۔ اور شرماجی سے بولا۔"بھیا۔ بھوجی نے گجا دھر کی دُلہن کو گھر میں ٹھیرا لیا ہے۔اِس پر بازار میں بڑی بدنامی ہورہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گجا دھر سے روٹھ کر آئی ہے۔"

فی الواقع گجا دھر نے شرماجی کے خلاف ڈھول اُڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی سارے محلّے میں ایک ایک فرد کے کان میں یہ بات پڑگئی۔ دوکانوں پر آدمیوں کے غول کے غول کھڑے اس واقعہ کا چرچا کرتے نظر آتے تھے۔ مخالفت نہایت چرب ہوتی ہے۔ ساگ بیچنے والی کنجڑن۔ نظیرن ایک ادھیڑ، شوخ، ملیح عورت تھی۔ شرماجی کے گھر ساگ بیچنے جایا کرتی تھی۔ اس نے عہد کیا کہ اب شہدے کے گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔ بوڑھا گھراؤ گوالا۔ شرماجی کے یہاں دودھ دیاکرتاتھا اس کی ایک بھینگی چھدرے بالوں والی جوان لڑکی تھی۔ بیوی سے بولا۔"خبردار بیٹی کو ان کے گھر نہ بھیجنا۔ یہ نام کے بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ اور کرتوت یہ ہیں"۔ مگر محلّے میں ایسی خوشحال بیویاں بھی تھیں۔ جن کا دل فراخ تھا۔ جو انسانی کمزوریوں کو فلسفیانہ نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ان پر اس تلاطم کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ظہورن ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ پڑوس والے اسے توپ یا موٹرکار کہا کرتے تھے۔وہ لکڑی، اوپلے، ہانڈیاں اور مٹی کا تیل بیچتی تھی۔ اس کی دوکان پر ایک خاص قسم کی عورتوں کا جھمگٹ رہتا تھا رات دن ایک خاص قسم کے چرچے ہواکرتے تھے۔وہاں جیوری نے سمن کے حق میں فیصلہ کیا۔ کون پیڑ ہے جسے کبھی ہوا نہیں لگی۔ بچریا اس لٹھ گنوار کے پلّے پڑی تھی۔ پہننے اوڑھنے کو ترستی تھی۔ اب کچھ دن تو چین سے کٹیں گے صورت شکل اللہ اسی لیے دیتا ہے۔ اور کاہے کے لیے۔ موتی کے مالا سؤر کے گلے میں کیا سوبھا دے گی۔

شرماجی نے جیتن کی زبانی یہ ماجرا سُنا۔ تو سناٹے میں آگئے۔ گویا سرپر آسمان ٹوٹ پڑا کچہری جانے کے لیے اچکن پہن رہے تھے۔ ایک ہاتھ آستین میں تھا دوسرا باہر۔ کپڑے پہننے کی سُدھ نہ رہی جس بدنامی سے وہ ڈرتے تھے۔ وہ آخر ہوہی گئی۔ اب اُنھیں گجا دھر کی لاپرواہی کا راز سمجھ میں آیا۔ وہ اب ان پُر معنی نگاہوں کا منشا سمجھے۔ جو کچہری میں ان پر چاروں طرف سے پڑتی تھیں۔اب ان تشریف آوریوں کا عقدہ حل ہوا۔ جن کا سلسلہ دو

دن سے جاری تھا۔ وہ معمّے حل ہوئے جن میں چند بے تکلف احباب ان میں باتیں کرتے تھے۔خاموش تصویر کھڑے سوچنے لگے۔ سوائے اس کے اور کیا علاج ہے۔ کہ اسے گھر سے نکال دوں۔ اس کے سر پر جو آتی ہو آئے۔ میرا کیا بس ہے۔ کسی طرح بدنامی کا داغ تو مٹے۔ سوبھدرا پڑی دل میں جھنجلائے۔ انھیں کیا پڑی تھی کہ اسے اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ انھیں تو گھر میں بیٹھے رہنا ہے دوسروں کے سامنے آنکھیں تو میری نیچی ہورہی ہے۔ مگر یہاں سے نکال دوں۔ تو بے چاری جائے گی کہاں؟ یہاں تو اس کا اور کہیں ٹھکانا نہیں معلوم ہوتا۔ اور اپنے دل میں مجھے کیا سمجھے گی۔ بے رحم بے مروّت۔ گجا دھر اب شاید اسے اپنے گھر میں نہ رکھے گا۔ آج دوسرا دن ہے اس نے خبر تک نہ لی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ لیکن بدنامی سے بچنے کا صرف یہی ایک علاج ہے۔ جتین سے بولے۔"تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہ کہا؟"

جتین ۔ سرکار مجھے تو آج معلوم ہواہے۔ نہیں تو جان لو میں بنا کہے رہتا؟

شرما۔ اچھا تو گھر میں جاؤ اور سمن سے کہو کہ تمھارے یہاں رہنے سے ان کی بدنامی ہورہی ہے۔ جس طرح بن پڑے۔ آج ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ ذرا آدمی کی طرح بولنا۔ لاٹھی مت مارنا۔

جتین بہت خوش ہوا۔ اسے سُمن سے وہ چڑھ ہی تھی۔ جو نوکروں کو ان چھوٹے آدمیوں سے ہوتی ہے۔ جو اِن کے آقاؤں کے منہ لگے ہوتے ہیں۔ سمن کی چال ڈھال اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ بوڑھے آدمی معمولی بناؤ چناؤ کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ گنوار تھا سیاہ کو سیاہ کہتا تھا۔ سفید کو سفید سیاہ کو سفید کہنے کا اسے سلیقہ نہ تھا۔ شرماجی نے ہرچند تاکید کردی تھی۔ کہ انسانیت سے باتیں کرنا۔ مگر اس نے جاتے ہی جاتے سمن کا نام زور سے پکارا۔

سُمن شرماجی کے لیے پان بنارہی تھی۔ جتین کی آواز سُن کر چونک پڑی اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف تاکنے لگی۔

جتین نے کہا۔"تاکتی کیا ہو۔ وکیل صاحب کا حکم ہے کہ آج ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ سارے محلّے میں بدنام کردیا۔ تم کو لاج نہیں ہے۔ ان کو تو اپنے نام کی لاج ہے، بانسٹر، بانٹر گئے ۔ چار ہاتھ کی پکیا بھی لے گئے۔"

سوبھدرا کے کان میں بھی بھنک پڑی۔ آکر بولی۔ "کیا ہے؟ جیتن! کیا کہہ رہے ہو؟"
جیتن۔ کچھ نہیں سرکار کا حکم ہے۔ کہ یہ ابھی یہاں سے چلی جائے۔ چاروں طرف بدنامی ہورہی ہے۔
سوبھدرا۔ تم جاکر ذرا انھیں کو یہاں بھیج دو۔
سمن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کھڑی ہوکر بولی۔ "نہیں بہوجی انھیں کیوں بُلاتی ہو۔ کوئی کسی گھر میں زبردستی تھوڑی ہی رہتا ہے۔ میں ابھی چلی جاتی ہوں۔ اب اس چوکھٹ کے اندر پھر پاؤں نہ رکھوں گی۔
مصیبت میں انسان کے حسّیات تیز ہوجاتے ہیں۔ اس وقت بے مروتی ظلم معلوم ہوتی ہے۔ اور تشفّی احسانِ بیکراں۔ سمن کو شرماجی سے ایسی اُمید نہ تھی۔ اس خودغرضی کے ساتھ جو ایام مصیبت کے لیے مخصوص ہے۔ اس نے انھیں بدباطن، خودپرور اور بے رحم قراردیا۔ تم آج اپنی بدنامی کو ڈرتے ہو۔ تم کو اپنی عزت بڑی پیاری ہے۔ ابھی کل ایک ہرجائی کے ساتھ بیٹھے ہوئے پھولے نہ سماتے تھے۔ اس کے پیروں تلے آنکھیں بچھاتے تھے۔ تب عزّت نہ جاتی تھی۔ آج عزّت میں بٹّہ لگا جاتاہے۔
اس نے اطمینان سے صندوقچی اُٹھا لی۔ اور سوبھدرا کو ایک بار دردناک نگاہوں سے دیکھ کر گھر سے چلی گئی۔

(۱۲)

دروازہ پر آکر سمن سوچنے لگی۔ اب کہاں جاؤں؟ اس کے دل پر گجا دھر کی بے رحمی کا بھی اتنا صدمہ نہ ہوا تھا۔ جتنا اس رسوائی سے ہورہاتھا۔ اسے اب معلوم ہوا کہ میں نے گھر سے نکلنے میں سخت غلطی کی۔ میں سوبھدرا کے بل پر کود رہی تھی۔ میں ان پنڈت جی کو کتنا شریف سمجھتی تھی۔ پر اب معلوم ہوا۔ کہ یہ بھی رنگے ہوئے سیار ہیں۔ اپنے گھر کے سوا اب مجھے اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ مجھے دوسروں کی نازبرداری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا میرے گھر نہیں ہے؟ کیا میں ان کے گھر زندگی کاٹنے آئی تھی؟ دوچار دن میں جب ان کا غصہ دھیما ہوجاتا۔ تو آپ ہی چلی جاتی۔ غصہ میں ہماری آنکھوں پر کیسا پردہ پڑجاتا ہے مجھے یہاں بھول کر بھی نہ آنا تھا۔
یہ سوچتے ہوئے سمن آگے چلی۔ پر تھوڑی ہی دُور چل کر اس کے خیالات نے پھر

پلٹا کھایا۔ میں کہاں جا رہی ہوں! وہ اب مجھے ہرگز گھر میں قدم نہ رکھنے دیں گے۔ میں نے کتنی عاجزی کی تھی۔ پر ان کا دل ذرا بھی نہ پسیجا۔ جب صرف رات کو چند گھنٹوں کی دیر ہو جانے سے وہ مجھ پر اِتنا شبہ کرنے لگے۔ تو اب تو مجھے پورے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اور میں شامت کی ماری وہیں آئی۔ جہاں نہ آنا چاہیے تھا۔ وہ تو اب مجھے دُور ہی سے دھتکار دیں گے۔ مجھے صرف کہیں پڑ رہنے کی جگہ چاہیے کھانے بھر تو کسی نہ کسی طرح کما ہی لوں گی۔ پھر کسی کی غلامی کیوں کروں۔ ان کے یہاں مجھے ایسا کون سا آرام تھا۔ ناحق پیروں میں بیڑی پڑی ہوئی تھی۔ اگر اب انھوں نے دنیا کے شرم سے مجھے گھر میں رکھ بھی لیا۔ تو اُٹھتے بیٹھتے طعنے دیں گے۔ کہیں ایک مکان طے کرلوں۔ بھولی بائی کیا میرے ساتھ اتنا بھی سلوک نہ کرے گی۔ وہ مجھے باربار اپنے گھر بلاتی تھی۔ کیا اب اتنی مروت بھی نہ کرے گی۔

اچھا امولا چلی جاؤں تو کیا ہو؟ لیکن وہاں کون اپنا بیٹھا ہوا ہے ۔ اماں مر ہی گئیں شانتا ہی کا نباہ ہونا مشکل ہے۔ مجھے کون پوچھنے والا ہے۔ ممانی جینے نہ دیں گی۔ طعنوں سے چھید چھید کر مار ڈالیں گی۔ چلو بھولی ہی سے مکان کے لیے کہوں دیکھوں کیا جواب دیتی ہے۔ کچھ نہ ہوا تو گنگاجی تو کہیں نہیں گئی ہیں۔

دِل میں یہ رائے قائم کرکے سمن بھولی کے گھر کی طرف چلی۔ اِدھر اُدھر تکتی جاتی تھی۔ کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ یا کہیں گجا دھر ہی کی نگاہ نہ پڑجائے۔ بھولی کے دروازے پر پہنچ کر سمن نے سوچا۔ اس کے یہاں کیوں جاؤں؟ کسی دوسری پڑوسن سے کہوں۔ تو کیا کام نہ چلے گا۔ وہ اُلٹے پاؤں لوٹنا چاہتی تھی۔ کہ دفعتاً بھولی نے اِسے دیکھ لیا۔ اور اشارے سے اوپر بلایا۔ سمن اوپر چلی گئی۔

بھولی کا کمرہ دیکھ کر سمن کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک بار وہ پہلے بھی آئی تھی۔ مگر آنگن ہی سے واپس چلی گئی تھی۔ کمرہ فرش شیشہ آلات اور تصاویر سے آراستہ تھا۔ وسط میں قالین بچھا ہوا تھا، اور اس پر ایک کارچوبی مسند رکھی ہوئی تھی۔ سامنے ایک قدِّ آدم آئینہ تھا۔ اور ایک گوشے میں ایک چھوٹی سی چوکی پر چاندی کا پاندان رکھا ہوا تھا۔ دوسری چوکی پر چاندی کی طشتری، گلاس، خاصدان وغیرہ قرینہ سے رکھے ہوئے تھے۔ سمن یہ پُر تکلف سامان دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ پدم سنگھ شرما وکیل تھے۔ لیکن ان کے کمرہ میں بھی یہ

آرائش نہ تھی۔

بھولی نے پوچھا۔"آج یہ صندوقچی لیے اِدھر کہاں سے آرہی تھیں؟"

سمن۔ یہ رام کہانی پھر کہوں گی۔ اس وقت تم مجھ پر اتنی مہربانی کرو۔ کہ میرے لیے کہیں الگ ایک گھر ٹھیک کرادو۔ میں اُس میں رہنا چاہتی ہوں۔

"بھولی نے متعجب ہوکر پوچھا۔"یہ کیوں؟ کیا شوہر سے لڑائی ہوگئی؟"

سمن۔ نہیں لڑائی کی کیا بات ہے۔ اپنا جی ہی تو ہے۔

بھولی۔ ذرا میرے سامنے تو آنکھیں پھیرو۔ ہاں چہرہ صاف کہہ رہا ہے۔ کیوں، کیا بات ہوئی؟

سمن۔ سچ کہتی ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے۔ اگر اپنے رہنے سے کسی کو تکلیف ہو تو کیوں رہوں۔

بھولی ۔ ارے تو مجھ سے صاف صاف کہتیں کیوں نہیں۔ کس بات پر بگڑے ہیں؟

سمن۔ بگڑنے کی بات نہیں ہے۔ جب بگڑ ہی گئے تو کیا رہ گیا۔

بھولی۔ تم لاکھ چھپاؤ۔ میں تاڑ گئی۔ سمن بُرا نہ مانو تو کہہ دوں۔ میں جانتی تھی کہ کبھی نہ کبھی تم لوگوں میں اَنْ بَنْ ضرور ہوگی۔ ایک گاڑی میں کہیں عربی گھوڑی اور لدّو ٹٹو جت سکتے ہیں۔ تمھیں تو کسی بڑے گھر کی رانی بننا چاہیے تھا۔ مگر پالے پڑی اس کھوسٹ کے جو تمھارے پَیر دھونے کے لائق نہیں۔ تمھیں ہو کہ یوں نباہ رہی ہو۔ دوسری عورت ہوتی۔ تو ایسے میاں پر لات مارکر کبھی کی چلی گئی ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمھاری شکل و صورت مجھے دی ہوتی، تو میں نے اب تک سونے کی دیوار کھڑی کرلی ہوتی۔ مگر معلوم نہیں کہ تمھاری طبعیت کیسی ہے تم نے شاید اچھی تعلیم نہیں پائی؟

سمن۔ میں دوسال تک ایک عیسائی لیڈی سے پڑھ چکی ہوں۔

بھولی۔ دوتین سال کی اور کسر رہ گئی۔ تب معلوم ہوجاتا کہ ہماری زندگی کا کیا مقصد ہے، ہمیں کیسے زندگی کا لطف اُٹھانا چاہیے۔ ہم کوئی بھیڑ بکری تو ہیں نہیں کہ ماں باپ جس کے گلے مڑھ دیں۔ بس اسی کی ہورہیں۔ اگر اللہ کو منظور ہوتا کہ تم مصیبتیں جھیلو۔ تو تمھیں پریوں کی صورت کیوں دیتا؟ یہ بیہودہ رواج ہمیں لوگوں میں ہے۔کہ عورتوں کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں۔ نہیں تو اور سب ملکوں میں عورت آزاد ہے۔ اپنی پسند سے شادی کرتی

ہے۔ اور جب اسے راس نہیں آتی تو چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن ہم لوگ وہی پرانی لکیر پیٹے چلی جارہی ہیں۔

سمن نے سوچ کر کہا۔ "کیا کریں۔ بہن! لوک لاج کا ڈر ہے۔ نہیں تو آرام سے رہنا کسے بُرا معلوم ہوتاہے۔"

بھولی۔ یہ سب اسی جہالت کا نتیجہ ہے۔ میرے ماں باپ نے بھی مجھے ایک بوڑھے میاں کے گلے باندھ دیاتھا۔ اس کے یہاں دولت تھی۔ اور ہر ایک قسم کا آرام تھا۔ لیکن اس کی صورت سے مجھے نفرت تھی۔ میں نے کسی طرح چھ مہینے تو کاٹا۔ اور پھر نکل کھڑی ہوئی۔ زندگی جیسی نعمت رو روکر دن کاٹنے کو نہیں دی گئی ہے۔ جب زندگی کا کچھ مزہ ہی نہ ملا۔ تو اس سے فائدہ ہی کیا۔ پہلے مجھے بھی ڈرلگتا تھا کہ بڑی رسوائی ہوگی۔ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے۔ لیکن گھر سے نکلنے کی دیر تھی۔ پھر تو میرا وہ رنگ جما۔ کہ اچھے اچھے خوشامدیں کرنے لگے۔ گانا میں نے گھر ہی پر سیکھا تھا۔ کچھ اور سیکھ لیا۔ بس سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ آج یہاں کون رئیس، کون مہاجن، کون مولوی، کون پنڈت، کون افسر ایسا ہے جو میرے تلوے سہلانے میں اپنی عزت نہ سمجھے؟ مندروں میں، ٹھاکردواروں میں، روضوں پر میرے مجرے ہوتے ہیں۔ لوگ منتیں کرکے لے جاتے ہیں۔ اسے میں اپنی بے عزتی کیسے سمجھوں؟ ابھی جھوٹوں کہلا بھیجوں۔ تو تمھارے کرشن مندر کے مہنت جی دوڑے ہوئے چلے آویں۔ اگر کوئی اسے بے عزتی سمجھے تو سمجھا کرے۔

سمن۔ بھلا گانا کتنے دنوں میں آجائے گا۔

بھولی۔ تمھیں چھ مہینہ میں آجائے گا۔ یہاں گانے کو کون پوچھتا ہے۔ دُھرپت اور تال کی ضرورت ہی نہیں۔ بس چلتی ہوئی غزلوں کی دھوم ہے۔ دوچار ٹھمریاں اور کچھ تھئیٹر کی چیزیں آجائیں۔ پھر تم ہی تم ہو۔ یہاں تو اچھی صورت اور مزیدار باتیں چاہیے۔ اور یہ دونوں وصف خدا نے تم میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ میں قسم کھاکر کہتی ہوں۔ سمن! تم ایک بار اس لوہے کی زنجیر کو توڑ دو۔ پھر دیکھو لوگ کیسے دیوانوں کی طرح تمھارے پیچھے دوڑتے ہیں۔

سمن۔ نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ "یہی بُرا معلوم ہوتا ہے کہ..........."

بھولی۔ ہاں ہاں کہو یہی کہنا چاہتی ہو نہ ۔ کہ اَیرے غیرے سب سے بے شرمی کرنی پڑتی

ہے۔ شروع میں مجھے بھی یہی جھجک ہوئی تھی۔ مگر بعد کو معلوم ہوا۔ کہ یہ خیال ہی خیال ہے۔ یہاں ایروں غیروں کو آنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ یہاں تو صرف گانٹھ کے پورے آتے ہیں۔ صرف انھیں پھنسائے رکھنا چاہیے۔ اگر وہ شریف ہیں، تب تو طبیعت آپ ہی آپ ان سے مِل جاتی ہے۔ اور بے شرمی کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اُس سے اپنی طبیعت نہ ملے تو اِسے باتوں میں لگائے رہو۔ جہاں تک بنے اِسے نوچو، کھسوٹو۔ آخر کو وہ پریشان ہوکر خود ہی چلاجائے گا۔ اس کے دوسرے بھائی اور آپھنسیں گے۔ اور پھر پہلے تو جھجک ہوتی ہی ہے۔ کیا شوہر سے نہیں ہوتی۔ جس طرح رفتہ رفتہ اس کے ساتھ جھجک دور ہوجاتی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوتا ہے۔

سُمن ۔ نے مسکرا کر کہا۔ ”تم میرے لیے ایک مکان کی تو فکر کردو۔“

بھولی نے تاڑلیا کہ مچھلی چارہ کترنے لگی۔ اب شست کو کڑے کرنے کی ضرورت ہے۔ بولی۔ ”تمھارے لیے یہی گھر حاضر ہے آرام سے رہو۔“

سمن۔ تمھارے ساتھ نہ رہوں گی۔

بھولی۔ بدنام ہوجاؤ گی کیوں؟

سمن۔ (جھینپ کر) نہیں یہ بات نہیں ہے۔

بھولی۔ خاندان کی ناک کٹ جائے گی؟

سمن۔ تم تو ہنسی اڑاتی ہو۔

بھولی۔ پھر کیا پنڈت گجا دھر پرشاد پانڈے ناراض ہوجائیں گے؟

سمن۔ اب میں تم سے کیا کہوں۔

اگرچہ سمن کے پاس بھولی کا جواب دینے کے لیے کوئی دلیل نہ تھی۔ بھولی نے اس کے اعتراضات کا مذاق اڑاکر انھیں پہلے ہی سے کمزور کردیا تھا۔ تاہم بے حیائی اور عصمت فروشی سے انسان کو جو خلقی نفرت ہوتی ہے وہ اس کے دل کو ڈانوا ڈول کررہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے جذبات اور خیالات کو لفظوں میں بیان نہ کرسکتی تھی اس کی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو کسی باغ میں پکے ہوئے پھل دیکھ کر للچاتا ہے۔ پر باغبان کی غیر موجودگی میں بھی انھیں توڑ نہیں سکتا۔

اتنے میں بھولی نے کہا۔ ”تو کتنے تک کرائے کا مکان چاہتی ہو؟ میں اپنی ماما کو بلاکر

تاکید کروں۔

سمن۔ یہی دوتین روپے!

بھولی۔ اور کام کیا کروگی؟

سمن۔ سلائی کا کام کرسکتی ہوں۔

بھولی۔ اور اکیلی ہی رہوگی؟

سمن۔ ہاں اور کون ساتھ ہے؟

بھولی۔ کیسی بچّوں کی سی باتیں کررہی ہو۔ اری دیوانی تو آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر اندھی بنتی ہے بھلا اکیلے گھر میں ایک دن بھی تیرا نباہ ہوگا۔ دن دہاڑے آبرو لٹ جاوے گی۔ اس سے تو ہزار درجہ یہی اچّھا ہے کہ اپنے شوہر ہی کے پاس چلی جا۔

سمن۔ ان کی تو صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب تم سے کیا چھپاؤں ابھی پرسوں وکیل صاحب کے یہاں تمھارا مجرا ہوا تھا۔ ان کی بیوی مجھ سے بڑی محبت رکھتی ہیں۔ انھوں نے مجھے مجرا دیکھنے کو بلایا۔ اور بارہ ایک بجے تک آنے نہ دیا۔ جب تمھارا گانا ہوچکا۔ تو میں گھر آئی۔ بس اتنی سی بات پر یہ اتنے بگڑے کہ جو کچھ منہ میں آیا بکتے رہے۔ یہاں تک کہ وکیل صاحب سے پاپ بھی لگادیا۔ بہن! میں ایشور کو بیچ دے کر کہتی ہوں۔ میں نے انھیں منانے کی بڑی کوشش کی۔ روئی پیروں پڑی پر انھوں نے گھر سے نکال ہی دیا۔ اپنے گھر میں کوئی نہیں رکھتا۔ تو کیا زبردستی ہے۔ وکیل صاحب کے یہاں گئی۔ کہ دس پانچ دن رہوں گی۔ پھر جیسا کچھ ہوگا۔ دیکھاجائے گا پر اس ظالم نے وکیل صاحب کو بھی بدنام کرڈالا۔ انھوں نے مجھے کہلا بھیجا۔ کہ یہاں سے چلی جاؤ بہن! اور سب تکلیف تھی پر یہ اطمینان تھا۔ کہ نرائن عزّت سے نباہے۔ جانے میں پر کلنک کا ٹیکا ماتھے پر لگ ہی گیا۔ اب چاہے سرپر جو کچھ پڑے۔ مگر اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔

یہ کہتے کہتے سمن کی آنکھیں بھر آئیں۔ بھولی نے تشفّی دے کر کہا۔"اچّھا پہلے ہاتھ منہ تو دھو ڈالو۔ کچھ ناشتہ کرلو۔ پھر صلاح ہوگی۔ معلوم ہوتاہے کہ تمھیں رات بھر نیند نہیں آئی"۔

سمن۔ یہاں پانی مِل جائے گا؟

بھولی نے مسکرا کے کہا! "سب انتظام ہوجائے گا۔ میرا کہار ہندو ہے۔ یہاں کتنے ہی

ہندو حضرات آیا کرتے ہیں۔ اُن کے لیے ایک کہار رکھ لیا ہے۔"

بھولی کی بوڑھی ماما سمن کو غسل خانہ میں لے گئی۔ وہاں اس نے صابن سے غسل کیا۔ تب ماما نے اس کے بال گوندھے۔ اور ایک نئی ریشمی ساڑھی اس کے پہننے کے لیے لائی۔ سمن جب اوپر آئی۔ اور بھولی نے اسے دیکھا۔ تو رشک آمیز انداز سے مسکراکر بولی۔"ذرا جاکر آئینے میں منہ دیکھ لو۔"

سمن شیشے کے سامنے گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ حُسن کی ایک مورت اس کے سامنے کھڑی ہے۔ سمن نے کبھی اپنے تئیں اتنا حسین نہ سمجھا تھا۔ غرورِ حسن سے اس کا چہرہ کھل اُٹھا اور آنکھوں میں نشہ چھا گیا۔ وہ ایک کوچ پر لیٹ گئی۔

بھولی نے اپنی ماما سے کہا۔"کیوں ظہورن اب تو سیٹھ جی آجائیں گے پنجے میں؟"

ظہورن بولی"تلوے سہلائیں گے تلوے۔"

تھوڑی دیر میں کہار مٹھائیاں لایا۔ سمن نے ناشتہ کیا۔ پان کھایا اور پھر آئینے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس کے دل نے کہا۔"یہ آرام چھوڑکر اس قفسِ تاریک میں کیوں رہوں؟"

بھولی نے پوچھا۔"گجا دھر پرشاد مجھ سے تمھارے بارے میں کچھ پوچھیں تو کیا کہوں؟"

سمن نے کہا۔"کہہ دینا یہاں نہیں ہے۔"

بھولی کا مقصد پورا ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ سیٹھ بل بھدر داس جو اب تک مجھ سے کنّی کاٹتے پھرتے تھے۔ اس تیغِ ناز سے جاں بر نہ ہوسکیں گے۔

سمن کی حالت اس طماع ڈاکٹر کی سی تھی، جو اپنے کسی مریض دوست کو دیکھنے جاتاہے اور فیس کے روپے اپنے ہاتھوں سے نہیں لیتا۔ شرم سے کہتا ہے اس کی کیا ضرورت ہے، لیکن جب روپے اس کی جیب میں ڈال دیے جاتے ہیں، تو خوشی سے مسکراتا ہوا گھر کی راہ لیتا ہے۔

(۱۳)

پدم سنگھ کے ایک بڑے بھائی مدن سنگھ تھے۔ وہ گھر کا انتظام کرتے تھے۔ تھوڑی سی زمینداری تھی۔ کچھ لین دین کرتے تھے۔ اور دو تین ہلوں کی کھیتی کرالیتے تھے۔ ان کے ایک

ہی لڑکا تھا۔ نام سدن سنگھ تھا۔ لڑکیاں تین تھیں۔ منّی، چھنّی اور چنّی۔ بیوی کا نام بھاما تھا۔ ماں باپ کا اکیلا لڑکا بڑا خوش نصیب ہوتا ہے اسے میٹھی میٹھی چیزیں خوب کھانے کو ملتی ہیں۔ مگر کڑوی تنبیہ کبھی نہیں ملتی۔ بچپن میں سدن ضدی، شوخ اور لڑاکا تھا۔ باشعور ہو کر آوارہ مزاج۔ غصہ ور اور سُست ہوگیا۔ ماں باپ کو یہ سب منظور تھا۔ وہ چاہے کتنا بھی بگڑ جائے پر آنکھوں کے سامنے سے نہ ٹلے۔ وہ اس سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہ ہوسکتے تھے۔ پدم سنگھ نے باربار اصرار کیا۔ کہ اسے میرے ساتھ جانے دیجیے۔ میں اس کا نام کسی مدرسے میں لکھا دوں گا۔ مگر ماں باپ راضی نہ ہوئے۔ ماں کہتی تھی گھر میں کھانے کو بہت ہے۔ بن بن کی پتّی کون توڑوائے۔ اُن پڑھ ہی رہے گا۔ آنکھوں سے دیکھتے تو رہیں گے۔ سدن نے اپنے قصبے ہی کے مدرسے میں اُردو اور ہندی پڑھی تھی۔ بھاما کے خیال میں اسے اس سے زیادہ تعلیم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

سدن اپنے چچا کے ساتھ جانے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا۔ ان کی وضع و قطع ان کے صابُن اور تولیے، جوتے اور سلیپر، گھڑی اور کالر کو دیکھ کر اس کا جی بہت لہراتا۔ گھر میں سب کچھ تھا۔ مگر یہ تکلف کا سامان کہاں۔ اس کا بھی جی چاہتا، میں چچا کی طرح کپڑے پہن کر ٹمٹم پر سیر کرنے نکلوں۔ وہ اپنے چچا کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔ ان کی کوئی بات نہ ٹالتا۔ ماں باپ کی باتوں پر تو کان نہ دیتا۔ اکثر دوبدو جواب دیتا۔ مگر چچا کے سامنے وہ حلم اور شرافت کا پتلا بن جاتا تھا۔ ان کی نفاست اور خوش وضعی نے اسے مطیع کرلیا تھا۔ پدم سنگھ گھر آتے تو سدن کے لیے اچھے اچھے کپڑے اور جوتے لاتے۔ سدن اُن چیزوں پر ٹوٹ پڑتا تھا۔

ہولی کے دن پدم سنگھ ضرور گھر آیا کرتے تھے۔ اب کی بھی ایک ہفتہ قبل ان کا خط آیا تھا کہ ہم آئیں گے۔سدن ریشمی اچکن اور وارنش جوتوں کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ہولی کے ایک دن پہلے مدن سنگھ نے اسٹیشن پر پالکی روانہ کی صبح بھی شام بھی دوسرے دن بھی دونوں وقت سواری گئی۔ لیکن وہاں تو بھولی بائی کے مجرے کی ٹھہر چکی تھی۔ گھر کون آتا؟ یہ پہلی ہی ہولی تھی کہ پدم سنگھ گھر نہیں آئے۔ بھاما رونے لگی اور سدن کی مایوسی کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ نہ کپڑے نہ لتّے ہولی کیسے کھیلے! مدن سنگھ بھی مغموم تھے۔ سارے گھر میں ایک اُداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں کی مستورات ہولی کھیلنے آئیں۔ بھاما کو اُداس دیکھ

تشفّی دینے لگیں۔ ''بہن پرایا کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ وہاں میاں بیوی شہر کی بہار دیکھتے ہوں گے۔ گاؤں میں کیا رکھا ہے۔'' گانا بجانا ہوا۔ پر بھاما کا جی نہ لگا۔ مدن سنگھ ہولی کے دن خوب بھنگ پیا کرتے تھے۔ آج بھنگ چھوئی بھی نہیں۔ سدن دن بھر ننگے بدن منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ شام کو آکر ماں سے بولا۔''میں چچا کے پاس جاؤں گا''۔

بھاما۔ وہاں تیرا کون بیٹھا ہوا ہے؟

سدن۔ کیوں چچا صاحب نہیں ہیں؟

بھاما۔ اب وہ چچا نہیں ہیں۔ چار پیسے کمانے لگے۔ وہاں تمھاری کوئی بات بھی نہ پوچھے گا۔

سدن۔ میں تو جاؤں گا۔

بھاما۔ ایک بار کہہ دیا مجھے دق مت کرو۔ وہاں جانے کو میں نہ کہوں گی۔

جوں جوں بھاما منع کرتی تھی سدن ضد پکڑتا تھا۔ آخر وہ جھنجلاکر وہاں سے اُٹھ گئی۔ سدن بھی باہر چلا آیا۔ ضد سامنے کا وار نہیں برداشت کرسکتی۔ اس پر پہلو سے وار کرنا چاہیے۔ بدکا ہوا گھوڑا ڈرانے سے بھاگتا ہے۔ دانہ دکھانے اور چمکارنے سے قابو میں آتا ہے۔ سدن نے دل میں فیصلہ کیا کہ چچا کے پاس بھاگ چلوں۔ نہ جاؤں تو یہ لوگ کون مجھے ریشمی اچکن بنوادیں گے۔ بہت خوش ہوں گے تو فین سکھ کا کرتہ سلوادیں گے۔ ایک موہن مالا بنوادی ہے تو جانتے ہیں جگ جیت لیا۔ سارے گاؤں میں دکھاتے پھرتے ہیں۔ میں تو جاؤں گا اور بیچ کھیت جاؤں گا۔ دیکھوں مجھے کون روکتا ہے۔

یہ فیصلہ کرکے وہ موقع کا انتظار کرنے لگا۔ رات کو جب لوگ سوگئے تو چپکے سے اُٹھ کر گھر سے نِکل کھڑا ہوا۔ اسٹیشن یہاں سے تین میل کے قریب تھا۔ چوتھ کا چاند ڈوب چکا تھا۔ گاؤں کے باہر ایک بانس کی کوٹھی تھی۔ سدن وہاں پہنچا تو اسے کچھ چوں چوں کی آواز سنائی دی۔ اس کا کلیجہ سن سے ہوگیا۔ لیکن فوراً ہی یاد آگیا کہ بانس ہوا سے ہل کر آپس میں رگڑ کھارہے ہیں۔ ذرا اور آگے ایک آم کا درخت تھا۔ بہت دن ہوئے اس پر سے ایک کُرمی کا لڑکا گر کر مر گیا تھا۔ سدن وہاں پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی کھڑا ہے۔اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سر میں چکّر سا آنے لگا۔ لیکن دل کو مضبوط کرکے غور سے دیکھا۔ تو کچھ نہ تھا۔ لپک کر آگے بڑھا۔ گاؤں سے باہر نکل گیا۔

گاؤں سے دو میل پر ایک پیپل کا درخت تھا۔ مشہور تھا کہ وہاں بھوتوں کا اڈّا ہے۔

سب کے سب اسی درخت پر رہتے ہیں۔ ایک کملی والا بھوت ان کا سرغنہ ہے۔ وہ مسافروں کے سامنے کالا کمبل اوڑھے، کھڑاؤں پہنے آتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کچھ مانگتا ہے۔ مسافر جوں ہی اسے کچھ دینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے وہ نظر سے غائب ہوجاتا ہے۔ معلوم نہیں اس شرارت سے اس کا کیا مقصد تھا؟ رات کو کوئی آدمی اس راستہ سے تنہا نہ آتا تھا۔ اور جو کوئی ہمّت کرکے چلا آتا۔ وہ کسی نہ کسی خرق عادت کا ذکر ضرور کرتا۔ کوئی کہتا۔ وہاں گانا ہورہاتھا۔ کوئی کہتا پنچایت بیٹھی ہوئی تھی۔ سدن کو اب صرف یہی خوف اور تھا۔ وہ پہلے سے دل کو مضبوط کیے ہوئے تھا۔ لیکن جوں جوں وہ اس مقام کے قریب آتا جاتا تھا۔ اس کی ہمّت برف کی طرح پگھلتی جاتی تھی۔ جب ایک فرلانگ باقی رہ گیا۔ تو اس کے قدم نہ اُٹھے وہ زمین پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ کہ کیا کروں؟ چاروں طرف نظر دوڑائی کسی جاندار کی آہٹ نہ ملی۔ اگر کوئی جانور بھی نظر آجاتا۔ تو اُسے کچھ ڈھارس ہوجاتی۔ آدھ گھنٹہ تک وہ کسی مسافر کی راہ دیکھتا رہا۔ مگر دیہات کا راستہ رات کو نہیں چلتا اس نے سوچا کب تک بیٹھا رہوں گا ایک بجے ریل جاتی ہے دیر ہوجائے گی۔ تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ دل کو مضبوط کرکے اُٹھا۔ اور رامائن کی چوپائیاں بلند آواز سے گاتا ہوا چلا۔ خیال کو کسی حیلہ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ مگر ایسے موقعوں پر گرمی کی مکھیوں کی طرح خیال نہیں ٹلتا۔ اُڑادیجیے پھر موجود۔ آخر وہ درخت سامنے دکھائی دینے لگا۔ سدن نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ رات زیادہ جاچکی تھی۔ تاریکی کی سیاہی کچھ کم ہوچلی تھی۔ کوئی چیز نہ نظر آئی۔ وہ اور زور سے گانے لگا۔ اس وقت اس کا ایک ایک رواں چوکنا تھا، کبھی ادھر تاکتا۔ کبھی اُدھر۔ انواع و اقسام کے مخلوق نظر آتے پر غور سے دیکھتے ہی غائب ہوجاتے تھے۔ دفعتاً اسے معلوم ہوا کہ داہنی طرف کوئی بندر بیٹھا ہوا ہے۔ کلیجہ کانپ اُٹھا لیکن ایک ہی لمحہ میں وہ بندر مٹی کا تودہ ہوگیا۔ جس وقت وہ درخت کے نیچے پہنچا اس کا گلا گھٹنے لگا۔ منہ سے آواز نہ نکلی۔ اب خیالات کو بہلانے کی ضرورت بھی نہ تھی ساری توجہ، اوسان، ہواس، ہمّت کا اجتماع ضروری تھا۔ اس کی پنڈلیاں کانپ رہی تھیں اور کلیجہ سینہ سے ٹکرا رہا تھا۔ ناگاہ اسے کوئی چیز سامنے سے دوڑتی نظر آئی! وہ اُچھل پڑا۔ غور سے دیکھا۔ کتا تھا۔ وہ سُن چکا تھا کہ بھوت کبھی کبھی کتوں کے شکل میں بھی آتے ہیں۔ ہوش اڑگئے خاموش کھڑا ہوگیا۔ گویا کسی دشمن کے وار کا منتظر ہے۔ کتا سر جھکائے کترا کر نکل گیا۔ انتہائے خوف

جرأت ہے۔ سدن نے زور سے ڈانٹا۔ "دت"! کتا دُم دبا کر بھاگا۔ سدن کئی قدم اس کے پیچھے دوڑا۔ یقین ہوگیا ۔ کتا تھا۔ بھوت ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی شعبدے کرتا۔ خوف کم ہوا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگا نہیں۔ تہی دست کو تھوڑے سے روپے بھی مل جائیں تو وہ زمین پر پَیر نہیں دھرتا۔ وہ اپنے خائف دل کو نادم کرنے کے لیے کئی منٹ تک پیپل کے نیچے کھڑا رہا۔ اتنا ہی نہیں۔ اس نے پیپل کا طواف کیا۔ اور اسے دونوں ہاتھوں سے ہلانے کی کوشش کی۔ یہ انوکھی جرأت تھی! اوپر پتھر نیچے پانی۔ ایک ذرا سی آواز، ذرا سی حرکت، اس کی زندگی کا فیصلہ کرسکتی تھی۔

اس آزمائش سے نکل کر سدن، غرور سے سر اُٹھائے اسٹیشن کی طرف چلا۔

(۱۴)

سُمن کے چلے جانے کے بعد پدم سنگھ بڑی تشویش میں پڑے۔ میں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ نہ معلوم وہ غریب کہاں گئی۔ اپنے گھر چلی گئی ہو۔ تو پوچھنا ہی کیا مگر اس کی اُمید نہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ کہیں قلی ڈپو والوں کے جال میں پھنس گئی تو چھوٹنا مشکل ہے۔ یہ شیطان ایسے ہی موقعوں پر تیر مارتے ہیں۔ کہیں ان سے بھی بدتر ہاتھوں میں نہ پڑجائے۔ مرد کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ تو وہ چوری کرتاہے، نامرد کو کوئی سہارا نہیں ہوتا تو وہ بھیک مانگتا ہے، مگر عورت کو کوئی سہارا نہیں ہوتا تو وہ بے شرم ہوجاتی ہے۔ جوان اور حسین عورت کا گھر سے نکلنا منہ سے بات کا نکلنا ہے۔ مجھ سے نادانی ہوئی اب اس عزّت پروری سے کام نہ چلے گا۔ وہ ڈوب رہی ہے بچانا چاہیے۔ لوگ بدگمان ہونگے کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ گجا دھر کے گھر جانے کے لیے کپڑے پہننے لگے۔ تیار ہوکر گھر سے نکلے۔ مگر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی مجھے اس کے دروازہ پر دیکھ نہ لے۔ معلوم نہیں گجا دھر اپنے دل میں کیا سمجھے؟ کہیں اُلجھ پڑا تو مشکل ہوگی۔ گھر سے باہر نکل چکے تھے۔ لوٹ پڑے۔ کپڑے اُتار دیے۔ ہمارے غیر معمولی فعل فیصلوں سے نہیں ہواکرتے۔ ہم آخروقت تک شش و پنج میں رہتے ہیں۔ جب دس بجے وہ کھانا کھانے گئے تو سوبھدرا نے تیوریاں بدل کر کہا۔ "یہ آج سویرے سویرے سمن کے پیچھے کیوں پڑگئے۔ نکالنا ہی تھا تو ایک ڈھنگ سے نکالتے۔ اس بڈھے جیتن کو بھیج دیا۔ اس نے اُلٹی سیدھی جو کچھ جی میں آیا بکا۔ بے چاری نے زبان تک

نہ ہلائی۔ چُپ چاپ اُٹھی اور چلی گئی۔ مارے شرم کے میں نے سر نہیں اُٹھایا۔ مجھ سے آکر کہتے۔ میں اسے سمجھا دیتی۔ کوئی گنوارن تو تھی نہیں کوئی انتظام کرکے چلی جاتی۔ یہ سب تو کچھ نہ ہوا۔ بس نادرشاہی حکم دے دیا۔ بدنامی کا اتنا ڈر؟ وہ اگر لوٹ کر اپنے گھر نہ گئی۔ تو کیا کچھ کم بدنامی ہوگی کون جانے کہاں جائے گی۔ اس کا الزام کس پر ہوگا؟

سوبھدرا بھری بیٹھی تھی۔ اُبل پڑی۔ پدم سنگھ اقبالی مجرم کی طرح سر جھکائے سنتے رہے جو خیالات ان کے دل میں تھے وہ سوبھدرا کی زبان پر ندامت کے مارے سر نہ اُٹھایا۔ کھانا کھایا اور کچہری چلے گئے۔ آج جلسہ کے بعد تیسرا دن تھا۔ پہلے شرماجی کو کچہری کے لوگ ایک بااصول شخص سمجھتے تھے اور ان کی عزّت کرتے تھے۔ مگر دو ایک دن سے یہ کیفیت تھی کہ جب دوسرے وکلا کو فرصت ہوتی تو وہ شرماجی کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ اور ان سے رازونیاز کی باتیں کرنے لگتے۔ شرماجی! آج سُنا ہے لکھنؤ سے کوئی بائی جی آئی ہیں۔ ان کے گانے کی بڑی دھوم ہے۔ ان کا مجرا نہ کرایے گا؟ "اجی شرماجی! کچھ سنا آپ نے، آپ کی بھولی بائی پر سیٹھ چمن لال بے طرح ریجھے ہوئے ہیں!" کوئی کہتا "بھائی صاحب کل گنگا اشنان ہے۔ گھاٹ پر بڑی بہار ہوگی۔ کیوں نہ ایک پارٹی دے دیجیے۔ سرسوتی کو بلا لیجیے ۔ گانا تو بہت معقول نہیں ہے مگر حُسن میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔" شرماجی کو ان چرچوں سے کراہیت ہوتی تھی۔ وہ سوچتے کیا میں بازارِ حُسن کا دلال ہوں۔ کہ لوگ مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کچہری کے عمال کے برتاؤ میں بھی شرماجی کو ایک خاص تغیر نظر آتا تھا۔ انھیں جب فرصت ملتی سگریٹ پیتے ہوئے آکر شرماجی کے پاس بیٹھ جاتے۔ اور اسی قسم کے تذکرے چھیڑ دیتے۔ یہاں تک شرماجی تنگ آکر وہاں سے اُٹھ جاتے۔ اور ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے گھنٹوں کسی درخت کے نیچے چھپے بیٹھے رہتے۔ وہ اس منحوس گھڑی کو کوستے جب یہ محفل آراستہ کی تھی۔ آج بھی وہ کچہری میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرسکے۔ وہ نفرت انگیز تذکروں سے اُکتاکر دو ہی بجے مکان چلے آئے۔ جونہی دروازے پر پہنچے۔ سدن نے آکر ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ شرماجی نے متعجب ہوکر پوچھا۔ "ارے سدن ۔ تم کب آئے؟"

سدن۔ اسی گاڑی سے آیا ہوں۔

شرما۔ گھر پر تو سب خیر و عافیت ہے؟

سدن۔ جی ہاں سب لوگ اچھی طرح ہیں۔
شرما۔ کچھ کھانا کھایا؟
سدن۔ جی ہاں۔
شرما۔ میں تو اب کی ہولی میں نہ جاسکا۔ بھابی کچھ کہتی تھیں۔
سدن۔ دو دن تک لوگ آپ کا انتظار کرتے رہے۔ میرا بھی جی نہ لگتا تھا اُٹھ کر چلا آیا۔
شرما۔ تو کیا گھر پر پوچھا نہیں؟
سدن۔ پوچھا کیوں نہیں۔ پر آپ تو ان کے مزاج سے واقف ہیں۔ اماں راضی نہ ہوئیں۔
شرما۔ تب تو وہ لوگ گھبرا رہے ہوں گے۔ ایسا ہی تھا تو کسی کو ساتھ لے لیتے۔ خیر اچھا ہوا۔ میرا جی تمھیں دیکھنے کو لگا ہوا تھا۔ اب آگئے ہو۔ تو کسی مدرسہ میں نام لکھا لو۔
سدن۔ جی ہاں اسی نیت سے تو آیا ہوں۔

شرما جی نے اپنے بھائی کے نام تار دے دیا۔ "گھبرایے مت سدن یہاں آگیا ہے اس کا نام کسی مدرسے میں لکھا دیاجائے گا"۔

تار دے کر پھر سدن سے گاؤں گھر کی بات چیت شروع کی۔ اور شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کوئی کرمی، کمہار، لوہار، چمار، ایسا نہ بچا، جس کے متعلق شرماجی نے کچھ دریافت نہ کیا ہو۔ دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ اُنس ہوتا ہے۔ جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے سب چھوٹے بڑے آدمی اس رشتے میں بندھے رہتے ہیں۔

شام کو شرماجی سدن کے ساتھ سیر کو نکلے۔ لیکن بنی باغ یا کوئنس پارک کی طرف نہ گئے۔ دُرگا کنڈ اور کانھ جی کی دھرم شالے کی طرف چلے۔ مگر ان کا دل فکر سے خالی نہ تھا۔ آنکھیں اِدھر اُدھر سمن کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ دل میں فیصلہ کرلیاتھا کہ اب کی وہ مل جائے تو ہرگز نہ جانے دوں۔ دُنیا چاہے جتنا بدنام کرے۔ یہی نہ ہوگا۔ اس کا شوہر دعویٰ کرے گا۔ سمن کی خواہش ہوگی تو چلی جائے گی۔ چلوں گجا دھر کے پاس۔ ممکن ہے وہ گھر آگئی ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھر لوٹے۔ کئی مؤکل ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے کاغذات دیکھے مگر طبیعت دوسری طرف مائل تھی۔ جونہی ان سے نجات ملی۔ وہ گجا دھر کے گھر چلے۔ لیکن اِدھر اُدھر تاکتے جاتے تھے۔ کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ یا ساتھ نہ آتا ہو۔ اس انداز سے جارہے تھے۔ گویا ان کی کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ گجا دھر کے دروازے پر پہنچے

وہ ابھی دکان سے لوٹا تھا۔ آج اسے دوپہر کو خبر ملی تھی کہ شرما جی نے سمن کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ تاہم اسے شک تھا کہ اس حیلہ سے کہیں چھپا نہ دیا ہو۔ لیکن انھیں سامنے دیکھ کر وہ ان کی تعظیم کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ یہ وہ خراج ہے۔ جو رُتبہ اور اعزاز کا حق ہے۔ چارپائی سے اُٹھ کر نمسکار کیا۔ شرما جی رُک گئے۔ اور بے غرضانہ انداز سے بولے۔"کیوں پانڈے جی۔ مہراجن گھر آگئیں نہ؟"

گجا دھر کا شبہہ کچھ دُور ہوا۔ بولا۔"جی نہیں۔ جب سے آپ کے گھر سے گئی تب سے کچھ پتہ نہیں"۔

شرما۔ آپ نے کچھ ادھر تلاش نہیں کی۔ آخر یہ بات کیا ہوئی کہ آپ ان سے اتنے ناراض ہوگئے۔

گجا دھر۔ جناب میری ناراضگی کا تو ایک حیلہ تھا۔ وہ خود ہی نکلنا چاہتی تھی۔ پڑوس کی کٹنیوں نے اس کی نیت خراب کردی تھی۔ ادھر مہینوں سے اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ہولی کے دن ایک بجے رات کو گھر آئی۔ مجھے کچھ شک ہوا۔ سخت سُست کہا۔ بس گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

شرماجی۔ لیکن آپ اُسے گھر لانا چاہتے تو میرے یہاں سے لاسکتے تھے۔ اس کے بدلہ آپ میرے ہی پیچھے پڑگئے۔ تو میں اپنی بدنامی کیوں کرواتا۔ آج سویرے ہی میں نے اسے گھر سے علیٰحدہ کردیا۔ بتاؤ اور کیا کرتا؟ اپنی عزّت کی فکر تو سب کو ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں میرا اتنا ہی قصور ہے۔ کہ وہ ہولی کے دن جلسہ میں میرے یہاں رہی۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس جلسہ کا یہ نتیجہ ہوگا۔ تو یا تو جلسہ ہی نہ کرتا۔ یا اسے اپنے گھر آنے ہی نہ دیتا۔ اتنی خطا کے لیے آپ نے سارے شہر میں مجھے رسوا کردیا۔

گجا دھر رونے لگا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ میرے دل میں جو شکوک تھے وہ بیجا تھے روتے ہوئے بولا۔"جناب اس قصور کی آپ مجھے جو سزا چاہیں دیں میں جاہل گنوار ٹھہرا۔ جس نے جو بات سمجھادی مان گیا۔ یہ جو بینک گھر کے بابو ہیں ۔ بھلا سا نام ہے...... بٹھل داس۔ میں انھیں کے چکمہ میں آگیا۔ ہولی کے ایک دن پہلے وہ ہمارے مالکوں کی دکان پر آئے تھے۔ کچھ کپڑے لیے اور مجھے علیٰحدہ لے جاکر آپ کے بارے میں...... اب کیا کہوں۔ ان کی باتیں سُن کر مجھے طیش آگیا میں انھیں شریف سمجھتا تھا۔ سارے شہر میں دوسروں

کے ساتھ بھلائی کرنے کی ہانک لگاتے پھرتے تھے۔ ایسا دھرماتما آدمی کوئی بات کہے۔ تو اس پر اعتبار آہی جاتا ہے۔ معلوم نہیں انھیں آپ سے کیا دشمنی تھی۔ اور میرا تو اُنھوں نے گھر ہی چوپٹ کردیا۔

شرماجی کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا کسی نے لوہے کی سلاخ لال کرکے ان کے سینہ میں ڈال دی۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ سامنے سے وہ تلوار کا وار برداشت کرسکتے تھے۔ مگر پشت پر سوئی کی نوک بھی اُن کو قوتِ برداشت سے باہر تھی۔ بٹھل داس ان کے رازدار، ساتھ کے پڑھے ہوئے دوست تھے۔ شرماجی دل میں ان کی عزّت کرتے تھے۔ اکثر آپس میں اختلاف ہونے پر بھی وہ ان کے نیک ارادوں کی قدر کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ارادے اکثر دائرہ عمل سے خارج ہوتے تھے ایسا شخص عمداً ہرزہ سرائیاں کرنے لگے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہوسکتے ہیں کہ وہ نیکی کی طرف منفی ہے۔ گر بدی کی طرف عملی اور مثبت۔ شرماجی سمجھ گئے کہ ہولی کے جلسہ کی تجویز سے ناراض ہوکر بٹھل داس نے یہ شگوفہ چھوڑے ہیں محض میری مذمت کرنے کے لیے۔ محض دُنیا کی نظروں میں گرانے کے لیے مجھ پر یہ بہتان تراشا ہے۔ غصہ سے بیتاب ہوکر بولے۔ ”تم اُن کے منہ پر کہوگے؟“

گجا دھر۔ ہاں سانچ کو کیا آنچ۔ چلیے ابھی میں اُن کے سامنے کہہ دوں۔ مجال ہے کہ انکار کرجائیں۔

شرماجی اس جذبہ میں چلنے پر آمادہ ہوئے لیکن اتنی ہی دیر میں طوفان کا زور کچھ کم ہوچلا تھا۔ سنبھل گئے سوچا کہ اس وقت وہاں جانے سے معاملہ طول کھینچے گا۔ گجا دھر سے بولے۔ ”اچھی بات ہے۔ جب بلاؤں تو چلے آنا۔ مگر غافل مت بیٹھو۔ زمانہ خراب ہے مہراجن کا سراغ لگاتے رہو۔ جو کچھ خرچ کی ضرورت ہو وہ مجھ سے لو۔

یہ کہہ کر شرماجی گھر چلے گئے۔ بٹھل داس کی چھپی ہوئی تلوار کے وار نے اُنھیں نیم جان کردیا تھا۔ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ بٹھل داس محض کینہ پروری کے باعث یہ فتنہ انگیزی کی ہے یہ بات ان کے خیال میں بھی نہ آئی کہ ممکن ہے اُنھوں نے جو کچھ کہا ہو نیک نیتی سے کہا ہو۔ اور اسے باور کرتے ہوں۔

دوسرے دن شرماجی سدن کو ساتھ لے کر کسی مدرسہ میں داخل کرانے چلے۔ مگر جہاں گئے وہیں صاف جواب ملا۔ ”گنجائش نہیں ہے“۔ شہر میں بارہ مدرسے تھے۔ لیکن سدن

کے لیے کہیں جگہ نہ تھی۔ آخر مجبور ہوکر شرماجی نے فیصلہ کیا کہ میں خود ہی پڑھایا کروں گا۔ صبح کو تو موکلوں کے مارے فرصت نہ ملتی۔ کچہری سے آکر پڑھاتے۔ لیکن ایک ہی ہفتہ میں ہمّت ہار بیٹھے۔ کہاں کچہری سے آکر اخبار دیکھتے یا ہارمونیم بجاتے تھے۔ کہاں اب ایک بوڑھے طوطے کو مارنا پڑتا تھا۔ باربار جھنجلاتے انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ سدن انتہا درجہ کا کودن اور غبی ہے۔ اگر وہ کوئی پڑھا ہوا لفظ پوچھ بیٹھتا۔ تو شرماجی جھلّا جاتے وہ مقام اُلٹ پلٹ کر دکھاتے۔ جہاں پہلے وہ لفظ آیا تھا۔ پھر سوالات کرتے اور سدن ہی سے اس لفظ کے معنی نکلواتے اس کوشش میں کام تو کم ہوتا تھا۔ اور سر مغزن بہت۔ سدن بھی ان کے سامنے کتاب کھولتے ہوئے ڈرتا۔ وہ پچھتاتا کہ کہاں سے کہاں یہاں آیا اس سے تو اپنا گاؤں ہی اچّھا تھا۔ چار سطریں تو پڑھائیں گے لیکن گھنٹوں بگڑیں گے سبق ختم ہونے کے بعد شرماجی کی طبعیت مضمحل ہوجاتی ہے۔ سیر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ انھیں معلوم ہوگیا کہ اس کام کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے۔

محلہ میں ایک ماسٹر صاحب رہتے تھے۔ وہ بیس روپیہ ماہوار پر راضی ہوگئے۔ اب یہ فکر ہوئی یہ روپے آئیں کہاں سے؟ شرماجی فیشن ایبل آدمی تھے۔ خرچ کا پلہ ہمیشہ دبا ہی رہتا تھا۔ ہرچند فیشن کا بوجھ اکھرتا تھا پر کندھا نہ ڈالتے تھے بہت دیر تک بیٹھے سوچتے رہے مگر عقل نے کچھ کام نہ کیا۔ فیشن وہ شاعرانہ خیال ہے جو خون دل پی کر پلتا ہے۔ مگر حاصل بجز واہ واہ کے اور کچھ بھی نہیں۔ آخر سوبھدرا کے پاس جاکر بولے۔"ماسٹر صاحب بیس روپے پر راضی ہیں۔"

سوبھدرا۔ تو کیا ماسٹر ہی نہ ملتے تھے۔ ماسٹر ایک نہیں سو ہیں اور کوڑیوں کے مول روپے کہاں ہیں؟

شرما۔ روپے بھی ایشور کہیں نہ کہیں سے دیں گے۔

سوبھدرا۔ میں تو کئی سال سے دیکھ رہی ہوں۔ ایشور نے کوئی خاص عنایت نہیں کی۔ بس اِتنا ہی دیتے ہیں۔ کہ پیٹ کی روٹیاں چل جائیں۔ اب کیا کوئی دوسرے ہوجائیں گے۔

شرما۔ نہیں، یقین مانو، نیت میں برکت ہوتی ہے۔

سوبھدرا۔ نیت کی برکت کے ساتھ قرض میں بھی اکثر برکت ہوا کرتی۔

شرما۔ تم تو طعنے دینے لگیں۔ کوئی صورت نکالو۔

سوبھدرا۔ مجھے جو کچھ دیا کرتے ہو مت دینا بس۔

شرما۔ چڑھ گئیں؟

سوبھدرا۔ چڑھنے کی بات ہی ہے۔ آمدنی اور خرچ کا حساب تم سے چھپا نہیں۔ میں اور کون سی بچت نکال دوں گی۔ دودھ گھی کی آپ کے یہاں ندی نہیں بہتی۔ مٹھائی مربے میں کبھی پھپھوند نہیں لگی۔ کہار کے بغیر کام چلنے ہی کا نہیں۔ مہراجن کا ہونا ضروری ہے اور کون سا خرچ توڑنے کو کہتے ہو؟

پدم سنگھ۔ (خفیف ہوکر) دودھ ہی بند کردو۔

سوبھدرا۔ ہاں بند کردو مگر تم نہ پیؤ گے۔ سدن کے لیے تو لینا ہی ہوگا۔

شرما جی پھر دریائے فکر میں ڈوبے۔ پان تمباکو کا خرچ دس روپے ماہوار سے کم نہ تھا۔ اور بھی کئی ایک چھوٹی چھوٹی مدوں سے کچھ بچت ہوسکتی تھی۔ مگر ان کا ذکر کرنا سوبھدرا سے راڑ مول لینا تھا۔ سوبھدرا کی باتوں سے انھیں صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ اس معاملہ میں اِسے میرے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ دل میں مردانے کے مصارف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کچھ اُمید نظر آئی۔ بولے "کیوں روشنی اور پنکھے کے خرچ میں تو کچھ کفایت ہوسکتی ہے؟"

سوبھدرا۔ ہاں ضرور ہوسکتی ہے۔ روشنی کی ضرورت کیا ہے۔ سرِ شام ہی سے بستر پر پڑرہے۔ اگر کوئی ملنے ملانے آئے گا۔ خود چیخ چلاکر چلاجائے گا۔ یا کہیں سیر کرنے نکل گئے۔ اور نو دس بجے لوٹ کر آئے۔ اور پنکھا تو ہاتھ سے بھی جھلاجاسکتاہے۔ کیا جب بجلی نہیں تھی۔ تو لوگ گرمی کے مارے باولے ہوجاتے تھے؟

شرما نے اس وقت جھینپنے کی قسم کھالی تھی۔ بولے۔"گھوڑے کے راتب میں کچھ کمی کردوں؟"

سوبھدرا۔ ہاں یہ دُور کی سوجھی۔ گھوڑے کو راتب کی ضرورت ہی کیا ہے گھاس کافی ہے۔ یہی نہ ہوگا۔ کولہے پر ہڈیاں نکل آئیں گی۔ کسی طرح مرتا جیتا گرتا پڑتا کچہری تک لے ہی جائے گا۔ یہ تو کوئی نہ کہے گا۔ کہ وکیل صاحب کے پاس سواری نہیں ہے۔

شرماجی نے اس ظریفانہ چوٹ کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بولے "لڑکیوں کے پاٹ شالا میں دو روپیہ ماہوار چندہ دیتاہوں۔ دو روپیہ ماہوار کلب کا چندہ ہے۔ ایک روپیہ یتیم خانہ کو دیتا ہوں۔ یہ سب چندے بند کردوں تو کیسا ہو؟"

سوبھدرا۔ بہت اچھا ہوگا۔ دنیا کا قاعدہ ہے۔ پہلے اپنے گھر میں چراغ جلاکر مندر میں جلاتے ہیں۔

شرماجی نے اب کی بار بھی تحمل سے کام لیا۔ بولے۔"اس طرح کوئی پندرہ روپے ماہوار تو میں دے دوں گا۔ باقی پانچ روپے کا بار تمھارے اوپر ہے۔ میں حساب کتاب نہیں پوچھتا کسی طرح یہ رقم پوری کردو۔

سوبھدرا۔ ہاں ہوجائے گا۔ کچھ مشکل نہیں ہے۔ کل سے کھانا ایک ہی وقت پکے۔ دونوں وقت پکنے کی کیا ضرورت ہے؟ دنیا میں کروڑوں آدمی ہیں جو ایک ہی بار کھاتے ہیں۔ اور بیمار یا کمزور نہیں ہوتے۔

شرماجی کو اب یا رائے ضبط نہ رہا۔ اتنی دیر تک اُنھوں نے اس قانونی متانت اور حلم سے کام لیا تھا۔ جو مخالف شہادتوں کے حیلہ بازیوں کی پرواہ نہیں کرتی خانہ جنگیوں سے ان کی روح فنا ہوتی تھی۔ اس میدان میں وہ ہمیشہ قوت تمیز سے کام لیا کرتے تھے۔ پر یہ وار سہا نہ گیا۔ بولے"تو تم کیا چاہتی ہو۔ کہ سدن کے لیے ماسٹر نہ رکھا جائے۔اور وہ یوں اپنی عمر خراب کرے؟ بجائے اس کے کہ میرے ساتھ ہمدردی کرو۔ اُلٹے اور چھینٹے دے رہی ہو۔ سدن میرے اسی بھائی کا لڑکا ہے۔ جو اپنے سر پر آٹے دال کی پُٹلی لادکر مجھے اسکول میں داخل کرانے آیاتھا مجھے وہ دن بھولے نہیں ہیں۔ ان کی اس محبت کو یاد کرتا ہوں۔ تو جی چاہتا ہے کہ ان کے پیروں پر گر کر گھنٹوں روؤں۔ تمھیں اب اپنے روشنی اور پنکھے کے خرچ میں، پان تمباکو کے خرچ میں، گھوڑے سائیس کے خرچ میں کفایت کرنا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ مگر بھیا مجھے وارنش جوتے پہناکر خود ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ میں ریشمی کپڑے پہنتا تھا۔ اور وہ پھٹے کرتوں پر بسر کرتے تھے۔ ان کی نیکیوں اور احسانوں کا اِتنا بھاری بوجھ میری گردن پر ہے کہ میں اس زندگی میں اس سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ سدن کے لیے میں ہر ایک تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اس کے لیے مجھے پیدل کچہری جانا پڑے ۔ فاقہ کرنا پڑے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے جوتے صاف کرنے پڑیں۔ تب بھی مجھے انکار نہ ہوگا۔ ورنہ مجھ جیسا احسان فراموش اور بے وفا آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔

مارے ندامت کے سوبھدرا کا چہرہ کھملا گیا۔ حالانکہ شرماجی نے یہ باتیں سچّے دل سے کہیں تھیں۔ مگر اس نے یہی سمجھا۔ کہ ان کا مقصود مجھے شرمندہ کرنا ہے اس سے زیادہ

ندامت اسے یہ ہوئی کہ شرماجی پر اس کے دل کی کیفیت روشن ہوگئی۔ فی الواقع اسے سدن کا یہاں آنا ناگوار گزرتا تھا۔ اور وہ اس کے لیے اِتنا صرف کثیر برداشت کرنا حماقت خیال کرتی تھی۔ سر جھکاکر بولی" تو میں نے یہ کب کہا کہ سدن کے لیے ماسٹر نہ رکھاجائے۔ جو کام کرنا ہے اسے کرڈالیے، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ جب آپ کے بھائی صاحب نے آپ کے لیے اتنی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ تو مناسب یہی ہے کہ آپ بھی سدن کے لیے کوئی بات اُٹھا نہ رکھیں۔ مجھ سے جو کچھ کرنے کو کہیے حاضر ہوں۔ آپ نے اب تک کبھی اس معاملہ پر زور نہیں دیا۔ اس لیے مجھے خیال ہوا کہ یہ کوئی ضروری خرچ نہیں ہے۔ آپ کو پہلے ہی دن سے ماسٹر کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔ اتنے آگے پیچھے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تک تو وہ کچھ نہ کچھ پڑھ ہی چکا ہوتا۔ اتنی عمر گزرنے پر جب اُسے پڑھانے کا ارادہ کیا ہے۔ تو اس کا ایک دن بھی اکارت نہ ہونا چاہیے۔

سوبھدرا نے اسی وقت اپنی ندامت کا بدلہ لے لیا۔ شرماجی کو اپنی غلطی تسلیم کرنی پڑی معلوم ہوا کہ میں اتنا احسان شناس نہیں ہوں۔ جتنا مجھے دعویٰ ہے اگر میرا لڑکا ہوتا۔ تو میں نے اس قدر تامل ہرگز نہ کیا ہوتا۔ اصل میں احسان فراموشی کی ابتدا میں نے کی ہے۔ اور سوبھدرا نے میرا عندیہ دیکھ کر یہ مخالفانہ روش اختیار کی تھی۔ کچھ جواب نہ دیا۔

سوبھدرا کو اپنے جواب پر افسوس ہوا۔ اس نے ایک پان بناکر شرماجی کو دیا۔ گویا اعلانِ صلح تھا۔ شرماجی نے پان لے لیا۔ صلح نامہ منظور ہوگیا۔

جب وہ چلنے لگے۔ تو سوبھدرا نے پوچھا"کچھ سُمن کا پتہ چلا؟"

شرماجی۔ کچھ بھی نہیں ۔معلوم نہیں کہاں غائب ہوگئی۔ گجا دھر بھی نظر نہیں آیا۔ سنتا ہوں گھر بار چھوڑکر کسی طرف نکل گیا ہے۔

دوسرے دن سے ماسٹر صاحب سدن کو پڑھانے لگے وہ نو بجے پڑھاکر چلے جاتے۔ تو سدن کھانا کھاکر سوجاتا۔ کوئی دوست نہ ساتھی۔ نہ کوئی کھیل و تفریح کیسے جی لگے؟ تنہائی میں اس کی طبیعت گھرایا کرتی۔ ہاں صبح کو تھوڑی سی کثرت کرلیاکرتا۔ اس کا اُسے شوق تھا۔ اپنے گاؤں میں اس نے ایک چھوٹا سا اکھاڑہ بنوا رکھاتھا۔ یہاں اکھاڑہ کہاں؟ کمرہ ہی میں محنت کرلیتا۔ شام کو شرماجی اس کے لیے فٹن تیار کرادیتے تب سدن اپنے سوٹ پہن کر شان کے ساتھ سیر کو نکلتا۔ شرماجی خود چہل قدمی کے عادی تھے۔ وہ پارک یا چھاؤنی کی

طرف جایا کرتے۔ مگر سدن اس طرف نہ جاتا۔ ہواخوری میں جو ایک فلسفیانہ مسرت ہوتی ہے۔ اس کا اسے مذاق کہاں؟ صاف ہَوا کی فرحت بخش تازگی فضا اور سبزہ کی خیال انگیز محویت۔ اور منظر کی کیفیت خیز خموشی کا احساس اسے نہیں تھا۔ ان کیفیات کا لطف اُٹھانے کے لیے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے۔ سدن کو یہ نعمت کہاں نصیب تھی؟ یہ اس کا عنفوان تھا۔ جب خودنمائی کا جوش اُمنگ پر رہتا ہے وہ نہایت شکیل، بلند قامت نوجوان تھا۔ دیہات میں رہا نہ پڑھنا نہ لکھنا نہ ماسٹر کا خوف نہ امتحان کی فکر۔ سیروں دودھ پیتا تھا گھی کے لوندے اُٹھاکر کھاجاتا۔ اس پر ورزش کا عادی۔ جسم سڈول نکل آیاتھا۔ سینہ فراخ، گردن تنی ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بدن میں انگور بھری ہوئی ہے۔ اس کے چہرہ پر وہ متانت اور ملاحت اور نفاست نہ تھی جو تعلیم اور تہذیب سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا بشرہ مردانہ، سخت اور تند تھا۔ باغ کا قلمی پودا نہیں جنگل کا تناور درخت تھا آنکھوں میں ایک دلفریب وارفتگی تھی اور چال میں ایک پُر غرور مستانہ پن۔ مگر شباب بخل نہیں ہے جو اپنی دولت کو چھپاتا یہ وہ شوریدگی ہے جو فاقوں میں مست رہتی ہے۔ پارک یا میدان کی تنہائی میں اس پر کسی کی نگاہ پڑتی؟ کون اس کی رعنائیوں کی داد دیتا۔ اس لیے وہ کبھی دال منڈی کی طرف جاتا۔ کبھی چوک کی طرف جاتا۔ اس کے آن بان اور مردانہ حُسن پر ہر کس وناکس کی پُرداد آنکھیں اُٹھ جاتی تھیں۔ نوجوان اسے رشک سے دیکھتے۔ وکیل بوڑھے پسندیدہ نگاہوں سے۔ اور دل میں افسوس کرتے۔ کہ یہ سجیلا جوان تھوڑے ہی دنوں میں اس صحرائے آتشیں کی لولپٹ سے جھلس جائے گا۔ مگر دورویہ دکانوں کے سجے ہوئے بالاخانوں پرتو اُسے دیکھتے ہی ہلچل سی مچ جاتی تھی گلرخان شریں ادا آآکر چھجّوں پر کھڑی ہوجائیں۔ صدہا چشمہائے ناز، پیغام دعوت سے لبریز، اس کی طرف اُٹھتیں۔ شوخی اور شرارت کے ہنگامے برپا ہوجاتے، دل کشی اور دلبری کی چوگان بازی ہونے لگتی۔ دیکھیں یہ بہکا ہوا کبوتر کس چھتری پر اُترتا ہے۔ یہ سونے کی چڑیا کس دام میں پھنستی ہے۔ ان حسینوں میں کتنی ہی حُسن پرست تھیں۔ جو سدن کے لطفِ صحبت کے لیے بیتاب ہوجاتیں۔ اس کا انداز کہے دیتا تھا۔ کہ وہ زخم کے لیے سینہ کھولے بیٹھا ہے اس کی آشفتگی تمنائے زخم کی شاہد تھی۔ یہ اور کشش تھی۔ جوان لذّت آشنا دلوں کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔

سدن میں وہ ثقاہت تو تھی ہی نہیں جو پاکیزگی کی ضامن ہوتی ہے۔ اس میں وہ ضبط

اور نمائشی متانت بھی نہ تھی۔ جو خود داری کی برکت ہے اور جو نگاہوں کو اوپر نہیں اُٹھنے دیتی طبیعت بھی ابھی تصنع کے خراد پر نہیں چڑھی تھی اس کی فٹن بازار میں بہت آہستہ آہستہ چلتی ۔ سدن کی آنکھیں بالاخانوں ہی کی طرف لگی رہتیں۔ شباب پر ہم اپنی کمزوریوں پر فخر کرتے ہیں۔ بعد شباب اپنے محاسن کے اظہار پر۔ سدن اپنے کو رسیا، عاشق تن، دکھانا چاہتا تھا۔ عشق سے زیادہ عشق کی بدنامی کا طالب تھا۔ اس وقت اگر اس کا کوئی ہمراز دوست ہوتا تو وہ ان ناکردہ گناہوں کی ایک طویل داستان بیان کرتا۔ اگر کوئی اسے متہم کرتا تو وہ نادم ہونے کے بجائے اس پر ناز کرتا۔ اس میں ابھی تک انتخاب کی صلاحیت نہ تھی۔ اس بازار کی ساری جنسیں اُسے انمول نظر آتیں۔ اس صلائے عام کے بھی پیالے لطیف معلوم ہوتے۔ پروانے کو گیس، بجلی اور مٹی کے تیل کی کیا تمیز! آخر اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ دل ہمیشہ بازار کی طرف لگا رہتا وہی نظارے آنکھوں میں پھرا کرتے۔ حسینوں کی شوخیاں اور چتونیں دل کو گدگدایا کرتیں۔ ان کے تبسم اور انداز کی یاد میں محو رہتا۔ رات کو یہی کیفیتیں خواب میں دیکھتا۔ ماسٹر صاحب کا آنا اسے سخت ناگوار گزرتا جب وہ چلے جاتے تو اس کے سر سے ایک بوجھ ٹل جاتا۔ باقی سارے دن وہ کبھی آئینہ کے سامنے بیٹھتا۔ کبھی اپنے سوٹ صاف کرتا۔ اس طرح دن کاٹنے کے بعد جوں ہی شام ہوتی۔ وہ بن ٹھن کر چوک یا دال منڈی کی طرف چل دیتا۔ رفتہ رفتہ اس روزانہ نظربازیوں نے اُسے کچھ دلیر بنادیا۔ احساسات عمل کی جانب مائل ہوئے۔ مگر فٹن پر دو آدمی منکر نکیر کی طرح اس کے سر پر سوار رہتے تھے۔ اس لیے وہ اس باغ کے پھولوں میں ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اسے فکر ہوئی کہ کسی طرح ان سے گلا چھڑانا چاہیے۔ سوچتے سوچتے آخر اُسے ایک ترکیب نظر آئی۔ ایک دن اس نے شرماجی سے کہا۔ ”چچا صاحب! مجھے ایک اچھا سا گھوڑا لے دیجیے۔ فٹن پر اپاہجوں کی طرح بیٹھے ہوئے کچھ لطف نہیں آتا۔ سواری سے ورزش بھی ہوجائے گی۔ اور مجھے سوار ہونا بھی آجائے گا۔

جس دن سے سمن گئی تھی۔ شرماجی کچھ ملول رہا کرتے تھے۔ مؤکل شکایت کرتے کہ آج کل انھیں نہ جانے کیا ہوگیاہے۔ بات بات پر جھنجلا جاتے ہیں۔ ہماری باتیں ہی نہ سنیں گے، تو بحث کیا کریں گے؟ جب ہم نے محنتانہ دینا ہے تو کیا یہی ایک وکیل ہیں۔ گلی گلی تو مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس وجہ سے شرماجی کی رجوعات روزبروز کم ہوتی جاتی

تھیں۔ آمدنی کہ یہ روزافزوں کی طبیعت کو اور بھی بدمزاہ رکھتی تھی۔ یہ تجویز سُن کر اندازِ تفکّر سے بولے۔"اگر اسی گھوڑے پر زین سواری کرو تو کیسا ہو؟ دوچار دن میں نکل جائے گا۔
سدن۔ جی نہیں بہت لاغر ہے۔ سواری میں نہ ٹھہرے گا۔ کوئی چال بھی نہیں نہ قدم نہ سرپٹ کچہری سے تھکاماندہ آئے گا تو کیا چلے گا۔
شرما۔ اچھا دیکھو تلاش کروں گا۔ کہیں کوئی جانور مل جائے گا تو لے لونگا۔

شرماجی نے تو خوبصورتی سے بات ٹالنی چاہی تھی۔ معمولی گھوڑا بھی ڈھائی تین سو سے کم میں نہ ملتا۔ اس پر کم سے کم پچیس روپیہ ماہوار کا صرفہ اس کی یہاں مطلق گنجائش نہ تھی۔ مگر سدن کب ماننے والا۔ روز ان سے تقاضا کرتا۔ یہاں تک کہ دن میں کئی بار تقاضے کی نوبت پہنچی۔ شرماجی اس کی صورت دیکھتے ہی سوکھ جاتے تھے۔ اگر وہ اس سے اپنی مالی پریشانیاں صاف صاف بیان کردیتے تو یقیناً سدن خاموش ہوجاتا۔ مگر اپنی تفکرات کی رام کہانی سناکر اسے فکر میں ڈالنا انھیں منظور نہ تھا۔ سدن نے اپنے دونوں سائیسوں سے کہہ رکھا تھا۔ کہیں گھوڑا بکاؤ ہو تو ہم سے کہنا۔ سائیسوں نے دلالی کی طمع سے مستعد ہوکر تلاش کی۔ آخر ایک گھوڑا مل گیا۔ ایک صاحب ڈگبی نام کے فوجی افسر تھے۔ وہ وطن جارہے تھے۔ ان کا گھوڑا بکنے والا تھا۔ سدن خود گیا۔ گھوڑے کو دیکھ آیا۔ اس پر سوار ہوا۔ چال دیکھی عاشق ہوگیا۔ شرماجی سے آکر کہا۔"چلیے گھوڑا دیکھ لیجیے۔ میں نے تو دیکھا۔ مجھے بہت پسند ہے۔ بڑا مہذب خوش رفتار" شرماجی کو اب کوئی مفر باقی نہ رہا۔ جاکر جانور کو دیکھا۔ صاحب سے مِلے۔ قیمت پوچھی۔ چار سو پر معاملہ طے ہوگیا۔

مگر اب اِتنے روپے کہاں سے آئیں؟ گھر میں اگر سو دوسو روپے تھے۔ تو وہ سوبھدرا کے پاس تھے اور سوبھدرا سے اس معاملہ میں انھیں ہمدردی کی مطلق اُمید نہ تھی۔ شرماجی اپکار بینک کے منیجر چاروچندچٹرجی ان کے دوست تھے۔ ان سے قرض لینے کا ارادہ کیا۔ لیکن آج تک انھیں قرض لینے کا کبھی اتفاق نہ پڑا تھا۔ بار بار ارادہ کرتے اور پھر ہمت ہارجاتے۔ یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں وہ انکار کر بیٹھے تو،اس انکار کا مبالغہ آمیز خون ان کے دل میں غالب تھا۔ اس کوچہ سے بالکل ناآشنا تھے۔ انھیں مطلق نہ معلوم تھا، کہ لوگ کیوں کر مہاجنوں پر اپنا وقار جمالیتے ہیں۔ کئی بار قلم دوات لے کر رقعہ لکھنے بیٹھے۔ مگر مضمون نہ سوجھا۔ اُدھر سدن ڈگبی صاحب کے یہاں سے گھوڑا لے آیا۔ سازوسامان کی قیمت

پچاس روپیہ اور ہوگئی۔ دوسرے دن روپے چکا دینے کا وعدہ ہوا۔ صرف رات بھر کی مہلت تھی۔ علی الصباح روپے دینا ضروری تھا۔ شرماجی کی حیثیت اور وقار کے آدمی کے لیے اتنے روپیوں کا انتظام کرنا مشکل نہ تھا۔ مگر انھیں چاروں طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ انھیں آج اپنی طبعی کمزوری کا علم ہوا۔ جو شخص کبھی بلندی پر نہ چڑھا ہو۔ اس کا دماغ ایک معمولی چھت پر بھی تیورا جائے گا۔ اس عالمِ یاس میں انھیں سوبھدرا کے سوا اور کوئی سہارا نظر نہ آیا۔ اُس نے ان کی رونی صورت دیکھی تو پوچھا۔"آج اتنے سُست کیوں ہو طبیعت تو اچھی ہے؟"

شرماجی نے سر جھکا کر جواب دیا۔"ہاں طبیعت تو اچھی ہے۔"

سوبھدرا۔ تو چہرہ کیوں اُترا ہے؟

شرما۔ کیا بتاؤں کچھ کہا نہیں جاتا۔ سدن کے مارے پریشان ہوں۔ کئی دن سے گھوڑے کے لیے ضد کیے ہوئے تھا۔ آج ڈبگی صاحب کے یہاں سے گھوڑا خرید لایا۔ ساڑھے چارسو کے ماتھے ڈال دیا۔

سوبھدرا نے حیرت سے کہا۔"اچھا یہ سب ہوگیا اور مجھے خبر ہی نہیں۔"

شرماجی نے ندامت سے کہا۔"تم سے کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔

سوبھدرا طعن آمیز ہمدردی سے بولی۔"ڈر کی کیا بات تھی کیا میں سدن کی دشمن ہوں۔ جو جل بھن جاتی۔ اس کے کھیلنے کھانے کے کیا اور کوئی دن آئیں گے! کون چھپن ٹکے کا خرچ ہے۔ تم سلامت رہو۔ ایسے پانچ سو روپے کہاں آئیں گے کہاں جائیں گے۔ لڑکے کا من تو رہ جائے گا۔ آخر اسی بھائی کا بیٹا تو ہے جس نے آپ کو پال پوس کر آج اس قابل بنادیا۔

پدم سنگھ اس طعن کے لیے تیار تھے۔ یہی طنز سننے کے لیے وہ سوبھدرا کے پاس گئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے سدن کی شکایت کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ حقیقتاً انھیں سدن کی یہ حرکت اتنی بے جا نہ معلوم ہوئی جتنی اپنی قابلِ افسوس ناداری، مگر سوبھدرا کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس کی دل میں بیٹھنا ضروری تھا۔ شیرنی کے ماند میں گھس کر اسے قابو میں کرناچاہتے تھے، شرماتے ہوئے بولے۔"چاہے جو کچھ ہو۔ مگر مجھے تو تم سے کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ دل کی بات کہتا ہوں۔ لڑکوں کا کھانا پہننا سب کو

اچھا معلوم ہوتا ہے مگر گھر میں پونجی بھی تو ہو۔ دن بھر سے اسی فکر میں غوطے کھارہا ہوں۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ سویرے ڈگبی کا آدمی آئے گا۔ کیا جواب دوں گا۔ کاش بیمار ہی ہوجاتا تو ایک حیلہ ہاتھ آتا۔

سوبھدرا۔ یہ کون مشکل بات ہے۔ سویرے چادر اوڑھ کرلیٹ رہنا میں کہہ دوں گی آج طبیعت اچھی نہیں ہے۔

شرماجی ہنسی نہ روک سکے۔ اس طنز میں کتنی بے نیازی، کتنی بے غرضی، کتنی ستم ظریفی تھی۔ بولے۔"اچھا مان لیا کہ آدمی کل لوٹ گیا لیکن پرسوں تو ڈگبی صاحب جانے والے ہیں۔ کل کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہی کرنی پڑے گی۔"

سوبھدرا۔ تو وہی فکر آج کیوں نہیں کرلیتے۔

شرما۔ بھئی چڑھاؤ مت، اگر میری عقل کام کرتی تو تمھاری پناہ کیوں لیتا۔ خموشی سے اپنا کام نہ کرلیتا۔ جب کچھ نہیں بن پڑا ہے۔ تب ہار کر تمھارے پاس آیاہوں۔ بتلاؤ کیا کروں؟

سوبھدرا۔ تو بھلا میں کیا بتاؤں۔ تم نے تو وکالت پڑھی ہے۔ میں تو کریا اچھر بھینس برابر۔ بھلا میری عقل یہاں کیا کام کرے گی۔ اتنا جانتی ہوں کہ گھوڑے کو دروازے پر ہنہناتے سن کر دشمنوں کے دل دہل جائیں گے۔ سارے شہر میں دھوم مچ جائے گی سدن کو جس وقت اس پر سوار دیکھوگے آنکھوں میں نور آجائے گا۔

شرما۔ وہی تو پوچھتاہوں۔ کہ یہ سب مرادیں کیوں کر پوری ہوں؟

سوبھدرا۔ ایشور پر بھروسہ رکھیے۔ وہ کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی دیں گے۔

شرما۔ تم تو پھر طعنے دینے لگیں۔

سوبھدرا۔ ان کے سوائے میرے پاس اور ہے ہی کیا؟ اگرتم سمجھتے ہوکہ میرے پاس روپے ہوں گے تو یہ تمھاری بھول ہے۔ مجھے ہیر پھیر کرنا نہیں آتا۔ یہ صندوق کی چابی لیجیے۔ سوسواسو روپے پڑے ہوئے ہیں۔ نکال لے جایئے باقی کے لیے اور کچھ تدبیر کیجیے۔ آپ کے کتنے ہی دوست ہیں کیا دوچارسو کا انتظام نہ کرسکیں گے؟

گو پدم سنگھ یہی جواب سننے کے لیے آئے تھے۔ پر اسے کانوں سے سُن کروہ بہت مایوس ہوگئے صلاح و مشورہ سے جس تقویت کی اُمید تھی۔ وہ دل کو نہ حاصل ہوئی۔ گانٹھ ذرا بھی ڈھیلی نہ پڑی۔ خاموش آسمان کی طرف تاکنے لگے جیسے کوئی اتھاہ ندی میں بہا جاتاہو۔

سوبھدرا صندوق کی چابی دینے کو تیار تو تھی۔ لیکن اگر شرماجی نے چابی لے کر صندوق کھولا ہوتا تو انھیں سو کی جگہ پورے پانچ سو روپے ایک ریشمی بٹوے میں رکھے ہوئے ملتے۔ یہ سوبھدرا کی سال بھر کی کمائی تھی۔ ان روپیوں کو دیکھ۔ دیکھ وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ کبھی سوچتی اب کی گھر چلوں گی تو گاؤں کی عورتوں کے لیے ایک ایک ساڑھی لیتی چلوں گی۔ کبھی سوچتی یہیں کوئی کام پڑجائے اور شرماجی روپیوں کے لیے پریشان ہوں تو میں جھٹ نکال کر دے دوں گی۔ وہ کیسے خوش ہوں گے حیرت میں ہوجائیں گے عموماً حسینوں کے دلوں میں ایسے بلند ارادے نہیں ہواکرتے وہ روپے اپنے زیوروں کے لیے جمع کرتی ہیں۔ لیکن سوبھدرا بہت ہی خوش حال خاندان کی لڑکی تھی۔ گہنوں سے طبیعت سیر تھی۔ اسے روپیوں کی ذرا بھی گرفت نہ تھی ہاں ایک ایسے بے جا صرف کے لیے انھیں نکالنا ناگوار گزرتا تھا۔ مگر شوہر کی بیکسی اور بے بسی اور مجبوری پر اُسے ترس آگیا۔ بولی۔ ''آپ نے بیٹھے بٹھائے یہ دردسر مول لیا۔ سیدھی سی تو بات تھی ۔ کہہ دیتے بھائی ابھی روپے نہیں ہیں تب تک فٹن پر سیر کرو۔ اس طرح لڑکوں کا دل بڑھانا کون اچھی بات ہے آج گھوڑے کی ضد ہے۔ کل موٹرکار کی دھن ہوگی۔ تب کیا کیجیے گا مانا کہ اس کی دل جوئی آپ کا فرض ہے۔ مگر سب کام اپنی حیثیت دیکھ کرکیے جاتے ہیں۔ آپ کے بھائی صاحب یہ سن کر آپ سے ہرگز خوش نہ ہوں گے۔

یہ کہتے ہوئے وہ جھمک کر اُٹھی۔ صندوق سے بٹوا لاکر شرماجی کے سامنے پٹک دیا۔ اور بولی۔ ''یہ لیجیے پانچ سو روپے ہیں۔ جو چاہیے کیجیے رکھے رہتے آپ ہی کے کام آتے۔ مگر خیر لے جایے۔ کسی طرح آپ کا فکر تو دُور ہو۔ اب صندوق میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

شرماجی سکتے میں آگئے روپیوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ پر اُن پر ٹوٹے نہیں۔ دل کا بوجھ ہلکا ضرور ہوا۔ چہرہ پر اس کی ایک ہلکی سی جھلک نمودار ہوئی مگر وہ طفلانہ وارفتگی، وہ مجنونانہ مسرت جس کی سوبھدرا کو اُمید تھی نہ دکھائی دی، ایک ہی لمحہ میں یہ اطمینان کی جھلک بھی مٹ گئی۔ تاسف اور پریشانی کا رنگ نمودار ہوا۔ سوچا۔ ''معلوم نہیں غریب نے کس نیت سے یہ روپے بچائے تھے۔ اپنی کون کون سی ضرورتیں ان پر قربان کی

تھیں۔ یہ روپے نہیں ہیں۔ اس کی قربانیاں ہیں۔ یہ اس کی ضروریاتِ کشتہ ہیں، اس کی دہن بستہ تکلیفیں ہیں۔ انھیں چھونا اُس پر ستم ناروا ہے۔"

سوبھدرا نے انھیں متفکر دیکھ کر پوچھا۔"مفت کا دھن پاکر خوش نہیں ہوئے؟"

شرماجی نے احسان مند ں گاہوں سے دیکھ کر کہا۔" کیا خوش ہوں۔ تم نے ناحق یہ روپے نکالے۔ میں جاتا ہوں۔ گھوڑے کو واپس کردیتاہوں۔ کہہ دوں گا ستارہ پیشانی ہے۔ یا اور کوئی عیب نکال دوں گا۔ سدن برا مانے گا مانا کرے۔ اس کی کیا دوا ہے؟

اگر سوبھدرا نے روپے دینے کے پہلے گھوڑا کو پھیر دینے کا ذکر کیاہوتا۔ تو شرماجی برہم ہوجاتے اسے اپنی شرافت اور عزت پر ایک داغ سیاہ خیال کرتے۔ اُسے آڑے ہاتھوں لیتے وہ الگ۔ مگر اس وقت سوبھدرا کے ایثار نے انھیں مسخر کرلیا تھا۔ مسئلہ تھا"گھر میں شرافت دکھائیں یا باہر۔" انھوں نے فیصلہ کیا کہ گھر میں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر ہم باہر والوں کی ں گاہ میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے گھروالوں کی کب پروا کرتے ہیں!

سوبھدرا حیرت سے بولی۔"یہ کیا اتنی جلدکایا پلٹ ہوگئی۔ جانور لے کر اُسے بلاوجہ واپس کروگے تو کیا بات رہ جائے گی۔ اگر ڈبگی صاحب اسے واپس بھی لے لیں تو یہ ان کے ہاتھ کتنی بڑی بے انصافی ہوگی۔ وہ بے چارے وطن جانے کے لیے پا بہ رکاب ہیں۔ نہیں یہ جھوٹی بات ہے۔ روپے لے جایئے۔ دے دیجیے ایسے کتنے روپے آئیں گے۔ آخر انھیں دنوں کے لیے تو روپیہ جمع کیا جاتا ہے۔ میں سچّے دل سے کہتی ہوں کہ مجھے ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ میں بڑی خوشی سے دے رہی ہوں۔ اگر ایسا ہی ہے تو تم میرے روپے ادا کردینا۔ قرض سمجھ کرلو۔"

تبدیل صورت میں اعجاز ہے۔ شرما جی نے خوش ہوکر کہا۔"ہاں اس شرط پر لے سکتا ہوں مناسب سود دینے میں بھی مجھے عذر نہیں ہے۔ ماہوار قسط ادا کروں گا۔"

(۱۶)

زمانہ قدیم کے رشیوں نے تزکیہ نفس کی دوصورتیں بتلائی ہیں۔ اختلاط اور احتراز حالانکہ پہلی صورت نہایت دشوار اور سنگلاخ ہے۔ مگر ہماری شہری معاشرت نے اپنے بہترین مقامات پر مینا بازار سجاکر اسی منزل میں ہفت خوان کو اختیار کیا ہے۔ وہ انسان کو کنول بنانا چاہتی ہے جو پانی میں رہتا ہے پر اپنا دامن خشک رکھتا ہے اس نے کج دارمریض کی

روش اختیار کی ہے۔

زندگی کے مختلف مدارج میں مختلف کیفیات کا غلبہ رہتا ہے۔ بچپن مٹھائیوں کا زمانہ ہے ،بڑھاپا حرص وہوس کا اور شباب تمناؤں، اور ولولوں کے دن ہیں۔ اس دور میں مینابازار کی سیروں میں ایک طوفان برپا کردیتی ہے۔ جو ثابت قدم ہیں بینا ہیں یا خشک ہیں۔ وہ سنبھل جاتے ہیں باقی پھسلتے ہیں اور گرپڑتے ہیں۔

شراب کی دکانوں کو ہم بستی سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قمارخانوں سے بھی ہم کو نفرت ہے۔ لیکن ارباب نشاط کو ہم چوک میں، آراستہ بالاخانوں پر شان سے بٹھاتے ہیں۔ یہ تحریک نفس نہیں ہے تو اور کیاہے؟ عصمت فروشی کو ہم ذلت کی پستی سے نکال کر بے ضرر تفریح کے رتبہ پر بٹھا دیا ہے۔ بازار کی معمولی چیزوں میں کتنی کشش ہوتی ہے! ہم ان پر لٹو ہوجاتے ہیں۔ اور اکثر بلاضرورت بھی انھیں خرید لیتے ہیں۔ تب وہ کون سا دل ہے جو حُسن جیسی انمول جنس پر مر نہ مٹے گا۔ ہمیں اتنا بھی نظر نہیں آتا! مخالف کہے گا یہ اعتراض باطل ہے ہزاروں نوجوان شب و روز شہروں میں سیر کرتے ہیں پر اُن میں شاذ ہی کوئی لغزش کرتاہے۔ وہ تخریب نفس کا عینی ثبوت چاہتا ہے۔ مگر اسے معلوم نہیں کہ ہَوا کی طرح ضعف باطن بھی ایک غیرضروری شے ہے جس کا علم اس کے فعل ہی سے ہوسکتا ہے۔ آج ہم اتنے بے غیرت اتنے بے ہمّت کیوں ہیں؟ ہم میں اپنی روحانی عظمت کا احساس اتنا کم کیوں ہے؟ ہماری ضعف جانی کا کیا باعث ہے؟ ہمارے قول و فعل میں مطابقت کیوں نہیں؟ ہمارے ارادے اتنے کمزور کیوں ہیں؟ ہمارے معیار زندگی کیوں اس قدر گرگئے ہیں؟ یہ سب ہمارے انحطاط نفس کی علامتیں ہیں۔

کئی مہینے گزرگئے۔ برسات کے دن آئے۔ میلوں ٹھیلوں کی دھوم مچی۔ سدن بانکی سج دھج بنائے، منچلے گھوڑے پر سوار چاروں طرف گھوما کرتا۔ اس کے دل میں خواہشات کا ایک شعلہ سا جلا کرتا۔ اس بحر حُسن کی مست اور پُرخروش لہریں، بلورین غلاف سے ڈھکی ہوئی، اس کی کشتیٔ دل کو زیروزبر کیا کرتیں۔ وہ اب اِتنا دلیر ہوگیا تھا کہ دال منڈی میں گھوڑے سے اُترکر تمبولیوں کی دُکان پر پان کھانے بیٹھ جاتا وہ سمجھتے یہ کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے اس سے بازارِ حُسن کی خوش آئند خبریں بیان کرتے۔ کس کا گانا لاجواب ہے۔ کون حُسن میں بے نظیر ہے۔ کون عشاق نواز ہے۔ کون ستمگر اور بے وفا۔ سدن ان باتوں کو بڑے شوق

سے سُنتا۔ اب اس کا مزاج کچھ ذوق آشنا ہوچلا تھا۔ پہلے جو غزلیں مہمل معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اب اس کے دل کے تاروں میں رعشے پیدا کردیتی تھیں۔ نغمہ کی لطیف صداؤں سے وہ مدہوش ہوجاتا اور بہ مشکل تمام اپنے تئیں عالمِ بالا کی سیر سے باز رکھتا۔

پدم سنگھ سدن کو فیشن ایبل تو بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا بانکپن ان کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ وہ روز ہوا خوری کے لیے جاتے۔ پر سدن انھیں کبھی پارک یا میدان میں نہ ملتا۔ انھوں نے دوتین بار اسے دال منڈی میں کھڑے دیکھا۔ انھیں دیکھتے ہی سدن جھٹ کسی دکان پر بیٹھ جاتا۔ اور کچھ خریدنے کا بہانہ کرتا۔ شرماجی اسے دیکھتے اور سر نیچا کیے ہوئے چلے جاتے۔ بہت چاہتے۔ کہ سدن کو ادھر آنے سے روکیں پر شرم کے مارے کچھ کہہ نہ سکتے۔ انھیں یہ خیال بے چین کرنے لگا کہ سدن کو دال منڈی کی ہَوا لگ گئی۔

ایک دن شرماجی شام کے وقت چہل قدمی کرنے جارہے تھے۔ کہ دفعتاً راستہ میں دو صاحبوں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ دونوں حضرات میونسپلٹی کے ممبر تھے ایک صاحب کا نام تھا۔ ابوالوفا۔ دوسرے کا عبد اللطیف۔ یہ دونوں صاحب فٹن پر سیر کرنے جارہے تھے۔ شرماجی کو دیکھتے ہی رُک گئے۔

ابوالوفا بولے۔''آیئے جناب! آپ ہی کا ذکر خیر ہورہاتھا۔ آیئے کچھ دور ساتھ ہی چلیے۔''

شرما جی۔ میں اس قت چہل قدمی کا عادی ہوں۔ معاف کیجیے۔

ابوالوفا۔ اجی آپ سے ایک خاص بات کہنی ہے۔ ہم تو آپ کے درِ دولت پر حاضر ہونے والے تھے۔

عبد اللطیف۔ وہ مژدۂ جاں فزا سنائیں کہ طبیعت پھڑک جائے۔

شرما جی اصرار سے مجبور ہوکر فٹن پر بیٹھ گئے۔

ابوالوفا۔ کچھ انعام دلوایئے۔ تو آپ کو بڑھیا۔ تازہ مزہ دار۔ روح کو تازہ کرنے والی خبر سنائیں......

شرماجی۔ فرمایئے تو؟

ابوالوفا۔ آپ کی کھانا پکانے والی مہراجن سُمن بائی، ہوگئیں۔

عبد اللطیف۔ واللہ ہم آپ کے نظرِانتخاب کے قائل ہیں۔ ابھی تین چاردن سے اس نے

دال منڈی میں بیٹھنا شروع کیا ہے۔ مگر اتنے ہی عرصہ میں ماہِ درخشاں کی طرح سارے ستاروں کا رنگ ماند کردیا۔ اس کے سامنے اب کسی کا رنگ ہی نہیں جمتا۔ اس کے بالاخانہ کے سامنے رنگین مزاجوں کا ایک ازدحام رہتا ہے۔ چہرہ گلاب ہے اور جسم تپایا ہوا کندن۔ جناب ازروئے ایمان کہتا ہوں کہ ایسی دلفریب صورت میں نے نہ دیکھی تھی۔

ابوالوفا۔ اندازوں میں قیامت کی دلفریبی ہے۔ بھئی اسے دیکھ کر بھی کوئی زہد کا دعویٰ کرے تو میں اس کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ ایسے لعل بے بہا کو گوڈرسے نکالنا آپ ہی جیسے حُسن شناس آدمی کا کام تھا۔

عبداللطیف۔ بلاکی ذہین معلوم ہوتی ہے۔ ابھی آپ کے یہاں سے گئے ہوئے پانچ چھ مہینے سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے لیکن کل اس کا گانا سُنا تو دنگ رہ گئے۔ اس شہر میں اس کا ثانی نہیں۔ کسی کے گلے میں یہ لوچ اور صفائی اور نزاکت نہیں ہے۔

ابوالوفا۔ اجی جدھر جاتاہوں۔ اسی کے چرچے سنتا ہوں۔ لوگوں پر جادوسا ہوگیاہے۔ سنا ہے سیٹھ بلبھدرداس کی آمدورفت شروع ہوگئی ہے۔ چلیے آج تعلقات قدیم کی بنا پر آپ بھی لطفِ صحبت اُٹھائیے۔ آپ کے طفیل میں ہم بھی باریاب ہوجائیں گے۔

عبد اللطیف۔ اس وقت ہم آپ کو کھینچ لے چلیں گے تخلیہ میں جب آپ کا مزاج چاہے ملتے رہیے گا مگر اس وقت آپ کو ہماری خاطر کرنا ہوگی۔

شرماجی اس خبر کو سن کر افسوس اور خفت اور پشیمانی کے بوجھ سے اتنا دبے کہ سر نہ اُٹھاسکے۔ جس بات کا انھیں اندیشہ تھا۔ وہ آخر پوری ہوکر رہی۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کہیں تنہا بیٹھ کر اس سانحہ پر غور کریں اور فیصلہ کریں کہ اس میں کہاں تک خطاوار ہوں ان دونوں اصحاب کا بے جا اصرار دیکھ کر بولے۔ ”مجھے معاف فرمایئے میں آپ لوگوں کے ساتھ نہ چل سکوں گا۔“

ابوالوفا۔ کیوں؟

شرماجی۔ اس لیے کہ میں ایک بھلے گھر کی عورت کو ایسی حالت میں دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ آپ دل میں جو چاہیں سمجھیں پر میرا اس سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ میرے گھر میں آتی جاتی تھی۔

عبد اللطیف۔ جناب یہ پارسائی کی باتیں کسی دوسرے وقت کے لیے اُٹھا رکھیے۔ ہم نے اسی

کوچہ میں عمر صرف کی ہے۔ اور اس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہیں چلیے ذرا ہم لوگوں کا تعارف کرادیجیے۔ آپ کی سفارش سے ہمارا بھلا ہوجائے گا۔

شرماجی بے صبر ہوکر بولے۔"میں عرض کرچکا کہ میں وہاں نہ جاؤں گا۔ مجھے اُتر جانے دیجیے۔"

ابوالوفا۔ اور ہم کہہ چکے کہ ہم آپ کو ضرور لے چلیں گے۔ آپ کو ہماری خاطر اتنی تکلیف کرنا پڑے گی۔

عبد اللطیف نے گھوڑے کو ایک چابک لگایا۔ وہ ہَوا ہوگیا۔ شرماجی نے غصہ ہوکر کہا۔"آپ مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہیں؟"

ابوالوفا۔ جناب خاطر احباب بھی تو کچھ ہونی چاہیے۔ دم کی دم میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ لیجیے موڑ آگیا۔

شرماجی سمجھ گئے کہ یہ حضرات اس وقت شرارت پر آمادہ ہیں۔ میری منت سماجت پر دھیان نہ دیں گے۔ سُمن کے پاس جانے کے بدلے وہ کنوئیں میں گرنا اچھا سمجھتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اُٹھے اور تیز چلتی ہوئی گاڑی پر سے نیچے کود پڑے حالانکہ انھوں نے اپنے تئیں بہت سنبھالا پر نہ رک سکے۔ پیر اُکھڑ گئے اور تیوراتے ہوئے پچاس قدم تک چلے گئے۔ کئی بار گرتے گرتے بچے۔ اور آخر کار ٹھوکر کھاکر گر ہی پڑے۔ ہاتھ کی کہنیوں میں سخت چوٹ لگی ہانپتے ہانپتے بے دم ہوگئے۔ بدن پسینہ سے شل ہوگیا۔ سر چکّر کھانے لگا۔ اور آنکھیں تلملا گئیں۔ زمین پر بیٹھ گئے۔ عبد اللطیف نے گھوڑے کو روک دیا۔ دونوں آدمی دوڑے ہوئے ان کے پاس آئے۔ رومال نکال کر جھلنے لگے۔ کوئی پندرہ منٹ میں شرماجی کی طبیعت بحال ہوئی۔ دونوں صاحب افسوس کرنے لگے۔ سخت نادم ہوئے معذرت کی معافی کے خواستگار ہوئے۔ مُصر ہوئے کہ گاڑی پر بٹھاکر آپ کے گھر تک پہنچادیں۔ پر شرماجی کسی طرح راضی نہ ہوئے انھیں وہیں چھوڑکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور لنگڑاتے ہوئے گھر کی طرف چلے۔ لیکن اب ذرا اطمینان ہوا تو انھیں حیرت ہوئی۔ کہ میں فٹن پر سے کود کیوں کر پڑا۔ اگر میں ایک بار ترش ہوکر کہہ دیتا کہ گاڑی روکو تو کس کی مجال تھی کہ نہ روکتا! اور اگر وہ اتنے پر بھی نہ مانتے۔ تو میں اُن کے ہاتھ سے راس چھین سکتا تھا۔ پر خیر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ کہیں وہ دونوں مجھے باتوں میں لگاکر سمن

کے دروازے پر جا پہنچتے تو مشکل ہوتی۔ سمن سے میری آنکھیں کیوں کر ملتیں؟ شاید میں فٹن سے اُترتے ہی بھاگتا۔ اور بازار میں دیوانوں کی طرح دوڑتا۔ گائے کو ذبح ہوتے تو شاید دیکھ سکوں۔ پر سمن کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ بڑے سے بڑا خوف ہمیشہ موہوم خیالی ہوا کرتا ہے۔

اس وقت ان کے دل میں باربار یہ سوال پیدا ہورہا تھا کہ اس کا ذمہّ دار کون ہے؟ ان کا فیصلہ گزشتہ واقعات کا تبصرہ کررہا تھا اگر میں نے اسے اپنے گھر سے نکال نہ دیا ہوتا۔ تو وہ یوں تباہ نہ ہوتی۔ میرے یہاں سے نکل کر اسے اور کہیں ٹھکانا نہ ملا۔ اور کچھ غصہ اور کچھ غم کی حالت میں وہ خودفروشی پر آمادہ ہوئی اس کا الزام میری گردن پر ہے۔

لیکن گجا دھر سمن سے اتنا برہم کیوں ہوا! وہ کوئی پردہ نشین عورت نہ تھی میلے ٹھیلے میں آتی جاتی تھی۔ محض ایک دن ذرا دیر ہوجانے سے وہ اسے ایسی سخت سزا ہرگز نہ دیتا۔ وہ اسے ڈانٹتا۔ ممکن ہے وہ دوچار دھول بھی لگاتا۔ سمن رونے لگتی۔ گجا دھر کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا۔ وہ سمن کو منا لیتا۔ بس قصہّ تمام ہوجاتا۔ پر ایسا نہیں ہوا محض اس لیے کہ بٹھل داس نے پہلے ہی سے آگ لگا رکھی تھی۔ بیشک یہ ساری خطا انھیں کی ہے۔ میں نے بھی سمن کو گھر سے نکالا۔ تو انھیں کے باعث انھیں نے سارے شہر میں بدنام کرکے مجھے بے رحم بننے پر مجبور کیا۔ اس طرح تاویلیں کرکے شرماجی نے سارا الزام لالہ بٹھل داس کے سر رکھا۔ اور اس سے انھیں تسکین ہوئی اس فیصلہ نے اس کینہ اور انتقام کے شعلے کو فروکیا۔ جو ادھر مہینوں سے ان کے دل میں دہک رہا تھا۔۔ انھیں بٹھل داس کے جلانے کا، ذلیل کرنے کا، ایک نسخہ ہاتھ آیا۔ گھر پہنچتے ہی وہ بٹھل داس کو خط لکھنے بیٹھ گئے کپڑے اُتارنے کی بھی سُدھ نہ رہی۔

جناب من تسلیم!

آپ کو یہ سن کر بے حد مسرّت ہوگی۔ کہ سمن اب دال منڈی کے ایک بالاخانہ پر رونق افروز ہے۔ آپ کو غالباً یاد ہوگا۔ کہ ہولی کے دن وہ اپنے شوہر کے خوف سے میرے گھر میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ اور میں نے ازراہِ انسانیت اُسے ان چند دنوں کے لیے ٹھہرانا مناسب سمجھا۔ جب تک اس کے شوہر کا غصہّ فرو نہ ہوجائے۔ پر اسی اثناء میں میرے چند احباب نے جو میری عادات سے بالکل ناواقف نہیں تھے مجھے متہم اور رُسوا کرنا شروع کیا حتّی کہ میں اس بدنصیب عورت کو اپنے گھر سے نکالنے پر مجبور ہوگیا! اور آخرکار اس کا وہی حشر ہوا۔ جس کا مجھے اندیشہ

تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس صورت واقعات کو آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ کہ میری نیت میں کہاں تک انسانیت کا دخل تھا۔ اور کہاں تک شیطنت کا اور اس سانحہ کی ذمہ داری کس کے سر پر عائد ہوتی ہے۔

"نیاز مند پدم سنگھ"

(۱۷)

بابو بٹھل داس شہر کے سارے قومی مشاغل اور تحریکوں کی روح تھے ان کی مدد کے بغیر کوئی کام پورا نہ ہوتا تھا۔ کسی تحریک کو شروع کردینا دوسروں کا کام تھا۔ مگر اسے قائم رکھنے کا بار بٹھل داس ہی کے سر پڑتا تھا۔ اور وہ مردجوان ہمّت اس بارگراں کو بڑی خندہ پیشانی سے اُٹھاتا تھا۔ دبا جاتا تھا۔ پر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا۔ اطمینان سے کھانا کھانے کی فرصت نہ ملتی۔ گھر پر بیٹھا نصیب نہ ہوتا۔ بیوی بے اعتنائی کی شکایت کیا کرتی۔ لڑکے آوارہ گھوما کرتے۔ مگر بٹھل داس اپنے قومی انہماک میں ذات کو فنا کرچکے تھے۔ کہیں یتیم خانہ کا چندہ جمع کرتے پھرتے ہیں۔ کہیں غریب طلباء کے تعلیمی وظائف کی فکر میں پریشان، ہیضہ اور پلیگ کے دنوں میں ان کا ایثار مافوق البشر ہوجاتا تھا۔ قحط کے زمانہ میں سر پر آٹا اور دال کے بقچے لیے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔ ابھی ابھی پچھلے دنوں جب گس گا میں سیلاب آیا تھا۔ تو مہینوں گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ چندہ کی فراہمی اور فہرستِ نقصانات کی ترتیب اور امداد کی تقسیم میں شب و روز دوڑتے رہے گھر کا بہت کچھ اثاثہ قوم کے نذر کرچکے تھے۔ پر اس کا ذرّہ بھر غرور نہ تھا۔ اُنھوں نے اونچی تعلیم نہیں پائی تھی۔ قوتِ تقریر بھی معمولی تھی۔ ان کے خیالات میں اکثر دوراندیشی اور اصابت کا پہلو غائب ہوتا تھا۔ وہ بہت بااُصول ہوشیار اور بیدار مغز آدمی نہ تھے۔ مگر ان میں حمایتِ قوم ایک ایسا وصف تھا۔ جو انھیں سارے شہر میں مؤقر و ممتاز بنائے ہوئے تھا۔

بٹھل داس نے شرماجی کا خط پڑھا تو تھپڑ سا لگا۔ ان کی ن گاہ ہر ایک معاملہ کے عملی پہلو پر پڑتی تھی۔ اس کا ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ کہ اس خط کا لہجہ کتنا دلآزار ہے۔ اپنے ایک غریب دوست کو غلط فہمی کے باعث کتنا نقصان پہنچایا اس کا بھی انھیں خیال نہ ہوا۔ گزری ہوئی باتوں پر پچھتانا ان کے خمیر میں نہ تھا۔ اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ اس کا فیصلہ ضروری تھا۔ انھوں نے فوراً فیصلہ کرلیا۔ تذبذب اور دُبدھے میں پڑنا وہ نہ جانتے تھے۔

کے دروازے پر جاپہنچتے تو مشکل ہوتی۔ سمن سے میری آنکھیں کیوں کر ملتیں؟ شاید میں فٹن سے اُترتے ہی بھاگتا۔ اور بازار میں دیوانوں کی طرح دوڑتا۔ گائے کو ذبح ہوتے تو شاید دیکھ سکوں۔ پر سمن کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ بڑے سے بڑا خوف ہمیشہ موہوم خیالی ہوا کرتا ہے۔

اس وقت ان کے دل میں باربار یہ سوال پیدا ہورہا تھا کہ اس کا ذمہّ دار کون ہے؟ ان کا فیصلہ گزشتہ واقعات کا تبصرہ کررہاتھا اگر میں نے اسے اپنے گھر سے نکال نہ دیا ہوتا۔ تو وہ یوں تباہ نہ ہوتی۔ میرے یہاں سے نکل کر اسے اور کہیں ٹھکانا نہ ملا۔ اور کچھ غصہ اور کچھ غم کی حالت میں وہ خودفروشی پر آمادہ ہوئی اس کا الزام میری گردن پر ہے۔

لیکن گجا دھر سمن سے اتنا برہم کیوں ہوا! وہ کوئی پردہ نشین عورت نہ تھی میلے ٹھیلے میں آتی جاتی تھی۔ محض ایک دن ذرا دیر ہوجانے سے وہ اسے ایسی سخت سزا ہرگز نہ دیتا۔ وہ اسے ڈانٹتا۔ ممکن ہے وہ دوچار دھول بھی لگاتا۔ سمن رونے لگتی۔ گجا دھر کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا۔ وہ سمن کو منا لیتا۔ بس قصہّ تمام ہوجاتا۔ پر ایسا نہیں ہوا محض اس لیے کہ بٹھل داس نے پہلے ہی سے آگ لگا رکھی تھی۔ بیشک یہ ساری خطا انھیں کی ہے۔ میں نے بھی سمن کو گھر سے نکالا۔ تو انھیں کے باعث انھیں نے سارے شہر میں بدنام کرکے مجھے بے رحم بننے پر مجبور کیا۔ اس طرح تاویلیں کرکے شرماجی نے سارا الزام لالہ بٹھل داس کے سر رکھا۔ اور اس سے انھیں تسکین ہوئی اس فیصلہ نے اس کینہ اور انتقام کے شعلے کو فروکیا۔ جو ادھر مہینوں سے ان کے دل میں دہک رہاتھا۔ انھیں بٹھل داس کے جلانے کا، ذلیل کرنے کا، ایک نسخہ ہاتھ آیا۔ گھر پہنچتے ہی وہ بٹھل داس کو خط لکھنے بیٹھ گئے کپڑے اُتارنے کی بھی سُدھ نہ رہی۔

جناب من تسلیم!

آپ کو یہ سن کر بے حد مسرّت ہوگی۔ کہ سمن اب دال منڈی کے ایک بالاخانہ پر رونق افروز ہے۔ آپ کو غالبًا یاد ہوگا۔ کہ ہولی کے دن وہ اپنے شوہر کے خوف سے میرے گھر میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ اور میں نے ازراہِ انسانیت اُسے ان چنددنوں کے لیے ٹھہرانا مناسب سمجھا۔ جب تک اس کے شوہر کا غصہّ فرو نہ ہوجائے۔ پر اسی اثناء میں میرے چند احباب نے جو میری عادات سے بالکل ناواقف نہیں تھے مجھے متہم اور رُسوا کرنا شروع کیا حتّی کہ میں اس بدنصیب عورت کو اپنے گھر سے نکالنے پر مجبور ہوگیا! اور آخرکار اس کا وہی حشر ہوا۔ جس کا مجھے اندیشہ

تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس صورت واقعات کو آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ کہ میری نیت میں کہاں تک انسانیت کا دخل تھا۔ اور کہاں تک شیطنت کا اور اس سانحہ کی ذمہ داری کس کے سر پر عائد ہوتی ہے۔

"نیاز مند پدم سنگھ"

(۱۷)

بابو بٹھل داس شہر کے سارے قومی مشاغل اور تحریکوں کی روح تھے ان کی مدد کے بغیر کوئی کام پورا نہ ہوتا تھا۔ کسی تحریک کو شروع کردینا دوسروں کا کام تھا۔ مگر اسے قائم رکھنے کا بار بٹھل داس ہی کے سر پڑتا تھا۔ اور وہ مردجوان ہمّت اس بارگراں کو بڑی خندہ پیشانی سے اُٹھاتا تھا۔ دبا جاتا تھا۔ پر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا۔ اطمینان سے کھانا کھانے کی فرصت نہ ملتی۔ گھر پر بیٹھا نصیب نہ ہوتا۔ بیوی بے اعتنائی کی شکایت کیا کرتی۔ لڑکے آوارہ گھوما کرتے۔ مگر بٹھل داس اپنے قومی انہماک میں ذات کو فنا کرچکے تھے۔ کہیں یتیم خانہ کا چندہ جمع کرتے پھرتے ہیں۔ کہیں غریب طلباء کے تعلیمی وظائف کی فکر میں پریشان، ہیضہ اور پلیگ کے دنوں میں ان کا ایثار مافوق البشر ہوجاتا تھا۔ قحط کے زمانہ میں سر پر آٹا اور دال کے بقچے لیے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔ ابھی ابھی پچھلے دنوں جب گس گا میں سیلاب آیا تھا۔ تو مہینوں گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ چندہ کی فراہمی اور فہرستِ نقصانات کی ترتیب اور امداد کی تقسیم میں شب و روز دوڑتے رہے گھر کا بہت کچھ اثاثہ قوم کے نذر کرچکے تھے۔ پر اس کا ذرّہ بھر غرور نہ تھا۔ اُنھوں نے اونچی تعلیم نہیں پائی تھی۔ قوتِ تقریر بھی معمولی تھی۔ ان کے خیالات میں اکثر دوراندیشی اور اصابت کا پہلو غائب ہوتا تھا۔ وہ بہت بااُصول ہوشیار اور بیدار مغز آدمی نہ تھے۔ مگر ان میں حمایتِ قوم ایک ایسا وصف تھا۔ جو انھیں سارے شہر میں مؤقر و ممتاز بنائے ہوئے تھا۔

بٹھل داس نے شرماجی کا خط پڑھا تو تھپڑسا لگا۔ ان کی ں گاہ ہر ایک معاملہ کے عملی پہلو پرپڑتی تھی۔ اس کا ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ کہ اس خط کا لہجہ کتنا دلآزار ہے۔ اپنے ایک غریب دوست کو غلط فہمی کے باعث کتنا نقصان پہنچایا اس کا بھی انھیں خیال نہ ہوا۔ گزری ہوئی باتوں پر پچھتانا ان کے خمیر میں نہ تھا۔ اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ اس کا فیصلہ ضروری تھا۔ انھوں نے فوراً فیصلہ کرلیا۔ تذبذب اور دُبدھے میں پڑنا وہ نہ جانتے تھے۔

کپڑے پہنے اور دال منڈی جا پہنچے۔ سمن بائی کے مکان کا پتہ لگایا۔ بے دھڑک اوپر چڑھ گئے۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا ہریا نے جو سمن کی نائکہ تھی دروازہ کھول دیا۔

نو بج گئے تھے۔ سمن سونے جا رہی تھی۔ بٹھل داس کو دیکھ کر چونک پڑی۔ انھیں اس نے کئی بار شرماجی کے مکان پر دیکھا تھا۔ ان کا ذکر کچھ لالہ چمن لال سے سُنا تھا کچھ ابوالوفا سے ان حضرات نے انھیں جھکّڑ، مراقی، دریدہ دہن، رقص و سرود کا دشمن، زاہد خشک، بازارِ حسن کا غارتگر بیان کیا تھا۔ اس لیے سمن ان سے بدگمان تھی۔ جھجک کر کھڑی ہوگئی۔ اور سر جھکاکر بولی۔ ''کہیے جناب! آپ اِدھر کیسے بھُول پڑے؟''

بٹھل داس بے تکلفی سے فرش پر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔ ''بھول تو نہیں پڑا۔ قصداً آیاہوں۔ پر جس بات کا کسی طرح یقین نہ آتاتھا۔ وہی دیکھ رہاہوں۔ آج جب پدم سنگھ کا خط ملا۔ تو میں نے سمجھا۔ کسی نے انھیں مغالطہ دیا۔ پراب اپنی آنکھوں کو کیسے دھوکا دوں! سُمن تم نے ہندو قوم کا سر نیچا کردیا۔''

سُمن نے متانت سے جواب دیا ''آپ ایسا سمجھتے ہوں گے۔ اور تو کوئی ایسا نہیں سمجھتا ابھی کئی صاحب یہاں سے مجرا سن کر گئے ہیں۔ سبھی ہندو تھے لیکن کسی کا سر نیچا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے آنے سے بہت خوش نظر آتے تھے۔ پھر اس منڈی میں میں ہی ایک برہمنی نہیں ہوں۔ دوچار کے نام تو میں ابھی لے سکتی ہوں۔ جو بہت اونچے خاندان کی ہیں۔ پر گھر میں اپنا نباہ نہ دیکھا تو مجبور ہوکر یہاں چلی آئیں۔ جب ہندو قوم کو خودہی شرم نہیں ہے تو پھر ہم جیسی بیکس عورتیں اس کی کیا مدد کرسکتی ہیں؟''

بٹھل داس۔ سُمن تم سچ کہتی ہو۔ بیشک ہندوقوم بہت گرگئی ہے۔ اور اب تک کبھی کا اس کا نشان مٹ گیا ہوتا پر ہندو دیویوں ہی نے اب تک اسے زندہ رکھا ہے۔ انھیں کی عصمت اور آن پروری نے ہندو قوم کے چہرے کو روشن رکھاہے۔ محض ہندوؤں کی لاج رکھنے کے لیے لاکھوں ہندو عورتیں آگ میں کود پڑی ہیں۔ یہی وہ پاک سرزمین ہے۔ جہاں عورتیں ناگفتہ بہ سختیاں جھیل کر، ذلّت اُٹھاکر اپنے مردوں کی بے رحمیوں کا ذرا بھی خیال نہ کرکے ہندو قوم کی حرمت قائم رکھتی تھیں یہ عام عورتوں کے اوصاف تھے۔ اور براہمنیوں کا تو پوچھنا ہی کیا پر کتنے شرم کی بات ہے کہ وہی دیویاں آج اس طرح ہندو قوم کے نام کو داغ لگاتی پھرتی ہیں۔ سمن! میں مانتا ہوں کہ تمھیں اپنے گھر پر بہت تکلیف تھی۔ مانا کہ تمھارا

شوہر غریب تھا۔ غصہ ور تھا۔ آوارہ مزاج تھا۔ ماناکہ اس نے تمھیں بڑی بے دردی کے ساتھ گھر سے نکال دیا۔ لیکن براہمنی اپنے خاندان اور ذات کے نام پر یہ سب مصیبتیں جھیلتی ہے۔ مصیبتوں کو جھیلنا۔ ان میں ثابت قدم رہنا۔ یہی برہمن عورت کا دھرم ہے۔ پر تم نے وہ کیا جو نیچے درجہ کی بے شرم عورتیں کیا کرتی ہیں۔ شوہر سے روٹھ کر میکے بھاگتی ہیں۔ اور میکے میں گزر نہ ہوا تو بازار کی راہ لیتی ہیں ذرا سوچو تو کتنے شرم کی بات ہے کہ جس حالت میں تمھاری لاکھوں بہنیں ہنسی خوشی زندگی بسر کررہی ہیں وہی حالت تمھیں اتنی ناگوار معلوم ہوئی کہ تم نے شرم و حیا اور خاندان کی عزت سب کچھ برباد کرکے یہ راستہ اختیار کیا۔ کیا تم نے ایسی عورتیں نہیں دیکھی ہیں۔ جو تم سے کہیں زیادہ غریب، مصیبت زدہ بیکس ہیں۔ مگر ایسے خیالات ان کے دل میں کبھی بھول کر بھی نہیں آتے، ورنہ آج یہ مقدس سرزمین دوزخ سے بدتر ہوجاتی۔ سمن! تمھارے اس فعل نے برہمن ذات ہی کا نہیں۔ ساری ہندو قوم کا سرنیچا کردیا۔

سمن کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ شرم سے سر نہ اُٹھاسکی۔ بٹھل داس نے پھر کہا۔"اس میں شک نہیں کہ یہاں تمھیں عیش اور تکلف کے سامان حاصل ہیں۔ تم ایک اونچے، آراستہ محل میں رہتی ہو۔ خوبصورت نرم غالیچوں پر بیٹھتی ہو۔ پھولوں کی سیجوں پر سوتی ہو۔ لذیذ نعمتیں کھاتی ہو۔ لیکن سوچو تو۔ تم نے یہ آسائش کن داموں خریدی ہے۔ اپنی آبرو اور عزت بیچ کر۔ پہلے تمھاری کتنی عزت تھی۔ لوگ تمھیں پرستش کی ن گاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن آج تمھیں دیکھنا گناہ ہے۔"

سمن نے قطع کلام کرکے کہا۔"جناب! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ جتنی عزت میری یہاں ہورہی ہے۔ اس کا سواں حصہ بھی تب نہیں ہوتی تھی ایک بار میں سیٹھ چمن لال کے ٹھاکردوارے میں جھولا دیکھنے گئی تھی۔ ساری رات باہر کھڑی بھیگتی رہی۔ کسی نے اندر نہ جانے دیا۔ لیکن کل اسی ٹھاکردوارے میں میرا مُجرا ہوا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مندر میرے قدموں سے پاک ہوگیا۔"

بٹھل داس نے سنبھل کر کہا۔"لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ وہ کس قماش کے لوگ تھے۔"

سمن۔ یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کہ وہ کاشی کے ہندوؤں کے مکھیا

ضرور ہیں۔ اور انھیں پر کیا موقوف ہے میں صبح سے شام تک ہزاروں آدمیوں کو اس راستہ سے آتے جاتے دیکھتی ہوں۔ پڑھے بن پڑھے۔ امیر غریب عالم و جاہل سبھی نظر آتے ہیں۔ پر سب کو اپنی طرف کھلی یا چھپی ں گاہوں سے تاکتے دیکھتی ہوں۔ ان میں کوئی ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ جو میری ایک ں گاہِ کرم پر خوشی سے متوالا نہ ہوجائے۔ اسے آپ کیا کہتے ہیں۔ ممکن ہے شہر میں دوچار آدمی ایسے ہوں۔ جو مجھے حقیر سمجھتے ہوں۔ ان میں سے ایک آپ ہیں۔ اُنھیں میں آپ کے دوست پنڈت پدم سنگھ ہیں۔ لیکن جب دنیا میری عزّت کرتی ہے۔ تو مجھے گنے چنے آدمیوں کی بددلی کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔ پدم سنگھ کو بھی جو کچھ نفرت ہے۔ وہ مجھ سے ہے میرے فرقہ سے نہیں۔ میں نے انھیں آنکھوں سے اُنھیں ہولی کے دن بھولی سے ہنستے دیکھا تھا۔

بٹھل داس حملہ کرسکتے تھے۔ مدافعت میں قاصر تھے۔ اس وقت کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ بُرے پھنسے تھے۔

سُمن نے پھر کہا آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے عیش کی آرزو سے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ پر یہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسی اندھی نہیں ہوں کہ بھلے بُرے کی پہچان نہ کر سکوں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ میں نے نہایت شرمناک فعل کیا ہے۔ لیکن میں مجبور تھی۔ میرے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا آپ اگر سُن سکیں تو میں اپنی رام کہانی سناؤں۔ اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دنیا میں سب کا مزاج یکساں نہیں ہوتا۔ کوئی اپنی بے عزتی سہ سکتاہے۔کوئی نہیں سہ سکتا۔ میں ایک اونچے خاندان کی لڑکی ہوں۔ والدین کی نادانی سے میری شادی ایک پھٹے حال گنوار سے ہوگئی لیکن غربت میں بھی مجھ سے اپنی بے عزّتی نہیں برداشت ہوتی تھی جن کی بے عزّتی ہونی چاہیے ان کی عزت ہوتے دیکھ کر میرا کلیجہ کباب ہوجاتا تھا مگر اندر ہی اندر اس آگ سے جلتی تھی کبھی کسی سے اپنی تقدیر کا شکوہ نہ کرتی تھی ممکن تھا کہ کچھ دنوں کے بعد یہ آگ آپ ہی آپ ٹھنڈی ہوجاتی۔ پدم سنگھ کے ہولی والے جلسہ نے اس شعلہ کو تیز کردیا۔ اس کے بعد میری جو کچھ دُرگت ہوئی ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ پدم سنگھ کے گھر سے نکل کر میں بھولی بائی کے جال میں پھنسی مگر اس حالت میں بھی اس راہِ بد سے بھاگتی رہی۔ میں نے چاہا کہ کپڑے سی کر گزر کروں پر شہدوں نے مجھے اتنا تنگ کیا۔ کہ آخر مجھے اسی غار میں کودنا پڑا۔ اگرچہ اس خانۂ سیاہ میں

آکر بے داغ رہنا نہایت مشکل ہے۔ پر میرا عہد ہے کہ اپنی ناموس کی مرتے دم تک حفاظت کروں گی۔ میں ناچوں گی۔ گاؤں گی۔ پر اپنا دامن پاک رکھوں گی۔ اور ایشور چاہیں گے تو اپنے عہد پر قائم رہوں گی۔

بٹھل داس۔ تمھارا یہاں بیٹھنا تمھیں بدنام کرنے کے لیے کافی ہے۔

سمن۔ تو پھر میں اور کیا کرسکتی ہوں۔ آپ ہی بتائیے۔ میرے لیے آرام سے زندگی بسر کرنے کی اور کیا تدبیر ہے؟

بٹھل داس۔ اگر تمھیں اُمید ہے کہ یہاں آرام سے دن گزریں گے۔ تو تمھاری بھول ہے دو چار سال میں تمھیں ضرور معلوم ہوجائے گا۔ کہ یہاں عافیت نہیں ہے آرام قناعت میں ہے۔ عیش سے کبھی آرام نہیں حاصل ہوتا۔

سمن۔ آرام نہ سہی۔ یہاں میری عزت تو ہے۔ میں کسی کی غلام تو نہیں ہوں۔

بٹھل داس۔ یہ بھی تمھاری غلطی ہے۔ تم یہاں چاہے اور کسی کی غلام نہ ہو پر اپنی خواہشوں کی غلام تو ہو۔ خواہشوں کی غلامی اس غلامی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہاں تمھیں نہ آرام ملے گا۔ نہ عزت ملے گی۔ ہاں کچھ دنوں عیش کے مزے اُٹھالو گی۔ پر آخر اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ سوچو چند روزہ عیش کے لیے تم اپنی روح اور اپنی قوم پر کتنا بڑا ظلم کررہی ہو۔

سمن نے آج تک کسی سے ایسی باتیں نہ سُنی تھیں۔ وہ خودپروری کو زندگی کا خاص مقصد سمجھتی آئی تھی۔ حظِ نفس اور ظاہر وقار اس کی زندگی کے دو مسلمہ اصول تھے۔ اسے آج معلوم ہوا کہ سکون خاطر اور حقیقی وقاروں دونوں بازار قناعت کی جنسیں ہیں۔ بولی۔ اچھا میں یہ دونوں باتیں چھوڑتی ہوں۔ پر گزران کی تو کوئی صورت نکالنی ہی پڑے گی۔

بٹھل داس۔ اس کے لیے تمھیں یہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ایسے کتنے ہی دھندے ہیں جو تم اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے کرسکتی ہو۔

سمن اب کوئی حیلہ نہ ڈھونڈ سکی۔ بٹھل داس کے انہاک نے اسے مغلوب کردیا سچّے آدمی کو ہم دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس کی سچائی ہمارے دلوں میں اعلیٰ جذبات پیدا کردیتی ہے۔ بولی۔ ’’مجھے یہاں بیٹھتے خود ہی شرم آتی ہے۔ بتائیے آپ میرے لیے کیا انتظام سوچتے ہیں؟ میں گانے میں ہوشیار ہوں۔ گانا سکھانے کا پیشہ کرسکتی ہوں۔‘‘

بٹھل داس۔ ایسا تو یہاں کوئی مدرسہ نسواں نہیں ہے۔
سمن۔ میں نے کچھ تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے۔ لڑکیوں کو اچھی طرح پڑھا سکتی ہوں۔
بٹھل داس نے اندازِ تفکر سے جواب دیا۔ ”لڑکیوں کے مدرسے تو کئی ہیں۔ پر تمھیں وہاں جگہ مِل سکے گی، اس میں شک ہے۔“
سمن۔ تو پھر آپ مجھ سے کیا کرنے کو کہتے ہیں؟ کوئی ایسا ہندو قوم کا رفیق ہے۔ جو میری گزارن کے لیے پچاس روپے ماہوار دینا منظور کرے؟
بٹھل داس۔ یہ تو مشکل ہے۔
سمن۔ تو کیا آپ مجھ سے چکّی پسوانا چاہتے ہیں۔ میں اتنی حیادار نہیں ہوں۔
بٹھل۔ (شرمندہ ہوکر) بدھوا آشرم میں رہنا چاہو۔ تو اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔
سمن ۔(سوچ کر) مجھے یہ بھی منظور ہے۔ پر وہاں میں نے عورتوں کے اشارے کنائے دیکھے۔ تو پل بھر نہ ٹھہروں گی۔ وہ ذلّت مجھ سے نہ برداشت ہوگی۔
بٹھل داس۔ یہ ٹیڑھی شرط ہے۔ میں کس کس کی زبان روکوں گا۔ لیکن میری سمجھ میں انتظامی کمیٹی والے تمھیں لینے پر راضی بھی نہ ہوں گے۔
سمن نے طنزیہ انداز سے کہا۔ تو جب آپ کی ہندو قوم اس قدر بے حس ہے تو میں اس کی مرجاد کے لیے کیوں تکلیفیں جھیلوں؟ کیوں جان دوں؟ جب آپ مجھے اپنانے کے لیے قوم کو آمادہ نہیں کرسکتے۔ جب قوم میں غیرت باقی نہیں ہے۔ تو میرا کیا قصور ہے؟ میں آپ سے صرف ایک تجویز اور کروں گی۔ اور اگر آپ اسے بھی پورا نہ کرسکے۔ تو پھر میں آپ کو زیادہ دق نہ کروں گی۔ آپ شرماجی کو صرف ایک گھنٹہ کے لیے یہاں تک کھینچ لائیے۔ میں ان سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اسی وقت میں یہاں سے چلی جاؤں گی میں صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ جنھیں آپ قوم کا عاشق سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں میری حیا کی کیا قیمت ہے۔
بٹھل داس خوش ہوکر بولے۔ ”ہاں یہ شرط منظور ہے۔ بولو کِس دن؟“
سمن۔ جب آپ کا جی چاہے۔
بٹھل داس۔ قول سے پھر تو نہ جاؤ گی؟
سمن۔ ابھی اتنی نیچی نہیں ہوئی ہوں۔

(۱۸)

قومی خادموں کو قطعی کامیابیاں بہت کم نصیب ہوتی ہیں۔ شرطی کامیابیاں ہی ان کی مسرت کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ بٹھل داس اس وقت ایسے خوش تھے گویا انھیں کوئی دفینہ مِل گیا ہے۔ انھیں یقین تھا کہ پدم سنگھ اس ذرا سی تکلیف سے منہ نہ موڑیں گے۔ صرف ان کے پاس جانے کی دیر ہے۔ وہ ہولی کے کئی دن قبل سے شرماجی کے پاس نہیں گئے تھے۔ ان کے خلاف بہت کچھ غلط بیانیاں کی تھیں۔ جن پر اب وہ غالبًا نادم تھے۔ تاہم انھیں ندامت مانع نہ ہوئی۔ ان کے گھر کی طرف چلے۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کا تاریک عکس زمین پر پڑرہا تھا۔ لیکن بازارِ حُسن پوری رونق پر تھا۔ بالاخانوں پر رازونیاز کے دَور چل رہے تھے۔ کہیں سُریلی تانیں سُنائی دیتی تھیں کہیں بے فکرانہ قہقہے۔ خرمستی اس کوچہ میں برہنہ و بے حجاب محوِ سیر تھی۔ دال منڈی سے نکل کر بٹھل داس کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ باغیچہ سے نکل کر کسی لق ودق بیابان میں آگئے۔ راستہ ابھی بند نہ ہوا تھا۔ راستہ میں دوایک جان پہچان کے آدمی مِل گئے۔ بٹھل داس نے قدم بڑھا کر انھیں پکڑا۔ اور اپنی فتح کی خوش خبری سُنائی۔ ”آپ کچھ سمجھے۔ کہاں سے آرہاہوں؟ سمن بائی کے درِدولت پر حاضر ہوا تھا۔ ایسا جادو مارا کہ مٹھی میں کرکے چھوڑا۔ بہت شرمندہ ہوئی۔ بدھوا آشرم میں جانے پر تیار ہے۔ کام کرنے والے یوں کام کیا کرتے ہیں۔ اجی ایسی ایسی دلیلیں نکالیں کہ میرا ناطقہ بندکردیا۔ لیکن آخر کفر ٹوٹ ہی گیا۔

شرماجی چارپائی پر لیٹے تھے۔ ابھی نیند نہیں آئی تھی کہ یکایک بٹھل داس نے جاکر آواز دی۔

جیتن کہار اپنی کوٹھری میں بیٹھا ہوا دن بھر کی کمائی کا حساب لگا رہاتھا کہ یہ آواز کان میں آئی۔ چٹ پیسے سمیٹ کر کمر میں رکھ لیے۔ اور بولا۔ ”کون ہے؟“

بٹھل۔ اجی میں ہوں۔ کیا شرماجی سوگئے؟ ذرا اندر جاکر جگا تو دو۔ میرا نام لینا کہنا باہر کھڑے ہیں۔ بڑا ضروری کام ہے ذرا چلے آئیں۔

جیتن دل میں بہت جھنجلایا۔ اس کا حساب اُدھورا رہ گیا۔ معلوم نہیں ابھی روپیہ پورے ہونے میں کتنی کسر تھی۔ الساتا ہوا اُٹھا۔ کواڑ کھولے۔ اور پنڈت جی کو خبر دی وہ سمجھ گئے کہ کوئی نئی بات ہوگی۔ تبھی یہ اتنی رات گئے آئے ہیں۔ فوراً باہر نکل آئے۔

بٹھل داس بولے۔"آئیے آئیے۔ میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ معاف کیجئے گا کچھ سمجھے کہاں سے آرہا ہوں؟ سمن بائی کی خدمت میں گیا تھا۔ آپ کا رقعہ پاتے ہی دوڑا۔ اس میں اس کی بدنامی نہیں۔ ساری ہندو قوم کی بدنامی ہے۔ خیر جناب پہنچا۔ اس کے ٹھاٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بھولی بھالی عورت اب دال منڈی کی رانی ہے۔ معلوم نہیں اتنی جلد اتنا سلیقہ اور تمیز کہاں سیکھ لیا۔ لب و لہجہ کامل، شین و قاف درست، انداز میں ایک عجیب دلآویزی ہے۔ سمجھانے لگا۔ کچھ دیر تک تو خاموش میری باتیں سنتی رہی۔ بعد ازآں رونے لگی۔ میں سمجھ گیا ابھی لوہا گرم ہے۔ دوچار چوٹیں اور لگائیں۔ بس آگئی پنجہ میں پہلے بدھوا آشرم کا نام سن کر گھبرائی۔ پچاس روپے ماہوار گزارے کے لیے مانگنے لگی۔ مگر آپ جانتے ہیں یہاں پچاس روپے دینے والا کون ہے۔ میں نے حامی نہ بھری۔ بالآخر بہت قیل وقال کے بعد اس نے ایک شرط پر بدھوا آشرم میں جانا منظور کیا۔ اس شرط کو پورا کرنا آپ کا کام ہے۔

پدم سنگھ نے متوحش انداز سے بٹھل داس کی طرف دیکھا۔

بٹھل داس۔ گھبرائیے نہیں۔ بہت سیدھی شرط ہے۔ بس یہی کہ آپ ذرا دیر کے لیے اس کے پاس چلے جائیں۔ وہ آپ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔ میں تو جانتا ہی تھا کہ آپ کو اس میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ یہ شرط منظور کرلی تو فرمائیے کب چلنے کا قصد ہے میرے خیال میں سویرے چلیے۔

بٹھل داس جتنے عجلت پسند تھے۔ پدم سنگھ اتنے ہی ست رائے تھے وہ گھنٹوں سوچ بچار کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرسکتے تھے۔ سوچنے لگے۔ اس شرط کے کیا معنی؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ کیا وہ بات خط کے ذریعہ نہ ہوسکتی تھی۔ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے آج ابوالوفا نے ساری داستان اس سے کہی ہوگی۔ اس کا مزاج اس وقت آسمان پر ہے سمجھی ہو کہ یہ حضرت یوں نہیں آتے تو اس طرح بلاؤں۔ دیکھوں کیسے نہیں آتے۔ صرف مجھے ذلیل کرنا مقصود ہے۔ اچھا اگر میں گیا بھی۔ لیکن وہ بعد کو اپنے قول سے پھرجائے تو؟ یہ دلیل انھیں اپنا گلا چھڑانے کے لیے مفید معلوم ہوئی۔ بولے۔"اچھا اگر وہ اپنے قول سے پھرجائے تو؟"

بٹھل داس۔ پھر کیا جائے گی۔ ایسا ہوسکتا ہے کہیں!

پدم سنگھ۔ ہاں ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں۔

بٹھل۔ تو آپ کوئی معاہدہ لکھوانا چاہتے ہیں؟
پدم۔ معاہدہ کی بات نہیں مجھے شک یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ یہ عیش اور آرام چھوڑ کر بدھوا آشرم میں کیوں جانے لگی۔ اور سبھا والے اسے لینا منظور کب کریں گے۔
بٹھل۔ سبھا والوں کو راضی کرنا تو میرا کام ہے۔ نہ مانیں گے تو میں اس کے گزارے کی اور کوئی صورت نکالوں گا۔ رہی پہلی بات! مان لیجیے۔ وہ اپنے قول سے پھر ہی گئی ۔ تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ ہم اپنے فرض سے تو سبکدوش ہوجائیں گے۔
پدم۔ ہاں یہ اطمینان چاہے ہوجائے مگر دیکھ لیجیے گا وہ دھوکا دے گی ضرور۔
بٹھل داس بے صبر ہوگئے۔ اس وقت شرماجی سے برتنے میں بڑے تحمل کی ضرورت تھی۔ لیکن انھوں نے ترش ہوکر کہا۔"اگر دھوکا ہی دے دیا۔ تو آپ کے کون چھپن ٹکے خرچ ہوئے جاتے ہیں۔"
پدم سنگھ۔ آپ کے نزدیک میری عزت کچھ نہ ہو۔ لیکن میں اپنے تئیں اتنا حقیر نہیں سمجھتا۔
بٹھل ۔ خلاصہ یہ کہ آپ نہ جائیں گے؟
پدم۔ میرے جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں اگر مجھے خفیف ہی کرنا ہے تو البتہ۔
بٹھل۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ کہ آپ ایک قومی کام کے لیے اس قدر لیت ولعل کررہے ہیں۔ افسوس! آپ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ ایک ہندو قوم کی عورت کنوئیں میں گری ہوئی ہے۔ اور آپ اسی قوم کے ایک روشن خیال، بیدار مغز نام لیوا ہوکر بھی اسے نکالنے میں اس قدر تامل کرتے ہیں۔ بس آپ اسی کام کے ہیں۔ کہ جاہل کسانوں اور زمیندازروں کا خون چوسیے۔ اور آپ سے کچھ نہ ہوگا۔
شرماجی نے اس ملامت کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دل میں خود اپنی پست ہمتی کے معترف تھے۔ اور اپنے تئیں اس پھٹکار کا سزاوار سمجھتے تھے۔ تاہم ایک ایسے شخص کی زبان سے یہ باتیں حد درجہ ناگوار معلوم ہوئیں۔ جو اس سانحہ کا ایک خاص رکن ہو۔ اور وہ بڑی مشکل سے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے سے اپنے تئیں باز رکھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سمن کو بچانا چاہتے تھے۔ مگر پوشیدہ طور سے بولے۔"آخر اس کی اور بھی تو شرطیں ہیں؟
بٹھل۔ جی ہاں ہیں تو۔ لیکن انھیں پورے کرنے کی آپ میں قدرت ہے؟ وہ گزارے کے

لیے پچاس روپے ماہوار مانگتی ہے۔ آپ دے سکتے تھے ہیں؟

پدم سنگھ۔ پچاس نہیں۔ لیکن بیس روپے دینے پر تیار ہوں۔

بٹھل۔ جناب باتیں نہ بنائیے۔ ایک ذرا سی تکلیف تو آپ سے ہوتی نہیں آپ بیس روپے ماہوار دیں گے۔

پدم۔ میں آپ سے سچّا وعدہ کرتا ہوں کہ بیس روپے ماہوار دیا کروں گا۔ اور اگر میری آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا۔ تو میں پوری رقم دینے میں بھی دریغ نہ کروں گا۔ ہاں اس وقت مجبور ہوں۔ یہ بیس روپے بھی گھوڑا گاڑی بیچ کر نکالوں گا۔ معلوم نہیں کیوں آجکل میرا بازار سُست ہے۔

بٹھل۔ آپ نے بیس روپے ماہوار دے ہی دیے تو باقی کہاں سے آئیں گے؟ اوروں کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آشرم کا چندہ بھی مشکل سے وصول ہوتا ہے۔ لیکن خیر مَیں جاتا ہوں۔ حتی الامکان کوشش کروں گا۔ پر کام نہ پورا ہوا تو اس کا سارا الزام آپ کے سر رہے گا۔

(۱۹)

شام کا وقت ہے۔ سدن اپنے گھوڑے پر سوار دال منڈی کے دو رویہ بالاخانوں اور کھڑکیوں کی طرف تاکتا ہوا چلا جارہا ہے۔ جب سے سمن یہاں جلوہ افروز ہوئی ہے۔ سدن اس کے بالاخانہ کے سامنے کسی نہ کسی بہانہ سے کچھ دیر کے لیے ضرور ٹھہر جاتا ہے۔ اس گل نورس کے رنگ و روپ نے اسے ایسا فریفتہ کرلیا ہے کہ اب اسے کسی پہلو چین نہیں آتا۔ اس کے حُسن میں ایک دلآویز سادگی اور حجاب ہے۔ جو اس کے دل پر غمزدوں اور خوش ادائیوں سے کہیں زیادہ اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ اس پیکرِ حسن پر اپنی محبت نثار کرنا چاہتا ہے۔ مگر موقع نہیں پاتا۔ سمن کے یہاں ہمیشہ حُسن پرستوں کا ازدحام رہتا ہے۔ سدن کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں ان میں کوئی میرے چچا کا دوست نہ ہو۔ اسی لیے اسے اوپر جانے کی ہمّت نہیں ہوتی۔ اس سیلابِ تمنا کو دل میں چھپائے وہ روز اسی طرح مایوس ہوکر چلا جاتاہے۔ لیکن آج اس نے سمن سے ملاقات کرنے کا مضبوط ارادہ کرلیا ہے، چاہے کتنی ہی دیر تک انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ صدمۂ فراق اب اس سے نہیں سہا جاتا۔ وہ سمن کے بالاخانے کے سامنے پہنچا شیام کلیان کی پُرسرور صدا آرہی تھی۔ آگے بڑھا اور دو گھنٹوں تک

پارک اور بازار کا چکر لگاکر نو بجے پھر دال منڈی کی طرف چلا۔ کنوار کی روپہلی چاندنی نے دال منڈی کی اونچی چھتوں اور منڈیروں پر ایک نورانی چادر سی ڈال رکھی تھی۔

بازارِ حُسن، پیکرِ حُسن بنا ہوا تھا۔ سدن پھر سمن کے کوٹھے کے روبرو پہنچا۔ نغمہ بند تھا۔ کچھ بول چال نہ سنائی دی یقین ہوگیا کہ مطلع صاف ہے۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُسے نیچے کی دکان کے ایک ستون سے باندھ دیا اور سمن کے دروازہ پر جاکھڑا ہوا۔ اس کی سانس تیز اور سینہ دھڑک رہاتھا۔

سمن کا ایک مجرا ابھی ختم ہوا تھا۔ اور اس کے دل پر افسردگی طاری تھی۔جو آندھی کے بعد کے سناٹے کی طرح یہ عیش و نشاط کا دور آخر ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک ندائے غیب ہے جو نشۂ عیش کے متوالوں کو ایک لمحہ کے لیے پیدا کردیتی ہے۔ گزرے ہوئے دن خواب کے سہانے منظر بن جاتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے ہماری نگاہِ باطن کھل جاتی ہے۔ اور اس تاریک گوشہ میں خیال کی روشنی جا پہنچتی ہے۔ سمن کا دھیان اس وقت سوبھدرا کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ دل میں اس سے اپنا موازنہ کررہی تھی۔ وہ پُراطمینان زندگی کبھی مجھے نصیب ہوسکتی ہے! غیر ممکن، یہ ہوس اور نمائش کا بازار ہے۔ یہاں وہ سکونِ خاطر کہاں! جب پدم سنگھ کے کچہری سے آنے کا وقت آتا تھا۔ تو سوبھدرا کتنے اشتیاق سے پان کے بیڑے لگاتی تھی۔ تازہ حلوا پکاتی تھی۔ جب وہ گھر میں آتے تھے۔ تو وہ کتنی بے تابی کے ساتھ ان سے ملنے دوڑتی تھی۔ آہ میں نے انھیں ہم آغوش بھی دیکھا ہے۔ کتنی سچّی اُلفت تھی۔ کتنی سرور انگیز اور میری کیا حالت ہے! یہاں یا تو اندھے آتے ہیں۔ یا میا مٹھو! کوئی اپنی دولت کا جال بچھاتا ہے کوئی اپنی چکنی چپڑی باتوں کا۔ اور کوئی اپنی فرضی محبت کا۔ ان کے دل میں محبت کی بو کہاں! وہ خشک، بے حس، بے جان پتّے ہیں۔ نہایت رنگین اور خوش نما۔ جن پر نہ بہار کا اثر ہے۔ نہ خزاں کا۔ نہ گرمی کا نہ سردی کا۔ پر بے سمجھ بچّے چاہے انھیں دیکھ کر خوش ہوں۔ ان سبز پتّوں پر کبھی بھونرے نہ منڈلائیں گے۔ ان رنگین پھولوں پر کبھی بلبل نہ چہکے گا۔

دفعتاً سدن کمرہ میں داخل ہوا۔

سمن چونک پڑی، اس نے سدن کو کئی دن آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ پدم سنگھ سے بہت ملتا تھا۔ ہاں زرد متانت کے بجائے سُرخ بانکپن جھلکتا تھا۔اس کا کمان پن۔

تنگ مانگی۔ نخوت اور چھچھورے پن کی جھلک ہی نہیں۔ جو اس گلزار کے گل چینوں کی امتیازی صفتیں ہیں۔ وہ سیدھا سادہ ۔ بے تکلف بے لوث نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ سمن نے آج اُسے بالاخانوں کی طرف غور سے تاکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ کبوتر پر تول رہا ہے کسی چھتری پر اُترا ہی چاہتا ہے۔ اس وقت سدن کو اپنے سامنے دیکھ کر اُسے وہ فخر آمیز مسرت ہوئی جو دنگل میں کشتی مار کر کسی پہلوان کو ہوتی ہے۔ وہ اُٹھی اور مسکرا کر سدن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

سدن کا معصوم چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ آنکھیں جھک گئیں۔ اس پر ایک رعب سا طاری ہوگیا۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا جیسے کوئی شخص غواصی کے اصولوں کا ماہر ہونے پر بھی پانی میں اُترتے ہی ڈبکیاں کھانے لگے۔

(۲۰)

سدن نے سمن بائی سے اپنی حقیقت چھپائی تھی۔ اپنا نام کنور سدن سنگھ بتلایا تھا۔ پر وہ اس راز کو بہت دنوں تک نہ چھپا سکا۔ سمن نے ہیرا کی معرفت اصلی حالات معلوم کر لیے تھے۔ اور تبھی سے وہ ایک عجیب شش و پنج میں پڑی ہوئی تھی۔ سدن کو دیکھے بغیر اب اسے چین نہ آتا۔ اس کا دل روز بروز سدن کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ سدن بیٹھا ہوا ہو تو اس کے یہاں کسی راجہ یا رئیس کا گزر ہونا محال تھا۔ اس نے اب سدن سے معشوقانہ پرہیز کرنا ترک کر دیا تھا معشوق سے عاشق بن گئی تھی۔ مگر خصوصیت یہ تھی کہ یہ عشق دیدار اور گفتار سے آگے نہ بڑھنے پاتا تھا۔ وہ اس محبت کو معیوب اور ناجائز سمجھتی تھی دوسروں سے اسے چھپاتی تھی۔ حتیٰ کہ ہیرا سے بھی رازداری کرتی۔ سوبھدرا اور پدم سنگھ سے قدیم تعلقات کی بنا پر اس کے دل میں سدن سے ایک فرضی اور نازک رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ اور اگرچہ یہ رشتہ بالکل کچا دھاگا تھا پر سمن کے دلِ بیتاب پر وہ زنجیر کا کام کرتا تھا۔ کہیں پدم سنگھ اور سوبھدرا پر یہ راز کھل جائے تو وہ مجھے کیا سمجھیں گے! انھیں کتنا صدمہ ہوگا! میں ان کی نگاہوں میں کس قدر قابلِ نفرت ہوجاؤں گی! اگر باتوں میں سدن کی زبان کبھی مائل بہ شوخی ہوتی تو وہ سلسلہ گفتگو تبدیل کر دیتی۔ اگر سدن کی انگلیاں مائل بہ شرارت ہوتیں۔ تو وہ اس کی طرف مجوب نگاہوں سے دیکھ کر آہستہ سے اس کا ہاتھ ہٹا دیتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سدن کو اُلجھائے رکھنا چاہتی تھی۔ اپنے حظِ نفس کے علاوہ اس کا مدعا

یہ بھی تھا۔ کہ کہیں میری طرف سے مایوس ہوکر یہ منچلا نوجوان کسی دوسرے صیاد کے دام میں نہ پھنس جائے۔ ورنہ پھر اس کا نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ اس کی فکر احتیاطِ رشک کی بہ نسبت سدن کے بہبود پر زیادہ مبنی تھی۔ وہ سدن کو ایک امانت سمجھتی تھی۔ جسے دوسروں کے دست بُرد سے بچانا اس کا فرض تھا۔ اس کا تصرف محتاطِ خیانت تک محدود تھا۔

لیکن سدن اس کے احتراز کو اپنی زری سے منسوب کرتا۔ اس کے معصوم دل پر محبت کا رنگ خوب گاڑھا ہوگیاتھا۔ سمن اس کی زندگی کا جزواعظم بن گئی تھی مگر کچھ عجیب بات تھی کہ اس بیتابیٔ اُلفت کے باوجود اپنی امنگوں کو دباتا تھا۔ اس کا اکھڑپن غائب ہوگیا تھا۔ وہ وہی کرنا چاہتا تھا۔ جو سمن کو پسند ہو، اگر سمن کہتی کہ تم اب میرے یہاں مت آیا کرو۔ تو شاید وہ خودکشی کرلیتا۔ پر انحراف نہ کرتا۔ وہ نفسانیت جو بازاری اُلفت میں نمایاں ہوتی ہے سچّے جذبات کے زیر اثر رضا جوئی کے تابع ہوگئی تھی۔ لیکن اس احتراز کو روزافزوں ہوتے دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ خالص الفت کی قدر یہاں نہیں ہوسکتی۔ اپنی مردانہ شباہت اور روحانیت پر اسے جو ناز تھا وہ جاتا رہا۔ سیم وزر اور تحفے تحائف کی ضرورت معلوم ہونے لگی۔ لیکن مانگے کس حیلہ سے! آخر بہت پس وپیش کے بعد اس نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ یہاں میرے کھانے پینے کا اچھا بندوبست نہیں ہے۔ لحاظ کے مارے چچا صاحب سے کچھ کہہ نہیں سکتا مجھے کچھ روپے بھیج دیجیے۔

گھر پر یہ خط پہنچا۔ تو بھاما نے شوہر کو طعنے دینے شروع کیے۔ اسی بھائی کا تو تمھیں اِتنا بھروسہ تھا۔ گھمنڈ سے زمین پر پیر نہ رکھتے تھے۔ اب تو گھمنڈ ٹوٹ گیا؟ وہ بھی چچا پر بہت پھولے ہوئے تھے اب آنکھیں کھلی ہوں گی۔ اس زمانہ میں نیکی کسی کو یاد نہیں رہتی۔ اپنے دن بھول جاتے ہیں۔ ان کے لیے میں نے کون کون سا جتن نہیں کیا۔ چھاتی سے دودھ بھر نہیں پلایا۔ اس کا بدلہ یہ مِل رہاہے۔ نہیں اس بے چارے کا کچھ قصور نہیں۔ یہ سب کچھ انھیں مہارانی کے کرتوت ہیں۔ اب کی ملاقات ہوئی تو وہ کھری کھری سناؤں کہ یاد کریں۔

مدن سنگھ کو معاً شبہہ ہواکہ یہ سدن کی حرفت ہے۔ اپنے بھائی پر انھیں کامل اعتماد تھا۔ لیکن جب بھاما نے روپے بھیجنے پر ضد کی۔ تو مجبور ہوگئے۔ سدن روز ڈاک خانہ جاتا۔

ڈاکیے سے باربار پوچھتا۔ آخر چوتھے دن پچیس روپے آئے ڈاکیہ اسے پہچانتا تھا۔ روپیہ ملنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ سدن خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ شام کو بازار میں ایک نفیس ریشمی ساڑی خریدی۔ مگر خوف یہ تھا کہ کہیں سُمن اسے ناپسند نہ کرے۔ وہ کنور بن چکا تھا اس لیے اتنا کم قیمت تحفہ دیتے ہوئے جھینپتا تھا۔ ساڑی جیب میں رکھے دیر تک گھوڑے پر سوار اِدھر ٹہلتا رہا خالی ہاتھ وہ بلا پس وپیش چلاجایا کرتا تھا۔ آج یہ تحفہ لے کر جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جب خوب اندھیرا ہوگیا۔ تو دل مضبوط کرکے سمن کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور ساڑی جیب سے نکال کر چپکے سے سنگاردان پر رکھ دی۔

سمن گھبرارہی تھی۔ کہ آج دیر کیوں ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گئی۔ اور بولی۔ "یہ کیا لائے ہو؟"

سدن نے شرماتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں آج ایک ساڑی نظر آگئی مجھے خوبصورت معلوم ہوئی لے لی۔"

سمن۔ آج انتظار کی اتنی تکلیف دی۔ کیا یہ اُسی کی رشوت ہے؟

یہ کہہ کر اس نے ساڑھی کو دیکھا۔ سدن کی واقعی حیثیت کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔

سمن کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ انھیں اتنے روپے کہاں ملے! کہیں گھر سے اُڑا تو نہیں لائے۔ شرماجی اتنے روپے کیوں دینے لگے۔ یا تو اُنھوں نے اُن سے کوئی بہانہ کیا ہوگایا اُٹھا لائے ہوں گے۔ اس نے سوچا کہ ساڑھی واپس کردوں۔ مگر سدن کی دل شکنی کا خوف مانع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے رکھ لینے میں اس حرکت کے اعادہ کا اندیشہ تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب کی اُسے لے لوں پر آئندہ کے لیے ہوشیار کردوں بولی۔ "اس نوازش کے لیے آپ کی مشکور ہوں۔ لیکن آپ سے میں ان تحفوں کی بھوکی نہیں ہوں۔ آپ کی یہی عنایت کیا کم ہے۔ کہ یہاں آنے کی تکلیف کرتے ہیں۔ میں صرف آپ کی نگاہِ محبت چاہتی ہوں۔

لیکن اس تحفہ کے بعد بھی جب سدن کو سمن کے احتراز میں کوئی کمی نہ نظر آئی تو اسے یقین ہوگیا۔ کہ میری کوشش بیکار ہوئی۔ وہ دل میں شرمندہ ہوا۔ کہ میں ایک ناچیز تحفہ دے کر اس پر اتنی بڑی بڑی امیدیں قائم کرتاہوں۔ جہاں لوگ موتی جواہر نثار کرتے

ہیں۔ اور پھر بھی مدعا تک نہیں پہنچتے۔ وہاں میں چھومنتر کے زور سے پہنچنا چاہتا ہوں۔ اسے کوئی زیادہ بیش قیمت تحفہ دینے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ مگر مہینوں تک اس ارادہ کو پورا کرنے کا موقع نہ ملا۔

ایک روز وہ نہانے بیٹھا تو صابن نہ تھا۔ وہ اندر کے غسل خانہ میں صابن لینے گیا۔ اندر پیر رکھتے ہی اس کی نگاہ طاق پر پڑی۔ اس پر ایک کنگن رکھا ہوا تھا۔ سوبھدرا ابھی اشنان کرکے گئی تھی۔ اس نے کنگن اُتار کر رکھ دیا تھا۔ پر چلتے وقت اس کی یاد بھول گئی تھی۔ کچہری کا وقت قریب تھا۔ وہ کھانا پکانے میں مصروف ہوگئی۔ کنگن وہیں دھرا رہ گیا۔ سدن نے لپک کر اُٹھا لیا۔ اُس وقت اس کی نیت خراب نہ تھی۔ اس نے سوچا چچی صاحبہ خوب حیران ہوجائیں گی ۔ تب ان سے کچھ رشوت لے کر اسے دوں گا۔ اچھی دل لگی رہے گی۔ کنگن کو چھپاکر لایا اور صندوق میں رکھ دیا۔ سوبھدرا کھانا کھاکر لیٹ گئی۔ گرمیوں کے دن تھے ہی۔ سوئی تو تیسرے پہر آنکھ کھلی۔ اس اثنا میں شرماجی کچہری سے آگئے ان سے بات چیت کرنے لگی۔ کنگن کا دھیان ہی نہ رہا سدن کئی بار اندر گیا۔ کہ دیکھوں اس کا کچھ چرچا ہورہا ہے یا نہیں۔ لیکن اس کا ذکر کچھ نہ سنائی دیا۔ شام کو جب وہ سیر کرنے چلا تو یکایک اس کے دل میں خیال پیدا ہوا۔"کیوں نہ یہ کنگن سمن کے نذر کروں!" یہاں مجھ سے تو کوئی پوچھے گا نہیں۔ اگر پوچھا تو صاف کہہ دوں گا میں نہیں جانتا چچی سمجھیں گی نوکروں میں سے کوئی اُٹھا لے گیا ہوگا۔ بلکہ شاید مجھ سے پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آوے۔ اس خیال نے اس کا ارداہ مضبوط کردیا۔ اس نے کنگن کو جیب میں رکھ لیا۔ بعض اوقات موقع دل لگی کو بھی فاسد ارادہ کی صورت میں تبدیل کردیتا ہے۔

سدن کی طبیعت آج سیر کرنے میں نہ لگی۔ وہ یہ تحفہ پیش کرنے کے لیے بے قرار ہورہاتھا۔ معمول سے کچھ پہلے ہی گھوڑے کو دال منڈی کی طرف پھیر دیا۔ یہاں اس نے ایک چھوٹا سا مخملی بکس خریدا اس میں کنگن کو رکھ کر سمن کے یہاں جا پہنچا۔ وہ اس بیش قیمت چیز کو اس انداز سے دینا چاہتا تھا گویا کوئی معمولی تحفہ ہے۔ اظہار تمول کے ساتھ اظہار انکسار بھی مدنظر تھا۔ آج وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ شام کا وقت سمن نے اسی کے لیے نکال رکھا تھا۔ مگر آج ذکر محبت میں بھی اس کا جی نہ لگتا تھا کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ کہ یہ تحفہ کیوں کر پیش کروں۔ جب بہت دیر ہوگئی۔ تو وہ آہستہ سے اُٹھا جیب سے بکس نکالا اور

اسے پلنگ پر رکھ کر دروازہ کی طرف چلا۔ سمن کی نگاہ پڑ گئی۔ پوچھا۔"اس بکس میں کیا ہے؟"

سدن۔ کچھ نہیں خالی بکس ہے۔

سمن۔ نہیں نہیں ذرا ٹھہریے۔ میں دیکھ لوں۔

یہ کہہ کر اس نے سدن کا ہاتھ پکڑلیا۔ اور صندوقچہ کھول کر دیکھا۔ اس کنگن کو اس نے سوبھدرا کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ اس کی ساخت بہت اچھی تھی۔ پہچان گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا آپڑا۔ اُداس ہوکر بولی۔"میں نے آپ سے کہہ دیا تھا۔ کہ میں ان چیزوں کی بھوکی نہیں ہوں آپ مجھے ناحق نادم کرتے ہیں۔"

سدن نے لاپروائی سے کہا گویا وہ راجا ہے۔"غریبوں کا پان پھول قبول کرنا چاہیے۔"

سمن۔ میرے لیے سب سے بڑا تحفہ آپ کی نگاہ ہے۔ وہ ہی اوپر میرے بنی رہے اس کنگن کو آپ میری طرف سے نئی رانی صاحبہ کو دے دیجیے گا۔ میرے دل میں آپ کی جو محبت ہے۔ وہ ان خواہشوں سے پاک ہے۔ آپ کے اس سلوک سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک آپ مجھے بازاری عورت ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ آپ ہی ایک ایسے شخص ہیں۔ جس سے میں سچی، بے لوث محبت رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ نے بھی اس کی قدر نہ کی۔

سدن کی آنکھیں بھر آئیں بیشک میں خطاوار ہوں۔ میں اس کی محبت جیسی بے بہا شئے کو ان ناچیز تحفوں سے خریدنا چاہتاہوں۔ میں ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہوں۔ آج اس شہر میں کون ہے جو اس کے نگاہِ ناز پر سب کچھ قربان نہ کردے۔ بڑے بڑے دولت مند آتے ہیں پر یہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ پر میں ایسا کمینہ ۔ ناشناش ہوں کہ اس کی خلوص میں اب بھی شک کرتا ہوں۔ اس دردناک خیال نے اِسے رُلا دیا۔ سمن سمجھ گئی کہ میرا یہ حملہ اکھر گیا۔ اندازِ محبت سے بولی۔"سدن۔ تم مجھ سے ناراض ہوگئے؟"

سدن نے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بولا۔"ہاں ناراض تو ہوں۔"

سمن۔ کیوں۔ میری کوئی خطا؟

سدن۔ اس لیے کہ تم مجھے جلاتی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ میں ان خرافات سے تمھاری محبت خریدنی چاہتا ہوں۔

سمن۔ تو یہ چیزیں کیوں لاتے ہو؟

سدن۔ میری طبیعت۔

سمن۔ نہیں اب سے مجھے ان نوازشوں سے معاف رکھیے گا۔

سدن۔ خیر دیکھا جائے گا۔

سمن۔ آپ کی خاطر سے میں ان کنگن کو رکھ لیتی ہوں۔ لیکن اسے امانت سمجھتی رہوں گی۔ آپ ابھی آزاد نہیں ہیں۔ جب آپ اپنی ریاست کے مالک ہوجائیں گے۔ اس وقت میں آپ سے من مانی فرمایشیں کروں گی۔ اور آپ کو دق کرڈالوں گی۔ لیکن ابھی انھیں باتوں سے، آپ کے گھر کے لوگ بدگمان ہوجائیں گے۔ کہیں انھوں نے روک تھام کی۔ تو میں آپ کے دیدار کو بھی ترس جاؤں گی۔

(۲۱)

بابو بٹھل داس ادھورا کام نہ کرتے تھے۔ پدم سنگھ کی طرف سے مایوس ہوگئے تو انھیں یہ فکردامن گیر ہوئی۔ کہ سمن کے لیے پچاس روپیہ ماہوار کا چندہ کیوں کروں! ان کی کئی تحریکیں چندوں سے چل رہی تھیں۔ مگر وصولی میں ہمیشہ قباحت ہوتی تھی۔ وِدھوا آشرم کی عمارت بنوانی شروع کی۔ لیکن دوسال سے اس کی دیواریں منہدم ہوتی جاتی تھیں۔ ان پر چھپّر ڈالنے کے لیے کافی روپے نہ ہاتھ آتے تھے۔

فری لائبریری کی کتابیں دیمکوں کی خوراک بن رہی تھیں۔ الماریاں بنوانے کے لیے روپے نہ تھے۔ باوجود ان سب قباحتوں کے اس وقت چندہ کے سوا انھیں اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ سیٹھ بلبھدرداس شہر کے رئیس اعظم، آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل بورڈ کے صدر تھے۔ پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیٹھ جی اپنے بنگلے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقّہ پی رہے تھے۔ بہت ہی منحنی، گورے چٹّے آدمی تھے۔ خوش وضع، خوش مذاق، بشرہ سے ذہانت اور مطانت ٹپکتی تھی۔ وہ ہر ایک کام میں بہت غوروخوض کے بعد ہاتھ ڈالتے تھے۔ بٹھل داس کی تجویز سُن کر کچھ سوچا اور بہت متانت سے بولے۔"تجویز معقول ہے۔ لیکن یہ بتلایئے سمن بائی کو آپ کہاں رکھنا چاہتے ہیں۔"

بٹھل داس۔ ودھوا آشرم میں۔

بلبھدرداس۔ آشرم سارے شہر میں بدنام ہوجائے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ اور ودھوائیں بھی وہاں سے نکل بھاگیں۔

بٹھل۔ تو الگ کوئی مکان لے کر رکھ دوں گا۔
بلبھدر داس۔ محلہ کے نوجوانوں میں معرکہ آرائیاں ہونے لگیں گی۔
بٹھل۔ تو پھر آپ ہی کوئی صورت نکالیے۔
بلبھدر داس۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ اس قصّے میں نہ پڑیں۔ شرم ایک بار آنکھوں سے نکل کر پھر واپس نہیں آتی۔ قاعدہ ہے کہ عضوِ ماؤف کو بدن سے کاٹ ڈالتے ہیں۔ تاکہ اس کا اثر سارے جسم کو خراب نہ کرڈالے۔ معاشرے میں بھی اس قاعدہ پر عمل کرنا چاہیے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ آپ مجھ سے متفق نہیں ہیں۔ لیکن میرا جو کچھ خیال تھا وہ میں نے صاف صاف عرض کردیا۔ آشرم کی انتظامی جماعت کا ایک رُکن میں بھی تو ہوں۔ میں کسی طرح ایک بدقماش عورت کو آشرم میں رکھنے کی صلاح نہ دوں گا۔

بٹھل داس چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔"خلاصہ یہ کہ آپ اس کارِ خیر میں میری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ جب آپ جیسے فہمیدہ حضرات کا یہ حال ہے تو دوسروں سے کیا اُمید ہوسکتی ہے۔ میں نے آپ کا بہت وقت خراب کیا معاف فرمایئے گا۔"

یہ کہہ کر بٹھل داس کھڑے ہوئے۔ اور سیٹھ چمن لال کے درِ دولت پر جاپہنچے۔ یہ سانولے رنگ کے بے ڈول آدمی تھے۔ نہایت لحیم، ڈھیلے ڈھالے، مزاج میں نہ صفائی نہ سلیقہ۔ جسم کی طرح خیالات بھی بے ڈول تھے۔ فراخ کی جگہ تنگ۔ تنگ کی جگہ فراخ۔ یہ رشی دھرم سبھا کے میر مجلس، رام لیلا کمیٹی کے چیرمین اور راس لیلا کمیٹی کے سرپرست تھے۔ پالیٹکس کو زہریلا سانپ سمجھتے تھے۔ اور اخباروں کو سانپ کی بابنی۔ حکّام رسی کی دھن تھی۔ انگریز حکام کے حلقہ میں ان کی خاص عزّت تھی۔ وہاں ان کے جوہر کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ وہ نہ فیاض تھے نہ بخیل۔ چندے کی فہرست کا معائنہ ان کا نورِ ہدایت تھا۔ ان میں ایک خاص وصف تھا۔ جو ان کے عیوب کو چھپائے رہتا تھا۔ یہ ان کی ظرافت تھی۔ بٹھل داس کی تجویز سُن کر بولے۔"بابو صاحب آپ بالکل پھیکے آدمی ہیں۔ آپ میں ذرا بھی حسنِ مذاق نہیں۔ مدّت کے بعد تو اس بازار میں ایک چیز نظر آئی۔ آپ اُسے بھی غائب کرنا چاہتے ہیں۔ کم سے کم اب کی رام لیلا تو ہوجانے دیجیے۔ اب کی راج گدی کے دن اسی کا گانا ہوگا۔ دھوم مچ جائے گی۔ آخر ترکنیں آکر مندر کو ناپاک کرتی ہیں۔ براہمنی رہے تو کیا بُرا ہے۔ خیر یہ تو دل لگی ہوئی۔ معاف کیجیے گا۔ مبارک ہے آپ کی ذات جسے

ایسے نیک کاموں کی لو لگی رہتی ہے۔ کہاں ہے چندے کی فہرست؟"

بٹھل داس سر کھجلاتے ہوئے بولے۔"ابھی تو میں صرف سیٹھ بلبھدرداس ہی کی خدمت میں گیا تھا۔" لیکن آپ جانتے ہیں وہ ایک ہی حیلہ باز ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے ٹال گئے۔

اگر بلبھدرداس نے ایک لکھا ہوتا۔ تو یہاں دو میں شک نہ تھا۔ وہ دو لکھتے۔ تو یہاں چار یقینی تھے۔ لیکن جب مضروب فیہ صفر ہوتو حاصل کیا۔ کوئی بہانہ سوچنے لگے۔ فوراً طبیعت لڑگئی۔ بولے"جناب مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ لیکن بلبھدرداس نے کچھ سمجھ کرہی ٹالا ہوگا اب جو میں دور تک سوچتا ہوں۔ تو اس تجویز میں پالیٹکس کا رنگ صاف نظر آتاہے۔ آپ چاہے اس نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں۔ مگر مجھے تو یہ بالکل پالیٹکل مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات بری معلوم ہوگی۔ وہ جاکر حکام سے اس کی شکایت کریں گے اور آپ جانتے ہیں۔ حکّام کے آنکھیں نہیں ہوتیں۔ صرف کان ہی ہوتے ہیں۔ انھیں معاً کسی سازش کا گمان ہوجائے گا۔"

بٹھل داس بے صبر ہوکر بولے۔"تو صاف صاف کیوں نہیں فرماتے کہ میں کچھ دینا نہیں چاہتا۔ میں مسلمانوں کو اتنا متعصب نہیں سمجھتا۔ کہ وہ اس کارِ خیر سے بدگمان ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ وہ اس معاملہ میں ہم لوگوں کی پوری حمایت کریں گے۔ ایک سیدھے سادھے معاملہ کو سیاسیات کا رنگ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آپ صریح انکار کرسکتے ہیں۔"

سیٹھ جی خفیف ہوگئے۔ کچھ کہا چاہتے تھے۔ لیکن بٹھل داس نے انھیں موقع نہ دیا۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ مایوسی ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ آئے دن ہی اس کا تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ ممکن تھا کہ کسی قدر وتحمّل سے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتے۔ پر تحمّل ان کے سرشت میں تھا۔ یہاں سے ڈاکٹر شیاما چرن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ بیدارمغز آدمی تھے۔ شہر کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ وکالت نصف النہار پر تھی۔ اعتدال کے زبردست پیرو تھے۔ الفاظ بہت تول تول کر زبان سے نِکالتے۔ ان کی کم گوئی اصابت رائے کا درجہ رکھتی تھی۔ ذرّیں خموشی کے اصول پر قربان تھے میانہ روی کے دِلدادہ نہ اِن کی مخالفت سے کسی کو نقصان تھا نہ موافقت سے

کوئی خاص فائدہ سبھی خیال کے لوگ انھیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔ سبھی اپنا دشمن۔ اس دھوپ چھاؤں میں ان کی شہرت سدا بہار بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی کمشنری کی طرف سے لوکل کونسل کے ممبر تھے اپنا کچھ نہ کچھ روزانہ وقت رائے دہندگان پر صرف کیا کرتے تھے۔ بٹھل داس کی تجویز سُنی تو بولے۔"مجھے آپ سے اس معاملہ میں کامل ہمدردی ہے۔ میرے لائق جو کام ہو وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کس طرح ان حالات کی بیخ کنی کی جائے۔ جن کے زیراثر ایسے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ ایک عورت کو بچالیں گے تو کیا ہوگا؟ یہاں تو آئے دن ایسے سانحے ہوتے رہتے ہیں اسباب کی اصلاح ضروری ہے۔ کہیے تو کونسل میں کوئی سوال کروں؟"

بٹھل داس اچھل پڑے۔ کونسل میں کسی سوال کا پوچھا جانا ان کے خیال میں ایک نہایت اہم واقعہ تھا۔ بولے۔"جی ہاں۔ یہ تو نہایت مناسب ہوگا۔"

ڈاکٹر صاحب نے فوراً سوالات کا ایک سلسلہ تیار کیا۔

(۱) کیا گورنمنٹ بتاسکتی ہے کہ گزشتہ سال طوائفوں کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا؟

(۲) کیا گورنمنٹ نے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اضافہ کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ اور گورنمنٹ نے ان کے انسداد کی کیا تدبیر کی ہے۔

(۳) یہ اسباب کہاں تک اقتصادی ہیں۔ کہاں تک جذباتی۔ اور کہاں تک تمدنی؟ پھر سوالات لکھ کر ڈاکٹر صاحب موکلوں سے مخاطب ہوگئے۔ بٹھل داس آدھ گھنٹہ تک بیٹھے رہے۔ تب بے صبر ہوکر بولے۔"تومیرے لیے کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب۔ آپ مطمئن رہیں۔ اب کی کونسل کے اجلاس میں یہ سوالات ضرور پوچھوں گا اور نتیجہ کی آپ کو اطلاع دوں گا۔ یا آپ خود اخباروں میں ملاحظہ فرمالیجیے گا۔

بٹھل داس کے جی میں تو آیا کہ ڈاکٹر صاحب کو آڑے ہاتھوں لیں۔ پر کچھ سوچ کر رہ گئے۔ پھر جانے کی ہمّت نہ پڑی، لیکن اس دھن کے پورے شخص کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ روز کسی نہ کسی بھلے آدمی کا دامن پکڑتے۔ یہ کوشش بالکل رائگاں تو نہیں ہوئی انھیں کئی سو روپے کے وعدے اور کئی سو روپے نقد مل گئے۔ لیک تیس روپے ماہوار کی جو کمی تھی وہ پوری نہ ہوسکی۔ تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد بڑی مشکلوں سے دس روپیہ ماہوار کی مستقل صورت نکلی۔

بالآخر جب انھیں مزید امداد کی توقع نہ رہی۔ تو وہ ایک دن علی الصباح سمن کے پاس گئے۔ وہ انھیں دیکھتے ہی کسی قدر چھپے تمسخر سے بولی کہیئے جناب! کیسے تکلیف کی؟

بٹھل ۔ تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے۔

سمن۔ اِتنے دنوں کے بعد اگر میں بھول جاؤں تو میری خطا نھیں۔

بٹھل۔ میں نے بہت چاہا۔ کہ جلد کوئی انتظام ہوجائے۔ لیکن ایسی بدنصیب قوم سے پالا پڑا ہے۔ جس میں قومیّت کا احساس ہی نہیں رہا۔ تاہم میری کوشش بیکار نہیں ہوئی ۔ میں نے تیس روپے ماہوار کا انتظام کرلیا ہے اور اُمید ہے کہ جو کچھ کمی ہے۔ وہ بھی جلد یا بدیر پوری ہوجائے گی۔ اب تم سے میری یہ التجا ہے کہ اسے قبول کرو۔ اور آج ہی اس کوچہ تاریک سے رخصت ہوجاؤ۔

سمن۔ شرماجی کو آپ نہیں لاسکے۔

بٹھل۔ وہ کسی طرح آنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان تیس روپیوں میں بیس روپیہ انھیں کا عطیّہ ہے۔

سمن نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا! یہ تو بڑے فیاض نکلے مجھے اُن سے اتنی اُمید نہ تھی سیٹھوں سے بھی کچھ مدد ملی؟“

بٹھل ۔ سیٹھوں کی بات نہ پوچھو۔ چمن لال رام لیلہ کے لیے ہزاردوہزار شوق سے دے دیں گے۔ بلبھدرداس حکام کی تواضع و تکریم میں اس سے بھی فیاض ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں انھوں نے سوکھا جواب دے دیا۔

سمن اس وقت سدن کے دام محبت میں گرفتار تھی۔ محبت کا لُطف اُس نے کبھی نہیں اُٹھایا تھا۔ اس نعمت کو پاکر وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، اگرچہ وہ جانتی تھی کہ اس محبت کا انجام فراق کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اُس کا نفس کہتا تھا۔ کہ جب تک اس کا مزہ اُٹھاسکتی ہوں۔ تب تک کیوں نہ اُٹھاؤں؟ آگے چل کر نہ جانے کیا ہوگا۔ نہ معلوم زندگی کی ناؤ کس بھنور میں پڑے گی۔ نہ جانے کہاں کہاں تک بھٹکے گی، آنے والی مصیبتوں کے خیال کو وہ اپنے سامنے نہ آنے دیتی تھی۔ کیونکہ اِدھر عمیق تاریکی کے سوا اور کچھ نہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ اصلاح زندگی کا وہ جوش جس نے اُسے بٹھل داس سے نجات کی التجا کروائی تھی۔ اس وقت ٹھنڈا پڑگیا تھا۔ اس وقت بٹھل داس اگر سو روپیہ ماہوار کی اُمید بھی

دلاتے تو شاید وہ رضامند نہ ہوتی۔ مگر ایک بار خودہی جو تجویز کر بیٹھی تھی۔ اس سے انحراف کرتے ہوئے شرم آتی تھی بولی۔"میں اس کا جواب آپ کو کل دوں گی۔ ابھی کچھ سوچ لینے دیجیے۔"

بٹھل ۔ اس میں کیا سوچنا سمجھنا ہے؟

سمن ۔ کچھ نہیں۔ لیکن کل پر ہی رکھیے۔

رات کے دس بجے تھے۔ جاڑوں کی سنہری چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ سمن کھڑکی سے نیلے آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔ جیسے چاندنی کی روشنی میں تاروں کی چمک ماند ہوگئی تھی۔ اسی طرح نیک ارادے اُس کی نفسانی خواہشات پر غالب آگئے تھے۔

اس کے سامنے ایک مشکل مسئلہ تھا"بٹھل داس کو کیا جواب دوں۔"

آج صبح اُس نے کل جواب دینے کا حیلہ کرکے انھیں ٹالاتھا۔ لیکن دن بھر کے غوروفکر نے اس کے خیالات میں بہت کچھ ترمیم کردی تھی۔

سمن کو یہاں اگرچہ عیش و آرام کرنے کے سبھی سامان میسّر تھے۔ لیکن بسا اوقات اسے ایسے آدمیوں کی آؤبھگت کرنی پڑتی تھی۔ جن کی صورت سے اُسے نفرت تھی۔ جن کی باتیں سُن سُن کر اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ ابھی اس کے احساساتِ لطیف نے طمع کی صورت نہیں اختیار کی تھی۔ اُس پستی تک نہیں پہنچی تھی۔ جب شوق و آرایش اور حظِّ نفس دل کے سارے جذبات کو فنا کردیتا ہے، اس میں شک نہیں۔ کہ وہ آرایش اور نفاست پر جان دیتی تھی۔ لیکن ان تکلفات کے لیے جو نفسی ضرورت تھی۔ اُس سے اُسے نفرت ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ عالم تنہائی میں موجودہ حالت کا سابق سے مقابلہ کیا کرتی تھی۔ بیشک اس وقت یہ تکلفات میّسر نہیں تھے۔ لیکن وہ اپنے دائرہ مین خاص عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، پڑوسنوں کو اس پر حُسنِ ظن تھا۔ وہ ان کے روبرو اپنی خاندانی شرافت پر ناز کرسکتی تھی۔ اپنی مذہب پرستی کا رُعب ان پر جما سکتی تھی۔ کسی کے سامنے اس کی آنکھیں نیچی نہ ہوتی تھیں۔ لیکن یہاں اُس کے دل پر غرور کو قدم قدم پر شرم سے جُھکنا پڑتاتھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ میں ادنیٰ ترین عورتوں کے سامنے بھی سر اُٹھانے کے لائق نہیں ہوں جو سُبکیاں اسے اس وقت سہنی پڑتی تھیں۔ ان کے مقابلہ میں یہ ذلّت کہیں جاں گداز تھی۔ قدردانوں کے رکیک اشارے اور کنائے اس کے دل پر کٹار کا سا زخم

لگاتے تھے تب اس کا دل پُرغم پدم سنگھ پر دانت پیس کر رہ جاتا تھا۔ اگر اس بے رحم نے اپنی بدنامی کے خوف سے مجھے اتنی بیدردی سے نہ نکال دیا ہوتا۔ تو میں ہرگز اُدھر آنے کی جرأت نہ کرتی۔ اگر وہ دوچار روز بھی مجھے پڑے رہنے دیتے۔ تو شاید میں اپنے گھر چلی جاتی۔ یا وہ گجادھر، خود ہی مجھے منالے جاتا۔ اور پھر اُسی طرح رودھوکر زندگی کٹنے لگتی۔ اس لیے اس نے بٹھل داس سے پدم سنگھ کو اپنے ساتھ لانے کی شرط کی تھی۔ وہ انھیں اپنے سوزِ دل کے تیروں سے چھیدنا چاہتی تھی۔

لیکن آج جب معلوم ہوگیا۔ کہ شرماجی میری دستگیری کے لیے کتنے آمادہ ہیں تو اُن سے نفرت کی جگہ اس کے دل میں ایک عقیدت پیدا ہوئی۔ اس نے دل میں کہا۔"میں خواہ مخواہ اپنی کجروی کا الزام ان کے سر پر رکھتی ہوں۔ وہ شریف آدمی ہیں۔ انھیں اپنی عجلت پر ندامت ہوئی ہے۔ میں جاکر اُن کے پیروں پر گر پڑوں گی۔ اور کہوں گی۔ کہ آپ نے مجھ بدنصیب پر جو رحم کیا ہے۔ اس کا صِلہ آپ کو ایشور دیں گے۔ یہ کنگن بھی لوٹا دوں۔ تاکہ انھیں اطمینان ہوجائے کہ جس عورت کی میں نے حمایت کی ہے وہ بالکل اس کی غیر مستحق نہیں ہے۔ بس وہاں سے آکر اس کوچہ تاریک سے نکل بھاگوں۔

لیکن سدن کو کیسے بھلاؤں؟

اپنے دل کی اس کمزوری پر سمن جھنجلا پڑی۔ کیا اس چندروزہ اُلفت کے لیے جس کا انجام حسرت اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ زندگی کو سدھارنے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے دوں؟ چار دن کی چاندنی کے لیے دائمی تاریکی کے گڑھے میں پڑی رہوں؟ اپنے ساتھ ایک سیدھے سادھے نوجوان کی زندگی خراب کردوں۔ جسے دل سے چاہتی ہوں، جس آدمی نے میرے ساتھ اتنی فیاضی کا اظہار کیا ہے۔ اُسی سے یہ دغا! نہیں میں اس محبت کو دل سے نکال ڈالوں گی۔ سدن کو بھول جاؤں گی اس سے کہوں گی تم بھی مجھے بھول جاؤ۔ اب مجھے اس امداد کی کشتی پر بیٹھ کر اس بے حیائی کی ندی کو پار کرنے دو۔

آہ مجھے کتنا دھوکا ہوا، یہ مقام دُور سے کتنا دل فریب کتنا سُہانا نظر آتا تھا۔ میں نے اِسے پھولوں کا باغ سمجھا۔ لیکن ہے کیا؟ ایک خوفناک بیابان خونخوار درندوں، زہریلے حشرات سے پُر!

یہ ندی دُور سے چاندنی کی چادر سی بچھی ہوئی کیسی خوب صورت معلوم ہوتی تھی پر

اس کے اندر کیا ہے؟ بڑے بڑے خوفناک دریائی جانوروں کا مسکن یا بدکردار رئیس زادوں کا تختۂ مشق اور جائے تفریح!

سمن انھیں خیالات میں غرق تھی۔ اُسے اضطراب ہورہاتھا۔ کہ کسی طرح سویرا ہوجائے اور بٹھل داس آجائیں۔ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگوں۔ آدھی رات گزرگئی اور اُسے نیند نہ آئی اب اُسے خوف ہونے لگا۔ کہ کہیں سویرے بٹھل داس نہ آئے تو کیا ہوگا؟ کیا مجھے یہاں پھر صبح سے شام تک میراثیوں اور دھاڑیوں کی خوشامدیں سننی پڑیں گی؟ پھر رنگی ہوئی کٹھ پتلیوں کی خاطر و تواضع کرنی پڑے گی؟ سمن کو یہاں رہتے ابھی چھ ماہ سے زائد نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اتنے ہی دنوں میں اس کی طبیعت یہاں سیر ہوگئی تھی۔ اس کے یہاں سارے دن میراثیوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ وہ اپنی بے ایمانی اور سیاکاریوں کی داستانیں بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کوئی ان میں شاطرگرہ کٹ تھا۔ کوئی مشاق تاش کا کھلاڑی، کوئی ٹھپکے کے فن کا ماہر۔ کوئی دیوار پھاندنے کے علم کا اُستاد۔ اور سب کے سب بے شرمی اور مفسدہ پردازی پر پھولے ہوئے۔ پڑوس کی پڑیاں بھی آتی تھیں۔ رنگی ہوئی بنی ٹھنی، شمع کی طرح جگمگاتی۔ پر یہ طلائی ظروف تھے۔ جن میں قاتل زہر بھرا ہوا تھا۔ ان میں کتنا چھچھوڑپن تھا۔ کتنی فرومائیگی، کتنی دغابازی، کتنی ریاکاری، وہ اپنی بے حیائیوں اور رسوائیوں کے قصےّ مزے لے کر کہتیں۔ عزت نام کو بھی نہ باقی رہی تھی۔ ہمیشہ دوسروں کی دولت پر نگاہ، احمقوں کو پھنسانے اور لبھانے کی دھن، شہر میں جو لوگ نیک نام تھے۔ انھیں یہاں خوب گالیاں دی جاتی تھیں۔ اُن کا خوب مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔اُنھیں گوکھا بدھو اور ایسے ہی دوسرے خطاب دیے جاتے تھے۔ دن بھر اور آدھی رات تک سارے شہر کے چوری اور ڈاکے، زنا اور قتل اور اسقاط اور غبن کے واقعات کے چرچے رہتے اور بسا اوقات مصنف ہی کی زبان سے رؤسا کا بھولی بائی کے ساتھ وہ بے تکلفانہ اختلاط اور ارتباط جس نے ہولی کے جلسے کے دن سمن کے دل میں اپنی کس مپرسی کا خیال پیدا کیا تھا۔ اب اپنی اصلی صورت میں نظر آرہا تھا، یہ محبت نہیں تھی۔ محض رندی تھی۔ محض خرمستی۔ نفسانیت سے پُر اور حسن جذبات سے عاری یہ خالص ہوس پرستی تھی، اب تک سمن صبر کے ساتھ یہ ساری مصیبتیں جھیلتی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ جب اسی کوچہ عصیاں میں رہناہے تو ان باتوں سے کہاں تک بھاگوں۔ دوزخ میں پڑکر دوزخی طور طریق کی پابندی لازمی تھی۔ پہلی

بار جب بٹھل داس یہاں آئے تھے۔ تو اُس نے اُن سے بے رخی جتائی تھی۔ اس وقت تک اُسے یہاں کے حالات کا پورا علم نہ تھا۔ لیکن آج نجات کا دروازہ سامنے کھلا ہوا دیکھ کر اسے قید حرام میں ایک پَل بھی رہنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ جس طرح موقع پاکر انسان کا نفسِ بد بیدار ہوجاتا ہے۔ اس طرح موقع پاکر اس کا نفس نیک بھی بیدار ہوتا ہے۔ رات کے تین بجے تھے۔ سمن ابھی تک کروٹیں بدل رہی تھی۔ رہ رہ کر اُس کا دل بیتابانہ جوش کے ساتھ سدن کی طرف کھنچتا تھا۔ جوں جوں صبح قریب آتی تھی۔ اس کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ وہ اپنے تئیں سمجھاتی تھی "تو اس محبت پر بھولی ہوئی ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں۔ کہ اس کی بنیاد رنگ روپ پر قائم ہے۔ یہ محبت نہیں ہے۔ محض ہوس ہے یہاں کوئی سچی محبت کرتا نہیں، محض تفریح اور خوش وقتی کے لیے آتا ہے۔ پر اس محبت کے دام میں نہ پھنس۔ اُٹھتی ہوئی جوانی اٹھتی ہوئی ندی ہے۔ اس وقت وہ اپنی رو میں ہر ایک چیز کو بہالے جائے گی۔ لیکن جب ندی اپنے پیٹ میں آجائے گی۔ اس وقت کنارے پڑے ہوئے خس وخاشاک کے سوا اور کیا اثر باقی رہے گا؟ کاش میں سدن کو اپنا بناسکتی ۔ اپنی جاںثاریوں سے۔ نازبرداریوں سے خدمت سے دل جوئیوں سے۔ اس کی محبت کو ہمیشہ تروتازہ رکھ سکتی! لیکن یہاں اس کا موقعہ کہاں۔ یہاں اگر میں اس کے لیے جاں بھی دے دوں تو اُسے میری سچائی پر یقین نہ آئے گا۔ یہاں کی ہوا میں بدگمانی ہے۔ ہاں اگر یہاں سے دُور کسی جھونپڑی میں رہتی تو ممکن تھا۔ کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرا ہوجاتا۔ مگر یہ اَن ہونی ہے۔ اب عافیت یہاں سے نکل بھاگنے ہی میں ہے۔"

سفیدہ صبح نمودار ہوا۔ تو سمن کو نیند آگئی۔

(۲۲)

شام ہوگئی۔ سمن نے دن بھر بٹھل داس کا انتظار کیا۔ لیکن وہ اب تک نہیں آئے۔ سمن کے دل میں جو وسوسے تھے وہ پورے ہوگئے۔ شاید اب وہ نہ آئیں گے۔ ضرور کوئی نہ کوئی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ یا تو وہ کسی دوسرے کام میں پھنس گئے۔ یا جن لوگوں نے امداد کا وعدہ کیا تھا۔ وہ دغا کر بیٹھے۔ مگر کچھ بھی ہو۔ انھیں ایک بار یہاں آنا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم ہوجاتا کہ کیا فیصلہ ہوا۔ اگر کوئی میری مدد نہیں کرتا۔ تو نہ کرے۔ میں اپنی مدد آپ کروں گی۔ بس صرف ایک بھلے آدمی کا سہارا چاہتی ہوں۔ کیا بٹھل داس سے اتنا بھی نہ

ہوگا؟ چلوں اُن سے ملوں۔ اور کہہ دوں کہ مجھے کسی سے مالی امداد کی خواہش نہیں۔ آپ خواہ مخواہ حیران نہ ہوں۔ صرف میرے رہنے کا انتظام کردیں اور مجھے کوئی ایسا کام بتادیں۔ جس سے روکھی روٹیوں کا سہارا ہوجائے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی لیکن معلوم نہیں وہ کہاں رہتے ہیں۔ ان کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکتی پھروں گی۔

کیوں نہ پارک کی طرف چلوں لوگ وہاں ہوا کھانے جایا کرتے ہیں۔ ممکن ہے اُن سے ملاقات ہوجائے۔ شرماجی بھی روز ادھر ہوا خوری کے لیے جایا کرتے ہیں۔ شاید انھیں سے ملاقات ہوجائے۔ اُنھیں یہ کنگن دے دوں گی اور اس حیلہ سے اس معاملہ کے متعلق کچھ بات چیت بھی ہوجائے گی۔

یہ ارادہ کرکے اُس نے ایک کرایہ کی بگھی منگوائی اور اکیلے بیٹھ کر گھر سے چلی۔ کھڑکیاں بند کردیں۔ جھلملیوں سے جھانکتی جاتی تھی۔ چھاؤنی کی طرف دور تک اِدھر اُدھر تاکتی چلی گئی۔ مگر نہ شرماجی نظر آئے۔ نہ بٹھل داس۔ ہاں سدن البتہ سامنے سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ سمن کا دل اُچھلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اِسے برسوں کے بعد دیکھا ہے۔ تبدیل مقام سے شاید محبت تازہ ہوجاتی ہے۔ جی میں آیا۔ کہ اُسے آواز دوں۔ لیکن اُس نے ضبط کیا۔ جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا۔ اُسے فخر آمیز محبت کی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ ایسا خوبروشکیل نوجوان مجھ پر فریفتہ ہے۔ یہ یقین دل پر ایک سرور کی کیفیت پیدا کررہا تھا۔ سدن کبھی اسے اِتنا حسین نہ نظر آیا تھا۔

بگھی کوئنس پارک کی طرف چلی۔ یہ پارک شہر سے دُور تھا بہت کم لوگ اِدھر آیا کرتے تھے۔ لیکن شرماجی کی تخیل پسندی اُنھیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ یہاں ہرے بھرے وسیع میدان میں ایک تکیہ دار بنچ پر بیٹھے دوگھنٹوں خیال میں ڈوبے بیٹھے رہتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ جوں ہی بگھی احاطہ میں داخل ہوئی۔ شرماجی سمن کو نظر آئے۔ اس کا دل شمع کی لو کی طرح تھرتھرانے لگا۔ خفت اور ندامت اسے پیچھے کھینچنے لگی۔ شاید اسے گھر پر اپنے دل کی اس کیفیت کا گمان ہوتا۔ تو وہ یہاں تک آہی نہ سکتی ۔ لیکن اتنی دور آکر اور شرماجی کو سامنے دیکھ کر اب ناکام لوٹ جانا حماقت تھی۔ اس نے دل کو مضبوط کیا۔ اور بگھی سے اُتر کر شرماجی کی طرف چلی۔ اس طرح جیسے آواز ہوا کے مخالف سمت میں چلتی ہے۔

شرماجی حیرت سے بگھی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے پہلے سمن کو پہچانا نہیں تعجب ہورہا تھا کہ یہ کون عورت اِدھر چلی آتی ہے! خیال گزرا کہ کوئی عیسائی لیڈی ہوگی۔ لیکن جب سمن قریب آگئی۔ تو انھوں نے اُسے پہچانا۔ ایک بار اُس کی طرف دبی ہوئی نگاہوں سے دیکھا پھر جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے جب وہ سر جھکائے ہوئے اُن کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ تو وہ جھینپتی ہوئی بیکس نظروں سے اِدھر اُدھر تاکنے لگے گویا چھپنے کے لیے کسی بلِ کی تلاش کررہے ہیں۔ تب دفعتاً وہ اُٹھے اور پیچھے کی طرف پھر کر تیزی کے ساتھ قدم بڑھایا۔ سمن سناٹے میں آگئی۔ وہ کیا امیدیں لے کر آئی تھی۔ اور کیا آنکھوں سے دیکھ رہی تھی!

اُف! یہ مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ میرے سایہ سے بھی گریز ہے۔ وہ ارادت جو شرماجی کی طرف سے اُس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ دم زدن میں غائب ہوگئی۔ بولی میں آپ ہی سے کچھ کہنے آئی ہوں، ذرا ٹھہریے مجھ پر اتنی عنایت کیجیے۔

شرماجی نے قدم اور تیز کیے۔ جیسے کوئی بھوت سے بھاگے۔ سمن سے یہ بے التفاتی نہ سہی گئی تیز ہوکر بولی۔ میں آپ سے کچھ مانگنے نہیں آئی ہوں کہ آپ اتنا ڈر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ کنگن دینے آئی ہوں۔ یہ لیجیے۔ اب میں خود چلی جاتی ہوں۔

یہ کہہ کر اُس نے کنگن نکالا اور شرماجی کی طرف پھینک دیا۔ شرماجی اب ٹھٹکے زمین پر پڑے ہوئے کنگن کو دیکھا پہچان گئے۔ سبھدرا کا کنگن تھا۔ سمن اپنی بگھی کی طرف کئی قدم جاچکی تھی۔ لپک کر اس کے قریب آئے اور بولے۔ ''تمھیں یہ کنگن کہاں مِلا؟''

سمن نے بے التفاتی سے کہا۔ ''اگر میں آپ کی باتیں نہ سنوں اور مُنہ پھیر کر چلی جاؤں تو آپ کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔''

شرماجی۔ سمن بائی مجھے شرمندہ مت کرو۔ میں تمھارے سامنے منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔

سمن۔ کیوں؟

شرما۔ میرے دل میں باربار یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس موقع پر میں نے تمھیں اپنے گھر سے چلے جانے کے لیے نہ کہا ہوتا۔ تو ہرگز یہ نوبت نہ آتی۔

سمن۔ تو اس کے لیے آپ اس قدر نادم کیوں ہیں۔ اپنے گھر سے نکال کر آپ نے مجھ

پر احسان کیا۔ میری زندگی سدھاردی۔ مجھے بنادیا۔

شرماجی۔ اس ضرب سے تلملا گئے بولے۔"اگر یہ احسان ہے تو بٹھل داس اور گجادھر پرشاد کا ہے۔ میں ایسے احسان کا فخر نہیں چاہتا۔

سمن۔ آپ نیکی کر اور دریا میں ڈال والی مثل پر چلیں۔ پر میں تو دل میں آپ کا احسان مانتی ہوں۔ شرماجی ۔ زبان نہ کھلوائیے دل کی بات دل میں ہی رہنے دیجیے۔ یہ سب میری تقدیر میں لکھا ہوا تھا۔ لیکن آپ جیسے پاک منش آدمی سے مجھے ایسی بے مروتی کی امید نہ تھی۔ آپ چاہے سمجھتے ہوں کہ عزت اور ہوس کی قدر بڑے آدمیوں کو ہوتی ہے لیکن نیچ آدمیوں کو اِس کی ہوس اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کے پاس اس کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا وہ اس کے لیے دغا فریب بے ایمانی سب کچھ کر بیٹھتے ہیں۔ عزت میں وہ راحت ہوتی ہے۔ جو عیش اور دولت میں بھی نہیں ہوتی۔ مجھے ہمیشہ یہ ہوس بے چین کرتی رہتی تھی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتی تھی کہ کیونکر اِسے پاؤں۔ اس کا جواب مجھے کتنی ہی بار ملا لیکن آپ کے ہولی والے جلسہ کے دن جو جواب ملا اس نے میرے سب شبہے دُور کردیے۔ مجھے عزت اوز قدر کا راستہ دکھادیا۔ اگر میں اس جلسہ میں نہ آتی تو شاید آج میں اپنے جھونپڑے میں مگن ہوتی۔ آپ کو میں دیوتا سمجھتی تھی اس لیے آپ کی زندہ دلی کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ بھولی بائی آپ کے روبروشان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ اس کے سامنے مجسم اخلاق بنے ہوئے تھے۔ آپ کے احباب اس کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے تھے ایک سادہ لوح عزت و تعظیم کی بھوکی عورت پر اس نظارہ کا جو اثر ہوسکتا تھا۔ وہی مجھ پر بھی ہوا۔ پر اب اُن باتوں کا ذکر ہی کیا جو ہوا وہ ہوا۔ آپ کو کیوں الزام دوں یہ سب میرا نوشتہ تقدیر تھا۔ میں...... سمن کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن شرماجی نے جو اس تقریر کو بڑی متین دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ بات کاٹ دی اور پوچھا۔ سمن یہ سب باتیں مجھے شرمندہ کرنے کے لیے کہہ رہی ہو یا سچّی ہیں۔

سمن۔ کہتی تو آپ کو شرمندہ کرنے ہی کے لیے ہوں۔ پرباتیں سچی ہیں۔ اِن باتوں کو میں نے عرصہ ہوا بھلا دیا تھا۔ اگر آپ نے اس وقت اتنی بے رُخی نہ کی ہوتی۔ تو شاید وہ پھر میری زبان پر نہ آتیں۔ لیکن اب میں خود پچھتاتی ہوں۔ کہ ناحق گڑے مُردے اُکھاڑے ۔ مجھے معاف کیجیے۔

شرماجی نے سر نہ اُٹھایا۔ خیال میں ڈوب گئے۔ سمن اُن کے احسان کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ لیکن سلسلۂ تقریر کچھ ایسا پلٹا۔ کہ اسے اس کا موقعہ ہی نہ ملا اور اب اتنی دل آزاری کے بعد اسے شکریہ اور احسان کا ذکر بے موقع معلوم ہوا۔ وہ اپنی بگھی کی طرف چلی ۔ کہ یکایک شرماجی نے پوچھا۔"اور یہ کنگن؟"

سمن۔ یہ مجھے کل ایک صراف کی دکان پر دکھائی دیا۔ میں نے اسے بہوجی کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ پہچان گئی۔ وہاں سے اُٹھا لائی۔

شرما۔ کیا قیمت دینی پڑی؟

سمن۔ کچھ نہیں۔ اُلٹے صراف پر اور دھونس جمادی۔

شرما۔ صراف کا نام بتاسکتی ہو؟

سمن۔ جی نہیں۔ زبان دے آئی ہوں۔

یہ کہہ کر سمن چلی گئی۔ شرماجی کچھ دیر تک توبیٹھے رہے۔ پھر بنچ پر لیٹ گئے۔ سمن کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ وہ اس وقت تخیلات میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے۔ اگر کوئی اُن کے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا۔ تو بھی اُنھیں خبر نہ ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کلیجہ پر کوئی چوٹ لگ گئی ہے۔ وہ سریع الحس آدمی تھے۔ سبھدرا اگر شکررنجی میں کوئی لگتی ہوئی بات کہہ دیتی۔ تو انھیں ہفتوں اختلاج قلب ہوتا رہتا تھا۔انھیں اپنی طرز زندگی پر اپنے اطوار پر۔ خیالات پر۔ فرض شناسی پر غرور تھا۔ آج وہ غرور ریزہ ریزہ ہوگیا۔ جس الزام کو انھوں نے گجادھر اور بٹھل داس کے سرمنڈھ کر اپنے دل کو تسکین دی تھی۔ وہی الزام آج سوگنے بوجھ کے ساتھ اُن کے سرپر لدگیا۔ اب سر ہلانے کی بھی جگہ نہ تھی وہ اس بارگراں کے نیچے دبے جاتے تھے۔ تخیلات نے تصور کو جگہ دی۔ تصور نے واہمہ پیدا کیا۔ کہیں بہت دُور سے کان میں آواز آئی۔ "وہ جلسہ نہ ہوتا تو آج میں اپنے جھونپڑے میں مگن ہوتی۔"

اِتنے میں ہوا چلی۔ پتیاں ہلنے لگیں۔ گویا کالے درخت سر ہلاہلاکر کہتے تھے۔"سمن کی یہ دُرگت تم نے کی ہے۔"

شرماجی گھبراکر اُٹھے۔ سامنے گرجا گھر کی اونچی چوٹی تھی۔ اس میں گھنٹہ بج رہا تھا۔ گھنٹہ کی سُریلی صدائیں کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

"سمن کی یہ دُرگت ۔تم۔ نے کی ہے۔" انھوں نے خیالات کو بزور سمیٹ کر آگے قدم بڑھایا۔ آسمان پر نگاہ پڑی۔ سیاہ کاغذ پر سفید۔ روشن چمکتے ہوئے حروف میں لکھا ہوا تھا "سمن کی یہ دُرگت تم نے کی۔"

جیسے کسی چٹیل میدان میں سامنے سے اُمڈی ہوئی کالی گھٹا کو دیکھ کر مسافر دُور کے اکیلے درخت کی طرف قدم بڑھائے ہوئے چلتا ہے۔ اس طرح شرماجی بھی لمبے لمبے قدم اُٹھائے ہوئے آبادی کی طرف چلے۔ لیکن تصورات کو کہاں چھوڑتے۔ سمن اُن کے پیچھے پیچھے آتی تھی کبھی کبھی سامنے آکر راستہ روک لیتی۔ اور کہتی۔"میری یہ درگت تم نے کی ہے۔" کبھی اُس پہلو سے کبھی اِس پہلو سے سامنے سے نکل آتی۔ اور یہی الفاظ دُہراتی شرماجی چپکے چلے آتے تھے۔ جیسے کوئی جگر کا مضبوط آدمی پیچھا کرنے والے کتوں کے سامنے دوڑتا نہیں۔ صرف انھیں ڈانتا ہوا قدم بڑھاتا ہے۔ بارے بہ ہزار مشکل یہ راستہ طے ہوا۔ شرماجی گھر آئے اور کمرے میں منہ ڈھانپ کر سورہے۔ سوبھدرا نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ تو اُسے سردرد کا بہانہ کرکے ٹالا۔ ساری رات سمن ان کے دل میں بیٹھی ہوئی انھیں کوستی رہی۔ تم کو اپنے علم و عمل پر ناز ہے۔ لیکن تم پھونس کے جھونپڑوں کے پاس بارود کی ہوائیاں اور پھل جھڑیاں چھوڑتے ہو۔ اگر تم اپنی دولت کو پھونکنا چاہتے ہو۔ تو جاکر آبادی سے دُور کسی میدان میں پھونکو۔ غریب دکھیاروں کا دل کیوں جلاتے ہو؟ اُنھیں کیوں اُجاڑتے ہو؟"

اگر تمھارے پاس پیسے ہیں۔ تو شوق سے مٹھائیاں کھاؤ۔ لیکن دیکھو تمھارے سامنے ایک بیکس یتیم کھڑا ہے۔ اس کی نگاہ کا خیال رکھو۔ اُسے للچاؤ مت اگر اُسے دے نہیں سکتے تو اس سے آنکھیں بچا جاؤ۔

علی الصبّاح شرماجی بٹھل داس کے مکان پر جا پہنچے۔

(۲۳)

سبھدرا کو شام کے وقت کنگن کی یاد آئی۔ لپکی ہوئی غسل خانہ میں گئی۔ خوب یاد تھا۔ کہ یہیں طاق پر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کا وہاں پتہ نہ تھا۔ تب گھبرائی۔ اپنے کمرہ میں ہر ایک طاق اور الماری کو دیکھا۔ رسوئیں کے گھر میں جاکر چاروں طرف ڈھونڈا۔ گھبراہٹ اور

بھی بڑھی پھر تو اُس نے ایک ایک صندوق۔ ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ گویا کوئی سوئی کھوگئی ہے۔ لیکن کہیں سُراغ نہ ملا۔ مہری سے پوچھا۔ اُس نے بیٹے کی قسم کھاکر کہا۔ میں نہیں جانتی جیتن کو بلاکر پوچھا اُس نے کہا۔"مالکن بڑھاپے مین یہ داگ مت لگاؤ۔ ساری عمر بھلے آدمیوں کی گلامی میں کٹی ہے۔ کبھی نیت بد نہیں ہوئی۔ اب کے دن کے واسطے نیت بگاڑوں گا۔" سبھدرا مایوس ہوگئی۔ اب کس سے پوچھے؟ جی نہ مانا۔ پھر صندوق۔ کپڑے کی گٹھریاں وغیرہ کھول کھول دیکھیں۔آٹے والی کی ہانڈیاں بھی نہ چھوڑیں۔ پانی کے گھڑوں اور مٹکوں میں ہاتھ ڈال ڈال کے ٹٹولا۔ تب ہراس ہوکر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اُس نے سدن کو غسل خانہ میں جاتے دیکھا تھا۔ خیال آیا کہ شاید اس نے مذاقاً چھپا رکھا ہو۔ لیکن اس سے پوچھنے کی ہمّت نہ پڑی۔ سوچا کہ شرماجی گھر میں کھانا کھانے آئیں گے، تو اُن سے کہوں گی۔ جوں ہی شرماجی آئے۔ اُس نے انھیں اطلاع دی۔ شرماجی نے بے پروائی سے کہا۔ اچھّی طرح دیکھو ۔ گھر ہی میں ہوگا۔لے کون جائے گا۔

سبھدرا۔ گھر کی تو ایک ایک اُنگل زمین چھان ڈالی۔

شرماجی۔ نوکروں سے پوچھا؟

سبھدرا۔ سب سے پوچھا۔ دونوں قسمیں کھاتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے اُسے غسل خانہ میں طاق پر رکھ دیا تھا۔

شرماجی۔ کیا اُس کے پَر لگے تھے جو آپ ہی آپ اُڑ گیا!

سبھدرا۔ نوکروں پر تو میرا شبہ نہیں۔

شرماجی۔ تو دوسرا کون لے جائے گا؟

سبھدرا۔ کہو تو سدن سے پوچھوں۔ میں نے انھیں کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔ شاید دل لگی سے چھپا رکھا ہو۔

شرماجی۔ تمھاری بھی کیا سمجھ ہے! اس نے چھپایا ہوتا تو کہہ نہ دیتا۔

سبھدرا۔ تو پوچھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ سوچتا ہو۔ خوب حیران کرلوں تب بتاؤں۔

شرماجی۔ ہرج کیوں نہیں ہے۔ کہیں اُس نے نہ دیکھا ہو۔ تو سمجھے گا مجھے چوری لگاتی ہیں۔

سبھدرا۔ غسل خانہ میں تو وہ گئے تھے۔ میں نے خود دیکھا۔

شرما۔ تو وہ تمھارا کنگن اُٹھانے گئے تھے۔ بے بات کی بات کرتی ہو اُس سے بھول کر بھی

نہ پوچھنا۔ اوّل تو وہ لے ہی نہ گیا ہوگا۔ اور لے گیا ہوگا تو آج نہیں کل دے گا۔ جلدی کیا ہے؟"

سبھدرا۔ تمھارا سا جگر کہاں سے لاؤں۔ میرا تو دل بیٹھا جاتاہے۔ تسکین تو ہوجائے گی۔

شرماجی۔ نہیں اُس سے ہرگز نہ پوچھنا۔

سبھدرا اس وقت تو خاموش ہوگئی۔ لیکن رات کو جب دونوں چچا بھتیجے کھانا کھانے بیٹھے۔ تو سبھدرا سے نہ رہا گیا۔ بولی۔"للو۔ میرا کنگن نہیں مِلتا چھپا رکھا ہو تو دے دو۔ کیوں حیران کرتے ہو؟"سدن کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ چوری ضروری کی تھی۔ مگر پہلا سابقہ تھا سینہ زوری کا سبق نہ پڑھا تھا۔ منہ میں لقمہ تھا۔ اُسے چبانا بھول گیا۔ اس طرح اَن سُنی کرگیا۔ گویا سُنا ہی نہیں۔شرماجی نے سبھدرا کی طرف ایسی پُرقہر نگاہوں سے دیکھا۔ کہ اس کی روح فنا ہوگئی۔دوبارہ زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سدن نے بھی جلد جلد دوچار نوالے کھائے اور چوکے سے اُٹھ گیا۔شرماجی بولے۔"تمھاری یہ کیا عادت ہے کہ میں جس کام کو منع کرتا ہوں۔ وہ خواہ مخواہ کرتی ہو۔"

سبھدرا۔ تم نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ وہی لے گئے ہیں۔ اگر خلاف نکل جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔

شرماجی۔ یہ قیافہ شناسی کب سے سیکھی؟

سبھدرا۔ اُن کی صورت سے صاف معلوم ہوتا تھا۔

شرماجی۔ اچھا مان لیا۔ وہی لے گئے تو؟ کنگن کی کیا حقیقت ہے۔ میرا تو یہ جسم اُسی کا پروردہ ہے۔ وہ اگر میری جان بھی مانگے تو مجھے دینے میں دریغ نہ ہو۔ میرا سب کچھ اس کا ہے چاہے مانگ کرلے جائے۔ یا بلا مانگے، اُٹھا لے جائے۔

سبھدرا چڑھ کر بولی۔ تو تم نے غلامی لکھائی ہے۔ غلامی کرو۔ میری چیز کوئی اُٹھا لے جائے گا۔ تو مجھے صبر نہ ہوگا۔

دوسرے دن شام کو شرماجی سیر کرکے لوٹے تو بیوی کے سامنے کنگن پھینک دیا۔ سبھدرا نے دوڑکر کنگن اُٹھا لیا۔ اور تعجب سے بولی۔"کہاں مِل گیا؟"

شرماجی۔ کہیں مل گیا۔ تمھیں اپنی چیز سے مطلب ہے یا اور کچھ؟

سبھدرا۔ میں نے کہا نہ تھا۔ کہ سدن نے چھپا رکھا ہوگا۔ نکلی نہ وہی بات۔

شرما جی۔ پُھر وہی بے سر پیر کی بات کرنے لگیں۔ میں نے اسے بازار میں ایک صراف کی دُکان پر پایا ہے۔ تم نے سدن پر الزام لگاکے اُسے بھی شرمندہ کیا۔ اور خود بھی شرمندہ ہوئیں۔

(۲۴)

بٹھل داس کو شبہ ہوا۔ کہ سمن تیس روپیہ ماہوار پر رضامند نہیں ہے۔ اس لیے اُس نے کل جواب دینے کا بہانہ کرکے مجھے ٹالا ہے۔ وہ دوسرے دن اس کے پاس گئے۔ اسی فکر میں تھے کہ باقی روپیوں کا کیا انتظام کروں۔ کبھی سوچتے دوسرے شہروں میں وفد لے کر جاؤں۔ کبھی ناٹک کھیلنے کا ارادہ کرتے۔ اگر ان کا بس چلتا تو شہر کے دولتمندوں کو کسی جہاز میں بھر کر کالا پانی بھیج دیتے۔ شہر میں کنورانرُدھ سنگھ ایک فیاض اور وضعدار آدمی تھے۔ لیکن بٹھل داس ان کے دروازہ تک جاکر صرف اس لیے لوٹ آئے کہ اُنھیں وہاں طبلے کی گمک سُنائی دی۔ دل میں سوچا۔ جو شخص عیش میں اس قدر ڈوبا ہے۔ وہ میری مدد کیا خاک کرے گا۔ اس وقت ان کی مدد کرنا ان کی نگاہ میں سب سے بڑا ثواب۔ اور ان پر تعریض کرنا سب سے بڑا گناہ تھا۔ وہ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے۔ کہ سمن کے پاس چلوں۔ یا نہ چلوں۔ کہ پنڈت پدم سنگھ آئے ہوئے دکھائی دیے، ان کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ اور چہرہ اُترا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں فکر اور خفت کی زندہ مورت بنے ہوئے تھے۔ تین مہینے سے بٹھل داس ان کے پاس نہیں گئے تھے۔ لیکن شرماجی کی یہ حالت دیکھتے ہی پگھل گئے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بولے۔"بھائی صاحب بہت متفکر نظر آتے ہو۔ خیریت تو ہے۔"

پدم سنگھ۔ جی ہاں سب خیریت ہے۔ ادھر مہینوں سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی ملنے کو جی چاہتا تھا۔ سمن کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟

بٹھل داس۔ اس اُلجھن میں تو پڑا ہوا ہوں۔ اتنا بڑا شہر ہے مگر تیس روپے ماہوار کا انتظام بھی نہیں ہوسکتا۔ مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ مجھے حُسنِ طلب کا شعور نہیں۔ تالیف قلب کرنا نہیں جانتا میں دوسروں کو الزام دیتاہوں۔ پر فی الواقع خطا میری ہی ہے۔ ابھی تک صرف دس روپیوں کا مستقل انتظام ہوسکا ہے۔ ایک سے ایک لکھ پتی پڑے ہیں۔ پردل کے پتھر۔ اجی رئیسوں کی بات الگ رہی۔ پربھاکرراؤ نے بھی سوکھا جواب دے دیا۔ ان کی تحریر

کو دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ دل سوز وگداز کا بحر بیکراں ہے۔ ہولی کے جلسے کے بعد آپ پر مہینوں زہر اُگلتے رہے۔ لیکن آج ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا۔ کیا قوم کا سب سے بڑا قرض دار میں ہی ہوں؟ میرے پاس قلم ہے۔ اس سے قوم کی خدمت کرتا ہوں۔ جس کے پاس دولت ہو۔ دولت سے کرے۔ ان کی باتیں سُن کر دنگ رہ گیا۔ آج کل ایک نیا مکان بنوا رہے ہیں۔ کوئلہ کی کمپنی میں بھی حصے خریدے ہیں۔ لیکن اس کارِ خیر میں صاف نکل گئے۔ ابی اور لوگ تو ذرا شرماتے بھی ہیں۔ اُنھوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

شرما جی۔ آپ کو یقین ہے کہ سمن پچاس روپیہ ماہوار پر بدھوا آشرم میں جانے پر راضی ہو جائے گی؟

بٹھل داس ۔ جی ہاں۔ مجھے کامل یقین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُسے کمیٹی لینا منظور نہ کرے۔

شرما جی۔ اچھا تو لیجیے میں آج آپ کی فکروں کا خاتمہ کیے دیتا ہوں تا زیست پچاس روپیہ ماہوار دیتا رہوں گا۔

بٹھل داس نے حیرت آمیز تشکر کے انداز سے دیکھا۔ چہرہ شگفتہ ہو گیا اُچھل کر شرما جی کے گلے سے لپٹ گئے۔ اور بولے۔"آفریں باد برین ہمّت مردانہ تو۔ بھائی صاحب اس وقت آپ نے وہ کام کیا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ آپ کے پیروں پر سر رکھ روؤں۔ آپ نے ہندو قوم کی لاج رکھ لی۔ اور سارے لکھ پتیوں کے منہ میں کالکھ لگا دی۔ لیکن اتنا بوجھ سنبھالیے گا کیوں کر۔"

پدم سنگھ۔ ایشور کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہی کریں گے۔

بٹھل داس۔ آج کل بازار گرم ہے کیا؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ کرہ زمہریر سے بھی زیادہ سرد، گھوڑا گاڑی بیچ دوں گا تیس روپیہ کی بچت یوں ہو جائے گی۔ بجلی کا خرچ توڑ دوں گا۔ دس روپیہ یوں نکل آئیں گے۔ اور دس روپیہ اِدھر اُدھر سے کھینچ کھانچ کر نکال لوں گا۔

بٹھل داس۔ تنہا آپ کے اوپر اتنا زبردست بوجھ ڈالتے ہوئے مجھے رنج ہوتا ہے۔ پر کیا کروں۔ رؤساء شہر سے پریشان ہوں۔ لیکن گاڑی بک جائے گی تو آپ کو روز کرایہ کی گاڑی پر کچہری جانا پڑے گا۔

پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ کرایہ کی گاڑی کی ضرورت نہ پڑے گی۔ میرے بھتیجے نے ایک سبزہ گھوڑا لے رکھا ہے۔ اس پر بیٹھ کر چلا جایا کروں گا۔

بٹھل داس۔ وہی تو نہیں۔ جو شام کو کبھی کبھی چوک میں دکھائی دیا کرتا ہے۔

پدم سنگھ۔ ممکن ہے۔

بٹھل داس۔ صورت آپ سے بہت ملتی ہے۔ سُرخ وسفید۔ خوش رو۔ گٹھیلے بدن کا نوجوان بڑی بڑی آنکھیں ہیں؟

پدم سنگھ۔ جی ہاں حلیہ تو آپ ٹھیک بتاتے ہیں۔ وہی ہے۔

بٹھل داس۔ آپ اُسے بازار میں گھومنے سے روکتے کیوں نہیں؟

پدم سنگھ۔ مجھے کیا خبر کہاں گھومنے جاتا ہے۔ ممکن ہے۔ کبھی کبھی بازار کی طرف بھی چلا جاتا ہو۔ لیکن اطوار کا صاف ہے۔ اس لیے مجھے کبھی اندیشہ نہیں ہوا۔

بٹھل داس ۔ یہ آپ سے سخت غلطی ہوئی۔ پہلے وہ کتنا ہی نیک اطوار رہا ہو۔ لیکن آج کل اس کے طور اچھے نہیں۔ میں نے اُسے ایک بار نہیں کئی بار وہاں دیکھا ہے۔ جہاں نہ دیکھنا چاہیے تھا۔ وہ سمن کے دامِ محبت میں گرفتار معلوم ہوتا ہے۔

پدم سنگھ کے ہوش اُڑگئے۔ بولے۔"یہ تو آپ نے بُری خبر سُنائی۔ وہ میرے خاندان کا چراغ ہے۔ اگر اُس نے یہ وطیرہ اختیار کیا۔ تو میری جان پر بن جائے گی۔ میں شرم کے مارے بھائی صاحب کو منہ نہ دکھاسکوں گا۔"

یہ کہتے کہتے شرماجی کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ پھر بولے۔"اُسے آپ کسی طرح سمجھائیے بھائی صاحب کے کانوں میں بھنک بھی پڑگئی۔ تو وہ میری صورت سے بیزار ہوجائیں گے۔

بٹھل داس۔ نہیں اُسے سیدھے راستہ پر لانے کی کوشش کی جائے گی مجھے اب تک معلوم ہی نہ تھا۔ کہ وہ آپ کا لڑکا ہے۔ آج ہی سے اُس کے پیچھے پڑجاؤں گا۔ اور اگر کل تک سمن وہاں سے چلی آئی تو وہ خود بخود سنبھل جائے گا۔

پدم سنگھ۔ سمن کے چلے جانے سے بازار تھوڑے ہی خالی ہوجائے گا۔ کسی دوسرے کے دام میں جا پھنسے گا۔ کیا کروں اُسے گھر بھیج دوں؟

بٹھل داس ۔ گھر پر تو وہ اب رہ چکا۔ پہلے تو جائے گا ہی نہیں۔ اور اگر گیا بھی تو

دوسرے ہی دن چلا آئے گا۔ جوانی کا چسکا بُرا ہوتا ہے۔ کچھ نہیں یہ سب اسی طلسم حُسن کی برکت ہے۔ جس نے شہر کے بہترین مقامات کا احاطہ کررکھا ہے۔ بجائے اس کے کہ ترغیبات نظروں سے پوشیدہ رکھی جائیں۔ ہم ان کی دکان سجاتے ہیں۔ اپنے بھولے بھالے سادہ لوح نوجوانوں کے لیے گڈھے کھودتے ہیں۔ اُن کے سوئے ہوئے جذبات کو جگاتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بیہودہ رواج کیوں کر پڑا۔ جہاں کتب خانے اور اخلاقی تحریکات کے مرکز ہونے چاہئیں۔ وہاں ہم حُسن کا بازار سجاتے ہیں۔ افسوس!

پدم سنگھ۔ آپ نے اس بارے میں کچھ تحریک تو کی تھی؟

بٹھل داس ۔ جی ہاں کی تو تھی۔ لیکن جس طرح آپ زبانی ہمدردی کر کے خاموش ہوگئے اُسی طرح دوسروں نے بھی آناکانی کی۔ تو جناب اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑسکتا میرے پاس نہ ثروت ہے نہ علم ہے۔ نہ رسوخ ہے۔ میری کون سنتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں سودائی ہے شہر میں اتنے لائق۔ تعلیم یافتہ حضرات ہیں۔ سب چین کی نیند سوتے ہیں۔ کوئی بھول کر بھی میری نہیں سنتا۔

پدم سنگھ کی طبیعت اس وقت آہن گرم تھی۔ یہ چوٹ کارگر ہوگئی۔ بولے اگر میں آپ کے کسی کام میں آسکوں تو میری خدمات آپ کے نذر ہیں۔ یہ پہلے کا سا خشک وعدہ نہیں ہے۔ دل سے کہتا ہوں۔ بٹھل داس خوشی سے اُچھل پڑے بولے۔"بھئی اگر تم میرا ہاتھ بٹاؤ۔ تو میں زمین اور آسمان ایک کردوں۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ آپ کے ارادے مضبوط نہیں ہوتے۔ ابھی تو آپ اتنے سرگرم ہیں۔ لیکن کل تک یہ جوش فرو ہوجائے گا۔ ایسے کاموں میں استقلال کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔"

پدم سنگھ نادم ہوکر بولے۔"ایشور چاہیں گے تو اب کے آپ کو اس کی شکایت نہ رہے گی۔"

بٹھل داس۔ اگر آپ اتنے مضبوط ہیں۔ تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔

پدم سنگھ۔ مجھے نہ بولنا آتا ہے۔ نہ لکھنا آتا ہے۔ بس آپ جس راستہ پرلگادیں گے اسی پر آنکھیں بند کیے چلا جاؤں گا۔

بٹھل داس ۔ یہ سب باتیں پیدا ہوجائیں گی۔ صرف درد چاہیے۔ مضبوط ارادہ ہَوا میں قلعے بنا دیتا ہے۔ آپ کی تقریروں میں تو وہ جادو ہوجائے گا کہ لوگ سُن کر دنگ ہوجائیں گے

ہاں پہلے جگر خوب مضبوط کر لیجیے۔ ناکامیوں سے گھبرانے کی سند نہیں۔
پدم سنگھ۔ آپ مجھے سنبھالتے رہیے گا۔
بٹھل داس۔ اچھا تو اب میرے مقاصد بھی سُن لیجیے۔ تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میرا پہلا مقصد ہے۔ ارباب نشاط کو شہر کے ممتاز مقامات اور شاہراہوں سے ہٹانا اور دوسرا رقص وسرود کی مذموم رسم کو مٹانا آپ کو اس میں کوئی اعتراض ہے؟
پدم سنگھ۔ مطلق نہیں۔
بٹھل داس۔ ناچ کے متعلق آپ کے دل میں پہلے کے سے خیال تو نہیں ہیں۔
پدم سنگھ۔ اب کیا ایک گھر جلاکر پھر وہی کھیل کھیلتا رہوں گا۔ اُن دنوں مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔ مجھے اب یقین ہوگیا ہے۔ کہ اُس جلسہ نے سمن بائی کو گھر سے نکالا۔ لیکن یہاں مجھے ایک شبہ ہوتا ہے۔ آخر ہم لوگوں نے بھی تو شہروں ہی میں اتنی عمر بسر کی ہے۔ ہم لوگ ان بداثرات سے کیوں کر محفوظ رہے؟ ناچ بھی شہروں میں آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں پر اُن سے ایسے خانہ برانداز نتائج پیدا ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں انسان کے ذاتی میلان اور عادت کو خاص دخل ہے۔ آپ اس تحریک سے کسی کا مزاج تو نہیں بدل سکتے؟
بٹھل داس۔ ہمارا یہ منشا ہی نہیں۔ ہم تو محض ان حالات کی اصلاح چاہتے ہیں۔ جو نفس بد کی معین ہیں۔ اور کچھ نہیں۔ کچھ آدمی خلقتاً موٹے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے مقوّیات کی ضرورت نہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو پرہیز اور مقویّات کے استعمال سے توانا ہوجاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ لاغر اور نحیف رہتے ہیں۔ وہ چاہے گھی کے مٹکے میں رکھ دیے جائیں۔ تو بھی تنومند نہ ہوں گے۔ ہماری غرض صرف دوسرے قسم کے آدمیوں سے ہے۔ جو پرہیز اور مقویّات کے استعمال سے فائدہ اُٹھاسکتے ہیں۔ اور دُنیا میں انھیں کی تعداد زیادہ ہے۔

(۲۵)

سُمن پارک سے لوٹی تو اُسے افسوس ہونے لگا کہ میں نے پدم سنگھ سے ایسی دل آزار باتیں کیوں کیں۔ انھوں نے اتنی فیاضی سے میری معاونت کی۔ اُس کا میں نے یہ بدلہ دیا۔ اپنی نادانی کا الزام ان کے سر منڈھا۔ دُنیا میں گھر گھر ناچ گانا ہوا ہی کرتا ہے۔ چھوٹے

بڑے امیر غریب۔ سب دیکھتے ہیں اور لطف اُٹھاتے ہیں۔ اگر ترغیبِ نفس کے باعث آگ میں کود پڑی تو اس میں شرماجی یا کسی اور کی کیا خطا؟ بابو بٹھل داس شہر کے سبھی رئیسوں کے پاس گئے۔ کیا وہ ان سیٹھوں کے پاس نہ گئے ہوں گے۔ جو یہاں آیا کرتے ہیں۔ لیکن کسی نے ان کی بات بھی نہ پوچھی۔ کیوں؟ اسی لیے نہ کہ وہ نہیں چاہتے کہ میں اس عذاب سے نجات پاؤں۔ میرے چلے جانے سے اُن کے عیش میں خلل پڑے گا۔ وہ ایک بے رحم صیاد کی طرح دل کو زخمی کرکے میرے تڑپنے کا مزہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ صرف ایک ہی ایسا جواں مرد ہے۔ جس نے مجھے اس تاریک غار سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اور اُسی کی میں نے اتنی تحقیر کی۔ وہ مجھے کتنا احسان فراموش سمجھتے ہوں گے! وہ مجھے دیکھتے ہی کیسے بھاگے! مناسب تو یہ تھا۔ کہ میں شرم سے وہیں گڑ جاتی۔ لیکن اس احتراز کے لیے میں نے اتنی بے شرمی سے اُن کی توہین کرنی شروع کی۔ صیاد جب کسی طائر کو اپنے دام میں پھنستے نہیں دیکھتا۔ تو اُسے اس پر کتنا غصہ آتا ہے! لڑکا جب کوئی ناپاک چیز چھولیتا ہے۔ تو وہ دوسرے لڑکوں کو دوڑا دوڑا کر چھونا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ بھی ناپاک ہوجائیں۔ کیا میں بھی بے درد صیاد ہوں یا طفل نادان!

کسی مصنّف سے پوچھیے۔ کہ وہ ایک سخن فہم نقاد کی حرف گیریوں کے مقابلہ میں نافہم عوام کی تحسین کی کیا حقیقت سمجھتا ہے۔ سمن کو اس وقت شرماجی کا احتراز عشاق کی شریں کلامیوں سے کہیں زیادہ مرغوب معلوم ہوتا تھا۔

رات بھر وہ انھیں خیالات میں غرق رہی۔ مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ کہ صبح بٹھل داس کے پاس چلوں گی۔ اور اُن سے کہوں گی۔ کہ میرا ٹھکانہ کیجیے۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی۔ صرف ایک محفوظ جگہ چاہتی ہوں۔ میں چکی پیسوں گی۔ کپڑے سیوں گی اور کسی طرح اپنا گزر بسر کرلوں گی!

سویرا ہوا۔ وہ اُٹھی اور بٹھل داس کے مکان پر چلنے کی تیاری کرنے لگی۔ کہ اتنے میں وہ خود ہی آپہنچے۔ سمن کو ایسی مسرت ہوئی جیسے کسی طالب کو اپنا مطلوب مل جائے۔ بولی۔ ”آیئے جناب! میں تو کل سارے دن آپ کا انتظار کرتی رہی۔ اس وقت آپ ہی کے یہاں جانے کو تیار ہورہی تھی۔“

بٹھل۔ کل کئی وجوہ سے نہ آسکا۔

سمن۔ تو اب میرے رہنے کا کوئی انتظام کیا؟
بٹھل۔ مجھ سے تو کچھ نہ ہو سکا۔ لیکن پدم سنگھ نے لاج رکھ لی۔ وہ ابھی میرے پاس آئے تھے۔ اور وعدہ کر گئے ہیں۔ کہ تازیست پچاس روپیہ ماہوار دیتا رہوں گا۔
سمن کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ شرماجی کے کریمانہ ایثار نے اس کے دل کو حسنِ ارادت اور پاکیزہ محبّت سے لبریز کردیا۔ اُسے اپنے سخن ہائے درشت پر حد درجہ ملال ہوا۔ بولی۔"شرماجی رحم اور سخاوت کے دریا ہیں۔ میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ کہ اس نیکی کا شکریہ ادا کر سکوں۔ پرماتما انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ میں ہمیشہ اُن کی ممنون رہوں گی۔ لیکن میں نے آپ سے جو شرطیں کی تھیں۔ وہ محض امتحاناً کی تھیں۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ سچ مچ میری دست گیری کرنی چاہتے ہیں۔ یا محض زبانی ہمدردی اور قومی حمیت کا سوانگ بھر رہے ہیں۔ اب مجھ پر روشن ہوگیا۔ کہ آپ دونوں صاحب فرشتہ صفت انسان ہیں۔ اب میں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ میں ہمدردی حمایت کی بھوکی تھی۔ وہ مجھے میسّر ہو گئی۔ اب میں اپنی معاش کی فکر آپ کرلوں گی۔ آپ صرف میرے لیے مکان کا انتظام کردیں۔ جہاں میں عافیت سے زندگی بسر کرسکوں۔
بٹھل داس حیرت میں آگئے۔ قومی غرور سے آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یہی پاک سرزمین ہے۔ جہاں حیا فروش عورتوں کے خیالات بھی اتنے وسیع ہوئے ہیں۔ بولے۔"سمن تمھارے منہ سے ایسے پاکیزہ الفاظ سن کر مجھے اس وقت جو خوشی ہو رہی ہے۔ وہ بیان نہیں کر سکتا لیکن روپیوں کے بغیر تمھارا گزر کیوں کر ہوگا۔
سمن۔ مزدوری کروں گی۔ اس ملک میں ہزاروں مصیبت کی ماری عورتیں ہیں۔ ایشور کے سوا ان کا اور کون مددگار ہے؟ میں اپنی اور بے شرمی کا خراج آپ سے نہ لوں گی۔
بٹھل داس۔ تم سے وہ تکلیفیں سہی جائیں گی؟
سمن۔ سب کچھ سہ لوں گی۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ بے شرمی سب مصیبتوں اور تکلیفوں سے زیادہ جگردوز ہوتی ہے۔ اور تکلیفوں سے جسم کو ایذا پہنچتی ہے اس تکلیف سے روح کا خون ہوجاتا ہے۔ میں پرماتما کی شکرگزار ہوں۔ کہ اُس نے آپ لوگوں کو میری مدد کے لیے بھیج دیا۔
بٹھل۔ سمن تم فی الواقع دیوی ہو۔

سمن۔ تو میں یہاں سے کب چلو؟
بٹھل۔ آج ہی ابھی میں نے آشرم کی کمیٹی میں تمھارے داخلہ کی تجویز نہیں پیش کی ہے۔ لیکن کوئی ہرج نہیں ہے۔ تم وہاں چل کر ٹھہرو۔ اگر کمیٹی کچھ اعتراض کرے گی تو دیکھا جائے گا۔ ہاں اتنا یاد رکھنا کہ اپنے متعلق کسی سے کچھ مت کہنا نہیں تو بدھواؤں میں ہلچل مچ جائے گی۔
سمن۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ میں ہر طرح راضی ہوں۔
بٹھل۔ شام کو چلنا ہوگا۔
بٹھل داس کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد دوحوریں سمن سے ملنے آئیں۔ سمن نے کہہ دیا میرے سر میں درد ہے۔ سمن اپنا کھانا اپنے ہی ہاتھوں سے پکاتی تھی۔ رسوم کے دھاگے اخلاق کی زنجیروں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ آج اِس نے روزہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ رہائی کے دن قیدیوں کو بھی کھانا اچھا نہیں لگتا۔
دوپہر کو ڈھاڑیوں کا غول آپہنچا۔ سمن نے انھیں بھی بہانہ کرکے دفان کیا۔ اُسے اب ان کی صورت سے نفرت ہوتی تھی۔ سہ پہر کو سیٹھ بلبھدرداس کے یہاں سے ناگپوری سنتروں کی ایک ٹوکری آئی۔ سمن نے اُسے فوراً واپس کردیا۔ چار بجے چمن لال نے اپنی فٹن سمن کے سیر کرنے کو بھیجی۔ اُس نے اُسے بھی لوٹا دیا۔
تنویرِ صبح کے وقت خلقت پر زندہ دلی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ طیور شاخوں پر پھدکتے ہیں۔ بچھرے کلیلیں کرتے ہیں۔ آج سمن کی شبِ تاریک تنویر تھی۔ اس پر بھی شوخی و شرارت کا ایک جنون سوار ہوا۔ اس نے سگریٹ کی ایک ڈبیا منگوائی۔ وارنش کی ایک بوتل منگاکر طاق پر رکھدی۔ اور ایک کرسی کا ایک پایہ توڑکر اُسے دیوار کے سہارے کھڑا کردیا۔ پانچ بجتے بجتے منشی ابوالوفا تشریف لائے یہ حضرت سگریٹ کے بڑے شوقین تھے۔ سمن نے آج معمول سے زیادہ تپاک کیا۔ اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولی آیئے آج آپ کو وہ سگریٹ پلاؤں کہ آپ بھی یاد کریں۔
ابوالوفا۔ نیکی اور پوچھ، پوچھ۔
سمن۔ دیکھیے ایک انگریزی دُکان سے خاص آپ کی خاطر منگوایا ہے۔ یہ لیجیے۔
ابوالوفا۔ تب تو میں بھی اپنا شمار خوش نصیبوں میں کرنے لگا واہ رے میں اور واہ رے

میرے سوز جگر کی تاثیر!

ابوالوفا نے سگریٹ مُنہ میں دبایا۔ سمن نے دیاسلائی کی ڈبیا نکال کر ایک جلائی ابوالوفا نے سگریٹ جلانے کے لیے منہ آگے بڑھایا۔ لیکن نہ معلوم کیوں کر آگ سگرٹ میں نہ لگ کر اُن کی ریشِ ابلق میں جا لگی۔ جیسے پیال جلتا ہے اُسی طرح دم زدن میں نصف سے زیادہ داڑھی خاکستر ہوگئی انھوں نے سگریٹ پھینک کر دونوں ہاتھوں سے داڑھی کو ملنا شروع کیا آگ بجھ گئی۔ مگر ریش کا صفایا ہوگیا تھا۔ لپک کر آئینہ میں منہ دیکھا۔ موء سوختہ کی باقیات صالح اُبالے ہوئے بھٹے کے ریشوں کی طرح نظر آتی تھیں۔

سمن نے اندازندامت سے کہا"میرے ہاتھ میں آگ لگے کہاں سے کہاں میں نے دیاسلائی جلائی۔"

اُس نے بہت ضبط کیا۔ مگر ہنسی ہوٹوں پر آہی گئی۔ ابوالوفا ایسے کھسیائے ہوئے تھے۔ چہرے سے ایسی بیکسی ٹپکتی تھی گویا اب ان کا سا بدنصیب انسان دُنیاں میں نہ ہوگا۔ سمن کا مسکرانا قہر ہوگیا۔ خفت پر غصہ نے اور بھی جلاکردی ۔ بولے آپ نے یہ کب کی کسر نکالی؟

سمن نے بہت ہی معذرت آمیز لہجہ میں کہا منشی جی میں سچ کہتی ہوں یہ دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے جان بوجھ کر شرارت کی ہو آپ سے مجھے کوئی شکایت بھی ہوتو غریب داڑھی نے میرا کیا بگاڑاتھا۔

ابوالوفا۔ معشوقوں کی خوش فعلیاں اچھی لگتی ہیں۔ لیکن نہ اتنی کہ وہ منہ ہی جُھلس دیں اگر تم نے انگارے سے سارا جسم داغ دیا ہوتا۔ تو اس سے بہتر تھا اب یہ جُھلسا ہوا مُنہ لے کر میں کہاں جاؤں گا۔ واللہ آج تم نے ملیامیٹ کردیا۔

سمن۔ کیا کروں خود پچھتا رہی ہوں۔اگر میرے داڑھی ہوتی تو فوراً آپ کے نذر کردیتی کیوں نقلی داڑھیاں بھی تو ملتی ہیں؟

ابوالوفا۔ سمن زخم پر نمک نہ چھڑکو۔ اگر کسی غیر نے یہ حرکت کی ہوتی تو اُسے مزہ چکھا دیتا۔

سمن۔ ارے تو تھوڑے سے بال ہی جل گئے یا کچھ اور؟ مہینہ دومہینہ میں پھر نکل آئیں گے۔ ذرا سی بات کے لیے آپ ناحق اس قدر ہائے ہائے مچارہے ہیں۔

ابوالوفا۔ جلاؤ مت جی نہیں تو میری زبان سے کچھ نکل جائے گا۔ میں اس وقت آپے میں

نہیں ہوں۔

سمن ۔ افوہ ذراسی داڑھی پر اتنا جامہ سے باہر ہوگئے۔ مان لیجیے میں نے جان بوجھ کر آپ کی داڑھی میں آگ لگادی تو؟ آپ میرے دین کو۔ ایمان کو۔ دل کو روز جلاتے ہیں۔ کیا ان کی قیمت آپ کی داڑھی سے بھی کم ہے؟ میاں عاشق بننا منہ کا نوالہ نہیں ہے۔ جائیے اپنے گھر کی راہ لیجیے۔ مجھے ایسے چھچھورے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے۔

ابوالوفا نے نِگاہ غضب سے سمن کو دیکھا۔ تب جیب سے رومال نکال کر اپنی نیم سوختہ داڑھی کو چھپائے ہوئے چُپکے سے نیچے چلے گئے۔ یہ وہی ذات شریف ہیں جسے کھلے بازار میں ایک رقاصہ کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تھی۔

اب سدن کے آنے کا وقت آیا۔ سمن آج اُس سے ملنے کے لیے بہت بیتاب تھی۔ آج آخری ملاقات ہوگی۔ آج داستانِ الفت ختم ہوجائے گی۔ وہ پیاری، پیاری صورت پھر نہ دِکھائی دے گی۔ اُس کے دیدار کو آنکھیں ترس ترس رہ جائیں گی۔ اس کے سچے جذبات میں ڈوبی ہوئی شوق اور الفت کی کہانی سُننے میں نہ آئے گی۔ زندگی پھر خشک۔ بے مزہ ہوجائے گی۔ ناجائز سہی پر یہ تعلق سچا تھا۔ ایشور! مجھے یہ صدمہ فراق برداشت کرنے کی طاقت دے۔ اس وقت سدن نہ آئے۔ تو بہت اچھا ہو۔ اُس کے نہ آنے ہی میں میری بہتری ہے۔ کون جانے اس کے سامنے میرا ارادہ قائم رہے۔ یا نہ رہے۔ لیکن وہ آجاتا تو ایک بار اس سے دل کھول کر باتیں کرلیتی۔ اُسے اس دریائے معصیت میں ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کرتی۔

دفعتاً سمن نے بٹھل داس کو ایک کرایہ کی گاڑی میں سے اترتے دیکھا۔ اس کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔ ایک لحہ میں بٹھل داس اوپر آگئے اور بولے "ارے! ابھی تو تم نے کوئی تیاری نہیں کی؟"

سمن۔ میں تیار ہوں۔

بٹھل۔ ابھی بسترے تک تو بندھے نہیں؟

سمن۔ یہاں کی کوئی چیز ساتھ نہ لے جاؤں گی۔ دراصل یہ میرا نیا جنم ہورہاہے۔

بٹھل۔ یہ سامان اور اسباب کیا ہوگا؟

سمن۔ آپ اِسے بیچ کر کسی کارِ خیر میں صرف کر دیجیے۔

بٹھل۔ اچھی بات ہے لیکن میں یہاں تالا لگادوں گا۔ تو اب اُٹھو گاڑی موجود ہے۔

سمن۔ دس بجے سے پہلے میں نہیں چل سکتی ۔ آج مجھے اپنے عشاق سے بِدا ہونا ہے کچھ ان کی سننا ہے کچھ اپنی کہنا ہے۔ آپ تب تک چھت پر جاکر بیٹھیے۔ مجھے تیار ہی سمجھیے۔

بٹھل داس کو ناگوار معلوم ہوا۔ پر ضبط سے کام لیا۔ اوپر جاکر کُھلی چھت پر ٹہلنے لگا۔

سات بج گئے۔ لیکن سدن نہ آیا۔ آٹھ بجے تک سمن نے اُس کا انتظار کیا۔ تب مایوس ہوگئی۔ جب سے اُس نے یہاں آمدورفت شروع کی تھی ۔ آج ناغہ کا پہلا اتفاق تھا سمن کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی بیابان میں کھوگئی ہے۔ دل میں ایک نہایت پُر خلش مگر میٹھا پُر درد مگر بامزہ ۔ ولولہ اشتیاق اُمڈا ہوا تھا۔ باربار یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آج وہ کیوں نہیں آیا۔ خدانخواستہ کوئی سانحہ تو نہیں ہوگا۔ اِس خیال سے وہ کانپ اُٹھی۔

آٹھ بجے سیٹھ چمن لال جلوہ افروز ہوئے۔ سمن ان کی گاڑی دیکھتے ہی چھجے پر جابیٹھی سیٹھ جی بڑی مشکل سے اوپر آئے اور ہانپتے ہوئے بولے کہاں ہو دیوی جی؟ آج فٹن کیوں لوٹادی کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی کیا؟

سمن۔ یہیں چھجے پر چلے آیئے اندر کچھ گرمی معلوم ہوتی ہے۔ آج سر میں درد تھا سیر کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

چمن لال۔ ہیرا کو میرے یہاں کیوں نہ بھیج دیا حکیم صاحب سے کوئی نسخہ تیار کرادیتا۔اُن کے پاس تیلوں کے اچھے اچھے نسخے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے سیٹھ جی کرسی پر بیٹھے لیکن تین ٹانگوں کی کرسی اُلٹ گئی سیٹھ کا سر نیچے ہوا پیر اوپر اور وہ ایک گھاس کے تودے کی طرح اوندھے لیٹ گئے صرف ایک بار منہ سے نکالا ارے! اور پھر کچھ نہ بولے۔ مادّہ روح پر غالب آگیا۔

سمن کو خوف ہوا کہ چوٹ زیادہ آگئی لیکن لالٹین لے کر دیکھا تو ہنسی نہ رُک سکی سیٹھ جی ایسے بے حس و حرکت پڑے تھے گویا پہاڑ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ پڑے، پڑے بولے" ہائے رام کمر ٹوٹ گئی۔ جرا میرے سائیس کو بُلادو گھر جاؤں گا۔"

سمن۔ چوٹ بہت آگئی کیا؟ آپ نے بھی تو کرسی کھینچ لی دیوار سے ٹیک کر بیٹھتے تو ہرگز نہ گرتے۔ اچھا معاف کیجیے مجھی سے غلطی ہوئی کہ آپ کو ہوشیار نہ کردیا۔ لیکن آپ ذرا

بھی نہ سنبھلے۔ بس گر ہی پڑے۔
چمن لال۔ میری تو کمر ٹوٹ گئی۔ اور تمھیں مسخری سُوجھ رہی ہے۔
سمن۔ تو اس میں میری کیا خطا ہے۔ اگر ہلکے ہوتے تو اُٹھا کر بٹھادیتی۔ ذرا خود ہی زور لگایئے ابھی اُٹھ جایئے گا۔
چمن لال۔ اب میرا گھر پہنچنا مشکل ہے۔ کس بُری ساعت میں چلا تھا۔ جینہ پر سے اُترنے میں پوری سامت ہوجائے گی یہ تم نے کب کا بیر نکالا؟
سمن۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔
چمن۔ اجی رہنے بھی دو جھوٹ موٹ باتیں بناتی ہو تم نے مجھے جان کر گرایا؟
سمن۔ کیا آپ سے مجھے کوئی بیر تھا اور آپ سے کوئی بیر ہو بھی تو آپ کی بیچاری کمر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟
چمن۔ اب یہاں آنے پر لانت ہے۔
سمن۔ سیٹھ جی آپ اتنی جلد ناراض ہوگئے۔ مان لیجیے میں نے جان بوجھ کر ہی آپ کو گرادیا تو کیا ہوا۔ کیا معشوق کی اتنی شوخی بھی منظور نہیں؟

اتنے میں بٹھل داس اوپر سے اُتر آئے اُنھیں دیکھتے ہی سیٹھ جی کا چہرہ زرد ہوگیا۔ گھڑوں پانی پڑگیا۔

بٹھل داس نے ہنسی کو روک کر پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے آپھنسے؟ مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"
چمن۔ بھائی صاحب اس وقت نہ بولو۔ پھر کبھی یہاں آؤں۔ تو مجھ پر لانت ہے۔ مجھے کسی طرح یہاں سے نیچے پہنچایئے۔

بٹھل داس نے ایک ہاتھ پکڑا سمن نے دوسرا ہاتھ تھاما۔ سائیس نے آکر کمر پکڑی۔ اِس طرح لوگوں نے انھیں بہزار خرابی زینے سے نیچے اُتارا اور لاکر گاڑی میں لٹادیا۔

اوپر آکر بٹھل داس نے کہا۔ گاڑی والا ابھی تک کھڑا ہے۔ دس بج گئے۔ اب دیر نہ کرو۔
سمن ۔ ابھی ایک کام اور کرنا ہے۔ پنڈت دینا ناتھ آتے ہوں گے۔ بس اِن سے اور نبٹ لوں۔ آپ ایک منٹ اور تکلیف کیجیے۔

بٹھل داس اوپر جاکر بیٹھے ہی تھے۔ کہ پنڈت دینا ناتھ آ پہنچے۔ بنارسی صافا سر پر تھا۔ بدن پر ایک اچکن ۔ کالے کنارے کی مہین دھوتی اور کالی وارنش کے پمپ شوز ان کے گورے جسم پر خوب کھلتے تھے۔

سمن نے کہا "آیئے مہاراج چرن چھوتی ہوں"۔

دینا ناتھ۔ آشیرباد۔ جوانی بڑھے۔ آنکھ کے اندھے۔ گانٹھ کے پورے پھنسیں۔ دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی رہو۔

سمن ۔ کل آپ کیوں نہیں آئے۔ آدھی رات تک ساجیوں کو بٹھائے آپ کی راہ دیکھتی رہی۔

دینا ناتھ۔ کچھ نہ پوچھو۔ کل ایک جھمیلے میں پھنس گیا۔ ڈاکٹر شیاماچرن اور پربھاکرراؤ ایک سوراجیہ کی سبھا میں گھسیٹ لے گئے وہاں گھنٹوں بکبک ہوتی رہی۔ مجھ سے لوگوں نے کہا آپ بھی کچھ فرمایئے۔ میں نے کہا مجھے کوئی اُلو سمجھا ہے کیا؟ کسی طرح گلا چھڑا کر چمپت ہوا۔

سمن۔ کئی دِن ہوئے میں نے آپ سے کہا تھا۔ کیواڑوں میں وارنش لگوا دیجیے۔ آپ نے کہا وارنش کہیں ملتی ہی نہیں۔ یہ دیکھیے ۔ آج میں نے ایک بوتل وارنش منگوا رکھی ہے۔ کل اِسے ضرور لگوا دیجیے۔

پنڈت دینا ناتھ مسند لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اِن کے سر ہی پر وہ طاق تھا جس پر وارنش کی بوتل رکھی تھی۔ سمن نے بوتل اُٹھائی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں کر بوتل کا پینِدا الگ ہوگیا۔ اور پنڈت جی وارنش سے شرابور ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا شیرے کی ناند میں پھسل پڑے ہیں ۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور صافا اُتار کر رومال سے پوچھنے لگے۔ سمن بولی معلوم نہیں بوتل ٹوٹی ہوئی تھی کیا۔ ساری وارنش خراب ہوگئی۔

دیناناتھ۔ تمھیں اپنی وارنش کی پڑی ہے یہاں سارے کپڑے تر ہوگئے اب گھر تک پہنچنا مشکل ہے۔

سمن۔ رات کو کون دیکھتا ہے۔ چپکے سے نکل جایئے گا۔

دیناناتھ۔ اجی رہنے بھی دو سارے کپڑے ہمارے ستیاناس کردیے اب باتیں بناتی ہو۔ یہ دھل بھی تو نہیں سکتی۔

سمن۔ تو کیا میں نے جان بوجھ کر گرادی؟
دیناناتھ۔ تمھارے اندر کا حال کون جانے؟
سمن ۔ اچھا جائیے جان کر ہی گرادی ہاں نہیں تو۔
دینا ناتھ۔ ارے تو میں کچھ کہتا ہوں جی چاہے تو اور گرادو۔
سمن ۔ بہت ہوگا اپنے کپڑوں کی قیمت لے لیجیے گا۔
دینا ناتھ۔ کیوں خفا ہورہی ہو، سرکار میں تو کہہ رہاہوں گرادیا اچھا کیا۔
سمن۔ اس طرح بولتے ہیں گویا میرے ساتھ بڑی رعایت کررہے ہیں۔
دینا ناتھ۔ سمن۔ کیوں شرمندہ کرتی ہو۔
سمن۔ ذرا کپڑے خراب ہوگئے اِس پر آپ جامہ سے باہر ہوگئے۔ یہی آپ کی محبّت ہے۔ جس کے افسانے سنتے سنتے کان بھرگئے۔ آج اُس کی قلعی کھل گئی۔ جادو سر پر چڑھ کر بولا آپ نے اچھے وقت مجھے خبردار کردیا۔ اب ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لیجیے۔ یہاں پھر نہ تشریف لائیے گا۔ مجھے آپ جیسے میاں مٹھوؤں کی ضرورت نہیں۔
بٹھل داس اوپر بیٹھے ہوئے یہ تماشے دیکھ رہے تھے۔ سمجھ گئے کہ اب تماشا ختم ہوگیا۔ نیچے اُتر آئے دینا ناتھ نے چونک کر ایک بار انھیں دیکھا اور چھڑی اُٹھاکر بہ سرعت تمام وہاں سے نیچے چلے گئے۔
تھوڑی دیر کے بعد سمن اوپر سے اتری وہ صرف ایک سادہ سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ اُس کا چہرہ اُداس تھا۔ لیکن اس لیے نہیں کہ سامانِ عیش اس سے چھوٹ رہا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اس آتشیں غار میں گری کیوں تھی۔ اس اُداسی میں حسرت نہیں۔ ہمت تھی۔ یہ کسی شرابی کے چہرے پر چھانے والی زردی نہ تھی یہ وہ زردی تھی جو شادی کے وقت دولھے اور دُلھن کے چہرے پر چھاجاتی ہے۔ جس میں ساری زندگی کے نیک ارادے اور آنے والی ذمہ داریوں کی فکریں پوشیدہ رہتی ہیں۔
بٹھل داس نے دروازہ پر قفل لگادیا اور کوچ بکس پر جا بیٹھے گاڑی چلی۔
بازار کی دُکانیں بند ہوگئی تھیں لیکن راستہ جاری تھا سمن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اُسے لالٹینوں کی ایک روشن قطار نظر آئی لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی تھی ۔ وہ قطار بھی بڑھتی جاتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دور پر لالٹینیں ملتی تھیں۔ پر وہ جگمگاتی نورانی قطار

آرزوں کی طرح دور ہی بھاگتی جاتی تھی۔ گاڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ سمن کی کشتیٔ حیات بھی بحر خیال میں ہلتی ڈگمگاتی تاروں کے سنہرے جال میں اُلجھتی تیزی سے چلی جاتی تھی۔

(۲۶)

سدن صبح کو اندر گیا تو اپنی چچی کے ہاتھوں میں کنگن دیکھا شرم سے اُس کی آنکھیں زمین میں گڑگئیں۔ ناشتہ کرکے جلدی سے باہر نکل آیا۔ اور سوچنے لگا کہ کنگن انھیں کیسے مِل گیا؟

کیا ممکن ہے کہ سمن نے اِسے یہاں بھیج دیا ہو؟ وہ کیا جانتی ہے کہ کنگن کِس کا ہے؟ میں نے تو اسے اپنا پتہ بھی نہیں بتلایا۔ کیا عجب ہے یہ اِسی نمونہ کا دوسرا کنگن ہو۔ لیکن اتنی جلد اس کا تیار ہونا قیاس میں نہیں آتا۔ ضرور سمن نے یہ پتہ لگالیا ہوگا اور چچی کے پاس کنگن بھیج دیا ہے۔

سدن نے بہت دیر تک اس مسئلہ کو غور کیا۔ لیکن ہربار وہ اِسی نتیجہ پر پہنچتا تھا۔ اچھا مان لیاجائے کہ سمن کو میرا پتہ معلوم ہی ہوگیا۔ تو کیا یہ مناسب تھا کہ وہ میرے تحفے کو یہاں بھیج دیتی یہ تو ایک قسم کی دغا ہے۔ اگر فی الواقع وہ میرے حالات سے واقف ہوگئی ہے تو وہ مجھے دل میں مکار۔ شعبدہ باز۔ جھوٹا سمجھتی ہوگی کنگن کو چچی کے پاس بھیج کر اس نے یہ ثابت کردیا کہ وہ مجھے چور بھی سمجھتی ہے۔

آج شام کو سدن سمن کے پاس جانے کی ہمت نہ کرسکا۔ چور اور دغاباز بن کر اب اُس کے پاس کیوں کر جائے؟ اس کا دل بہت افسردہ تھا۔ گھر پر بیٹھنا برا معلوم ہوتا تھا۔ کہیں اور جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ طوعاً و کرہاً دل پر ضبط کیے چارپائی پر پڑا رہا سمن کے پاس جانے کا ارادہ ترک کردیا۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ ہردم سمن سے ملنے کے لیے بیتاب رہتا۔ شکوک اس اشتیاق کے نیچے دبتے جاتے تھے۔ شام کو اس کی حالت دیوانوں کی سی ہوجاتی جیسے بیماری کے بعد آدمی کا جی اُداس رہتا ہے۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا اُٹھنا بیٹھنا پہاڑ ہوجاتا ہے۔ جہاں بیٹھتا ہے۔ وہیں کا ہوجاتاہے۔ وہ کیفیت اس وقت سدن کی تھی۔

بالآخر اس کے ہاتھ سے صبر کی عنان چھوٹ گئی۔ آٹھویں دن اُس سے کسی طرح ضبط نہ ہوسکا۔ اُس نے گھوڑا کھنچوایا۔ اور سمن سے ملنے چلا۔ اس نے فیصلہ کرلیاتھا۔ کہ آج

چل کر اپنا سارا کچا چٹھا سنادوں گا۔ جس سے محبّت ہوگئی۔ اس سے اب کیا پردہ؟ ہاتھ جوڑ کر کہوں گا۔ سرکار بڑا ہوں تو، بھلاہوں تو ، اب تو آپ کا عاشق زار ہوں۔ جو سزا چاہے دو۔ سر تمھارے سامنے جھکا ہوا ہے۔ چوری کی۔ یا دغا کی۔ سب تمھاری محبّت کے لیے کی۔ اب معاف کرو۔

وہ بے قرار ہوکر پانچ ہی بجے گھر سے نکل پڑا۔ اور گھومتا ہوا ندی کے کنارے جاپہنچا ہَوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے خوش گوار جھونکے اس کے دلِ سوزاں پر مرہم کا کام کرنے لگے۔ ندی کی شفاف، نیلگوں اور سنہری دھارا میں اُچھلتی ہوئی مچھلیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا کسی نازنین کی چنچل آنکھیں مہین گھونگٹ میں چمکتی ہوں۔

سدن گھوڑے سے اُتر کر ایک کرار پر بیٹھ گیا۔ اور اس نظارۂ دل کش کی بہار لوٹنے لگا ۔ دفعتاً اُس نے ایک جٹا دھاری سادھو کو درختوں کی آڑ سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے گلے میں رودراکش کی مالا تھی۔ اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ عارفانہ جلال کی بجائے اس کے چہرہ سے ایک قسم کی سادگی اور ملائمت نمودار تھی۔ قریب دیکھ کر سدن اُٹھا اور ان کی تعظیم کی۔

سادھو نے اس بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ گویا پُرانی ملاقات ہے۔ اور بولا ”سدن میں کئی دن سے تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تمھاری بھلائی کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سمن بائی کے پاس آنا جانا چھوڑ دو۔ ورنہ تباہ ہوجاؤ گے۔ تم نہیں جانتے وہ کون ہے پریم کے نشہ میں تمھیں اس کے عیب نہیں نظر آتے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ تم پر فریفتہ ہے۔ مگر یہ تمھاری نادانی ہے۔ جس نے اپنے شوہر سے دغا کی۔ وہ دوسروں سے کیا پریم نبھا سکتی ہے۔ تم اس وقت غالباً وہیں جارہے ہو۔ لیکن ایک سادھو کی بات مانو۔ لوٹ جاؤ۔ اسی میں تمھاری خیریت ہے“۔

یہ کہہ کر وہ مہاتما جدھر سے آئے تھے۔ اُسی طرف چلے گئے۔ اور قبل اس کے سدن اُن سے کچھ استفسار حال کرسکے۔ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

سدن سوچنے لگا یہ مہاتما کون ہیں؟ یہ مجھے کیوں کر جان گئے؟ میرے پوشیدہ حالات کا انھیں کیوں کر علم ہوا؟ کچھ اس جگہ کی خموشی کچھ اپنے دل کے اضطراب کچھ مہاتما کے ناگہانی ظہور اور کچھ اُن کی کشفِ باطن نے اُن کی باتوں کو ندائے غیب کی وقعت دے دی۔

اس کا دل کسی آنے والی بلائے ناگہانی کے خوف سے تھرّا اُٹھا سمن کے پاس جانے کی ہمت نہ پڑی وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اور اس تعجب انگیز واقعہ کی تنقیح کرتا ہوا گھر کی طرف چلا۔

جب سے سبھدرا نے سدن پر اپنے کنگن کی بابت شبہ کیا تھا۔تب سے شرماجی بیوی سے ناراض ہوگئے تھے۔ اُس تنگ دلی سے انھیں بہت ملال ہوا تھا۔ اندر بہت کم جاتے اس لیے سبھدرا کا جی یہاں نہ لگتا تھا۔ شرماجی بھی اس فکر میں تھے۔ کہ سدن کو کسی طرح یہاں سے ہٹادیں۔ اور سدن خود بھی یہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اُس کی دل بستگی کی اب کوئی صورت نہ تھی ۔ لیکن کوئی بھی اس امر کے متعلق زبان نہ کھول سکتا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے اس کے دوسرے ہی دن پنڈت مدن سنگھ کے یہاں سے ایک خط آگیا۔ اُس نے ہرایک کی منشا پوری کردی۔ لکھا تھا سدن کی شادی کی بات چیت ہورہی ہے اُسے دُلہن جی کے ساتھ یہاں بھیج دو۔

سبھدرا یہ خبر پاکر بہت خوش ہوئی۔ سوچنے لگی مہینہ دو مہینہ چہل پہل رہے گی ۔ گانا بجانا ہوگا۔ چین سے دن کٹیں گے۔ قفس میں پڑے پڑے دَم گھٹ گیا۔ اس شوق کو وہ دل میں چھپا نہ سکی۔ شرماجی اُس کی سرد مہری پر اور بھی ملول ہوگئے دل میں کہا۔"اسے اپنی خوشی کے سامنے میرا کچھ بھی خیال نہیں ہے۔ اب کہیں مہینوں میں ملاقات ہوگی۔ لیکن یہ کیسی خوش ہے۔ گویا پڑی ہوئی دولت مل گئی!"

سدن نے بھی چلنے کی تیاری کردی ۔ شرماجی کو اندیشہ تھا۔ کہ وہ حیلہ حوالہ کرے گا پر ایسا نہ ہوا۔

اس وقت آٹھ بجے تھے۔ دو بجے دن کو گاڑی جاتی تھی۔ اس لیے شرماجی کچہری نہ گئے۔ کئی بار عذر تقصیر کے ارادہ سے گھر میں گئے۔ لیکن سوبھدرا کو اُن سے مخاطب ہونے کی فرصت نہ تھی۔ وہ اپنے گہنے کپڑے اور کنگھی چوٹی میں مگن تھی۔ کچھ گہنے کھٹائی میں پڑے تھے۔ کچھ صاف کیے جارہے تھے۔ پاندان مانجا جارہاتھا۔ پڑوس کی کئی مستورات بیٹھی ہوئی تھیں۔ سبھدرا نے آج خوشی کے مارے کھانا بھی نہیں کھایا۔ پوریاں بناکر شرماجی اور سدن کے لیے باہر ہی بھیج دی تھیں۔

آخر ایک بجا جیتن نے گاڑی لاکر دروازے پر کھڑی کردی۔ سدن نے اپنے ٹرنک اور

بستر وغیرہ رکھ دیے۔ اُس وقت سبھدرا کو شرماجی کی یاد آئی ۔مہری سے بولی ذرا دیکھ تو کہاں ہیں۔ بلالا۔ اُس نے آکر باہر دیکھا۔ کمرہ میں جھانکا نیچے جاکر دیکھا شرماجی کا پتہ نہ تھا۔ سبھدرا تاڑ گئی ۔ شرماجی کی نازک مزاجی سے آگاہ تھی۔ بولی جب تک وہ نہ آئیں گے میں نہ جاؤں گی۔ شرماجی کہیں باہر نہ گئے تھے۔ اوپر چھت پر بیٹھے ہوئے تھے جب ایک بجے دیر ہوئی۔ اور سبھدرا گھر میں سے نہ نکلی تو وہ جھنجلا کر گھر میں گئے اور بولے۔"ابھی تک تم یہیں ہو؟ ایک کب کا بج گیا ہے؟"

سبھدرا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، چلتے چلتے شرماجی کی یہ ترشی اکھر گئی۔ شرماجی بھی اپنی ترش روئی پر نادم ہوئے۔ سبھدرا کے آنسو پونچھے۔ اُسے گلے لگایا اور گاڑی میں لاکر بیٹھا دیا اسٹیشن پر پہنچے۔ ریل تیار تھی۔ سدن دوڑکر گاڑی میں جا بیٹھا سبھدرا بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ گاڑی روانہ ہوگئی۔ وہ کھڑی کی کھڑی شرماجی کی طرف تاکتی رہی۔ اور جب تک وہ آنکھ سے اوجھل نہ ہوئے کھڑکی پر سے نہ ہٹی۔ چراغ جلتے جلتے یہ لوگ چنار پہنچ گئے۔ پنڈت مدن سنگھ اسٹیشن پر موجود تھے۔ سدن دوڑکر آداب بجالایا۔ اس نے اپنے والد کو اتنی تعظیم کی نگاہ سے کبھی نہ دیکھا تھا۔

جوں جوں گاؤں قریب آتا تھا۔ سدن کا اشتیاق زیادہ ہوتا جاتا تھا ۔ وہ سوچتا تھا اکھاڑے میں لوگ تال ٹھونک رہے ہوں گے۔ مجھے دیکھتے ہی چونک پڑیں گے۔ چاروں طرف سے لوگ مجھے دیکھنے آئیں گے۔ اماں دوڑی ہوئی آئیں گی۔ جب گاؤں صرف آدھ میل رہ گیا اور دھان کے کھیتوں سے گھوڑے کو دوڑانا مشکل معلوم ہوا۔ تو وہ اُتر پڑا۔ اور گھوڑا سائیس کے سپرد کرکے خود تیزی سے چلا۔ مگر جب گاؤں میں پہنچا تو اُسے چاروں طرف سناٹا معلوم ہوا۔ آٹھ بھی نہ بجے تھے۔ مگر زیادہ تر گھروں کے دروازے بند تھے سدن نے گھر میں آکر اپنی ماں کے قدموں پر سر جھکادیا۔ بھاما نے دعائیں دیں۔ اُسے چھاتی سے لگایا۔ اور پوچھا۔"وہ کہاں رہ گیئں؟"

سدن۔ آرہی ہیں ۔ میں سیدھے کھیتوں سے ہوکر چلا آیا۔

بھاما۔ چچا چچی سے جی بھر گیا نہ؟

سدن۔ کیوں؟

بھاما۔ وہ تو چہرہ ہی کہے دیتا ہے۔

سدن۔ واہ میں پہلے سے زیادہ موٹا ہو گیا ہوں۔

بھاما۔ چل جھوٹے چچی نے بھوکوں مارڈالا ہو گا۔

سدن۔ چچی ایسی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے مجھے خوب آرام سے رکھا۔

بھاما۔ تو روپے کیوں مانگے تھے؟

سدن۔ تمھاری محبّت کا امتحان لے رہا تھا۔ اتنے دنوں میں تم سے ۲۵ ہی روپے لیے نہ چچا صاحب سے سات سوروپے لے چکا۔ چارسو کا تو ایک گھوڑا ہی لیا۔ ریشمی کپڑے بنوائے۔ شہر میں رئیس بنا پھرتا رہا۔ سویرے چچی تازے حلوے بنادیتی تھیں۔ اُس پر سیر بھر دودھ تیسرے پہر میوے اور مٹھائیاں، میں نے جو چین کیے وہ کبھی نہ بھولیں گے میں نے بھی سوچا اپنی کمائی میں تو چین کرچکے۔ اس موقع پر کیوں چوکوں۔ سارے شوق پورے کرلیے۔ چچا صاحب بالکل دیوتا ہیں مجھے اب تک نہ معلوم تھا۔ کہ وہ مجھے اتنی محبت کرتے ہیں۔ میری ایک بھی درخواست انھوں نے نہیں ٹالی۔

بھاما کو ایسا معلوم ہوا کہ سدن کی باتوں میں کچھ اجنبیت کچھ شہریت آگئی ہے۔ ہاں اس کے دل میں سبھدرا اور پدم سنگھ کی طرف سے جو شکوک تھے وہ دُور ہوگئے۔ دوسرے دن گاؤں کے معززین جمع ہوئے۔ اور سدن کا ٹیکا ہوگیا۔ آہنی زنجیروں کی پہلی کڑی پیروں میں پڑگئی۔ مگر سدن اس وقت لطف محبت کے لیے ایسا دیوانہ ہورہاتھا کہ اس آہنی زنجیر کو دیکھ کر بھی وہ ذرا نہ جھجکا۔ سدن کو سمن بائی سے وہ محبت نہ تھی۔ جس میں استغناء کا شوخ رنگ ہوتا ہے وہ ادا نہ تھی جس میں جذبات کی کشش اور روح کا اتصال ہوجاتا ہے اس کی محبت میں شوق اور حظ نفس کا پہلو غالب تھا سمن کے دل میں جلوہ گزیں ہوکر بھی اس کے وجود کا جزوِ لازم نہ بن سکی تھی۔ اگر اس کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا تو وہ اس پر لٹا سکتا تھا اور اگر اس کے پاس سو جانیں ہوتیں تو وہ سب اس پر نثار کرسکتا تھا وہ اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اس کی نذر کرسکتا تھا۔ لیکن اپنے غموں میں اپنی ناکامیوں میں اسے ایک لمحہ کے لیے بھی شریک کرنے کا خیال نہ کرسکتا تھا وہ اس کے ساتھ عیش کا لطف اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن مصیبت کا لطف نہ اُٹھا سکتا تھا۔ سمن پر اُسے وہ اعتبار کامل کہاں تھا۔ جو محبت کی جان ہے؟ اُسے محسوس ہوا کہ مجھے یہاں وہ چیز ملے گی جو سمن کے یہاں کسی طرح نہ مل سکتی تھی، اب وہ محبت کی اصل صورت دیکھے گا اور اصلی صورت دکھائے گا۔ اب اسے

محبت کا بہروپ بھرنے کی ضرورت نہیں۔ان خیالات نے سدن کو اس نئی محبت کے لیے بیتاب کردیا اب اُسے صرف یہ اندیشہ رہا کہ کہیں بیوی حسین نہ ہوئی تو؟ حُسن صورت ایک فطری نعمت ہے ،جس میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا۔ حُسنِ سیرت کم وبیش ایک اکتسابی صفت ہے جس میں صحت اور تعلیم سے اصلاح ہوسکتی ہے۔ سدن نے اپنے ہمراز دوستوں کی معرفت سُسرال کے نائی سے اس معاملہ میں تحقیقات کی۔ نائی نے جو سراپا کھینچا وہ سمن سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ سدن کے دل میں جو آخری اندیشہ تھا وہ بھی رفع ہوگیا۔ اور وہ نویلی دُلہن کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

(پہلا حصہ ختم ہوا)

حصّہ دوم

(۱)

یہ کہنا غالباً صحیح نہیں ہے۔ کہ خدا سب کو کسی نہ کسی حیلہ سے رزق بھیجتا ہے۔ پنڈت اما ناتھ بغیر کسی حیلے کے دُنیا کی نعمتوں کا لطف اُٹھاتے تھے۔ ان کے گھر میں بھینسیں اور گائیں نہ تھیں۔ لیکن بچے دودھ کی کلیاں کرتے تھے۔ وہ کھیتی باڑی نہ کرتے تھے۔ لیکن گھر میں غلہ کا انبار لگا رہتا تھا۔ گاؤں میں کہیں مچھلی مرے۔ کہیں بکرا ذبح ہو۔ کہیں آم ٹوٹے کہیں بھوج ہو۔ پنڈت اما ناتھ کا حصہ بلا مانگے پوچھے آپ ہی آپ پہنچ جاتا تھا۔ امولا بہت بڑا موضع تھا۔ ڈھائی تین ہزار کی آبادی تھی۔ لیکن سارے گاؤں میں ان کے مشورہ اور مدد کے بغیر کوئی کام انجام نہ پاتا تھا۔ عورتوں کو اگر زیور بنوانے ہوتے تو وہ اما ناتھ سے کہتیں۔ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں اما ناتھ کی معرفت طے ہوتیں۔ رہن نامے و بیع نامے اما ناتھ ہی کی صلاح سے لکھے جاتے۔ معاملے، مقدمے انھیں کے توسل سے دائر ہوتے۔ اور طرہ یہ کہ ان کا یہ رسوخ اور وقار ان کی زمانہ سازی یا بھل منسی کی بدولت تھا۔ گاؤں والوں کے ساتھ ان کا برتاؤ خشک اور روکھا ہوتا تھا۔ ان کی زبان کی تلخی مشہور تھی۔ لیکن ان کی تلخیوں کو لوگ دودھ کی طرح پیتے تھے۔ معلوم نہیں ان کی شخصیت میں کیا راز۔ کیا جادو تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ یہ ان کا اقبال ہے۔ کوئی کہتا انھیں مہابیر کا ایشٹ ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ ان کی قیافہ شناسی کا نتیجہ تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ کہاں جھکنا اور کہاں تننا چاہیے۔ گاؤں والوں سے تننے میں اپنی بہبود سمجھتے تھے اور حکام سے جھکنے میں، تھانہ اور تحصیل کے عمال چپراسی سے لے کر افسر اعلیٰ تک سب ان پر مہربان تھے۔ تحصیلدار صاحب کے لیے وہ برش پھل بناتے۔ ڈپٹی صاحب کو آنے والی ترقی کی خبر دیتے تھے۔ قانون گو، قرق امین، اور سیاہہ نویس تو ان کے دروازہ پر بن بلائے مہمان بنے رہتے۔ کسی کو تعویذ لکھ دیتے اور کسی کو گنڈا کر دیتے۔ جن لوگوں کو ان ڈھکوسلوں پر اعتقاد نہ تھا، ان کی خاطر

نورتن چٹنی اور میٹھے اچار سے کرتے تھے۔ تھانہ دار صاحب انھیں اپنا داہنا بازو خیال کرتے تھے۔ جہاں ان کی دال نہ گلتی ہو، وہاں ان کی بدولت پانچوں انگلی گھی میں ہوجاتی تھیں۔ بھلا ایسے ہمہ صفت موصوف آدمی کی گاؤں والے کیوں نہ پوجا کرتے۔

اما ناتھ کو گنگا جلی سے بہت محبت تھی ۔ لیکن گنگا جلی کو میکے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوگیا۔ کہ بھائی کی محبت بھاوج کی سرد مہری کی تلافی نہیں کرسکتی۔ اما ناتھ بہن کو اپنے گھر لانے پر دل میں بہت پچھتائے۔ وہ بیوی کو خوش رکھنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملادیا کرتے تھے۔ گنگا جلی کو اب صاف کپڑے پہننے کا کیا حق ہے؟ شانتا کی پرورش پہلے چاہے کتنی ہی نازونعمت سے ہو۔ اب اسے اما ناتھ کی لڑکیوں سے برابری کرنے کا کیا مجال تھا۔ اما ناتھ بیوی کی ان کدورت آمیز باتوں کو سنتے اور ان کی تائید کرتے۔ گنگا جلی اپنے غصہ وغم کا بخار بھائی ہی پر اُتارتی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ یہ اپنی بیوی کو بڑھاوے دے کر میری یہ دُرگت کرارہے ہیں۔ یہ اگر اس کو سختی سے ڈانٹ دیتے تو مجال تھی۔ کہ وہ یوں میرے پیچھے پڑجاتی۔ اما ناتھ کو جب موقع ملتا۔ تو وہ گنگا جلی کو تخلیہ میں صورت حال کو سمجھا دیا کرتے۔ مگر ایک تو جانھوی ایسے موقع ہی نہ آنے دیتی۔ دوسرا گنگا جلی کو بھی ان کی بے اثر ہمدردی پر اعتبار نہ ہوتا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ گنگا جلی فکر غم اور یاس سے گھل گھل کر بیمار پڑگئی۔ اُسے بخار آنے لگا۔ اما ناتھ نے پہلے تو معمولی ادویات کا استعمال کرایا۔ لیکن جب اُن سے کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تب انھیں فکر ہوئی۔ ایک روز جانھوی کسی پڑوسن کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اما ناتھ بہن کے کمرہ میں گئے۔ وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ بسترا چیتھڑا ہورہا تھا۔ ساڑی پھٹ کر تار تار ہوگئی تھی۔ شانتا اس کے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ یہ دردناک نظارہ دیکھ کر اما ناتھ رو پڑے۔ یہی عورت ہے جس کی خدمت کے لیے دو دو لونڈیاں تھیں۔ آج اس کی یہ حالت ہورہی ہے۔ انھیں اپنی بے اعتنائی پر بڑا افسوس ہوا۔ گنگا جلی کے سرھانے بیٹھ کر روتے ہوئے بولے: ”بہن یہاں لاکر میں نے تمھیں بہت تکلیف دی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ میں آج کسی وید کو لاتا ہوں۔ ایشور چاہیں گے تو تم جلد اچھی ہوجاؤگی“۔

اتنے میں جانھوی بھی آگئی۔ یہ باتیں اس کے کان میں پڑگئیں ۔ بولی : ”ہاں ہاں

دوڑو، بید بلاؤ، نہیں تو قیامت آجائے گی۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے مہینوں بخار آتا رہا۔ تب بید کے پاس نہ دوڑے تھے۔ میں بھی لحاف اوڑھ کر پڑرہتی، تو تمھیں معلوم ہوتا، کہ اُسے کچھ ہواہے۔ لیکن میں کیسے پڑرہتی۔ گھر کی چکی کون پیلتا؟ میرے نصیب میں یہ سُکھ کہاں؟"

اما ناتھ کا حوصلہ پست ہوگیا۔ وید کو بُلانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ جانتے تھے، کہ اگر وید کو نہ بلایا۔ تو گنگاجلی دوچار مہینے میں مرنے والی ہو، تو دوچار ہی دن میں چل بسے گی۔

گنگاجلی کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اسے اسہال کا مرض ہوگیا۔ زندگی کی امید منقطع ہوگئی۔ جس معدہ میں ساگودانہ ہضم کرنے کی بھی طاقت نہ ہو۔ وہ جو کی روٹیاں کیوں کر ہضم کرتا۔ بالآخر اس کا تنِ زار ان تکلیفوں کو اور نہ برداشت کرسکا۔ چھ مہینہ بیمار رہ کر وہ دکھیا مرگ مفاجات کا لقمہ بن گئی۔

شانتا کا اب دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ سمن کے پاس اس نے دو خط لکھے۔ پر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ شانتا نے سمجھا۔ بہن نے ناتا توڑدیا۔ مصیبت میں کون کس کا ہوتا ہے؟ جب تک گنگاجلی زندہ تھی۔ شانتا اس کے آنچل میں منہ چھپاکے رولیا کرتی تھی۔ اب وہ سہارا بھی نہ رہا۔ اندھے کے ہاتھ لکڑی بھی جاتی رہی۔ شانتا اب اپنے کمرہ کی دیواروں سے لپٹ کرروتی۔ لیکن دیوار میں اور ماں کے آنچل میں بڑا فرق ہے۔ ایک دھیمی ہواؤں سے لہراتی ہوئی ندی ہے۔ دوسرا آتشیں غبار سے بھرا ہوا ریگستان!

شانتا کو اب کہیں تسکین نہیں۔ اس کا دل آگ کی طرح جلا کرتا ہے، وہ اپنے ماموں اور ممانی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی ہے۔ جب گنگاجلی زندہ تھی۔ تب شانتا اسے ممانی کے کلام تیز سے بچانے کے لیے کوشاں رہتی تھی۔ وہ جاہنوی کے ذرا سے اشارے پر دوڑتی تھی۔ کہ کہیں وہ اماں کو کچھ کہہ نہ بیٹھیں۔ ایک بار گنگاجلی کے ہاتھوں سے گھی کی ہانڈی گرپڑی، شانتا نے ممانی سے کہا۔ یہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی۔ اس پر اس نے خوب گالیاں کھائیں، وہ جانتی تھی کہ ماں کا دل طعنہ کی چوٹ نہیں سہہ سکتا۔

لیکن اب شانتا کو وہ خوف نہیں ہے، وہ بیکس ہوکر دلیر ہوگئی ہے۔ اس میں اب وہ تحمل نہیں ہے۔ اسے جلد غصہ آجاتا ہے۔ وہ جلی کٹی باتوں کا اکثر جواب بھی دے دتی ہے، اس نے اپنے دل کو سخت سے سخت تعزیر کے لیے تیار کرلیا ہے۔ ماموں سے وہ دبتی ہے۔ لیکن ممانی سے مطلق نہیں دبتی۔ اور ممیری بہنوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے اس کی

حالت اب اس گائے کی سی ہے جو گئوہتیا کے خوف کے بل پر دوسروں کا کھیت چرتی ہے۔

اس طرح ایک سال اور گزر گیا۔ اما ناتھ نے بڑی دوادوش کی کہ اس کی شادی کردیں۔ لیکن جتنا سستا سودا وہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہیں طے نہ ہوا۔ انھوں نے تھانہ اور تحصیل سے دوسو روپیہ کا چندہ فراہم کرلیا تھا۔ مگر اتنے سستے بَر کہاں؟ جانھوی کا بس چلتا، تو وہ شانتا کو کس کنگلے کے گلے مڑھ کر قضیہ پاک کرتی۔ لیکن اما ناتھ نے اب کی اپنی متاہل زندگی میں پہلی بار اس سے اختلاف کیا۔ اور شانتا کے لیے ایک لائق اور موزوں بَر تلاش کرتے رہے۔ گنگاجلی کو اپنی کمزوری پر قربان کرکے اب وہ کچھ جری ہوگئے تھے۔

(۲)

رفاہِ عام کی تحریکیں بھی ممتاز آدمیوں کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگرچہ بٹھلداس کے پیرووں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان میں زیادہ تر عوام تھے۔ خواص ان سے محترز رہتے تھے۔ پدم سنگھ کے شریک ہوتے ہی اس تحریک میں جان سی پڑگئی۔ ندی کی پتلی دھار اُمڈ پڑی۔ معززین میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ اُس پر کچھ کچھ اعتبار کرنے لگے۔

پدم سنگھ تنہا نہ آئے۔ اکثر کسی کام کو مفید سمجھ کر بھی ہم اس میں ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں نکّو بن جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ ہم بڑے آدمیوں کے آملنے کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ جوں ہی کسی نے راستہ کھولا۔ ہماری ہمت بندھ جاتی ہے۔ ہم کو تضحیک یا انگشت نمائی کا خوف نہیں رہتا۔ اکیلے ہم اپنے گھر میں بھی ڈرتے ہیں۔ دو ہوکر جنگل میں بھی بے خوف ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر رومیش دت لالہ، بھگت رام اور مسٹر رستم بھائی خفیہ طور پر بٹھل داس کی اعانت کرتے رہتے تھے۔ اب وہ کھُل پڑے۔ معاونین کی تعداد روز بڑھنے لگی۔

بٹھل داس اصلاحِ تمدن کے معاملہ میں نرم گوئی کو بالکل بے موقع سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی باتیں لوگوں کو ناگوار گزرتیں۔ میٹھی نیند سونے والوں کو اُن کی صدا تلخ زہر معلوم ہوتی تھی۔ پر بٹھل داس کو اس کی پروا نہ تھی۔

پدم سنگھ دُھن کے پورے آدمی تھے۔ اُنھوں نے بڑے جوش سے بازارِ حُسن کے اخراج کی تحریک شروع کی۔ میونسپلٹی کے اراکین میں دوچار اصحاب بٹھل داس کے معتقد بھی تھے۔ لیکن ان میں اس تحریک کو عملی صورت میں لانے کی جرأت نہ تھی۔ مسئلہ اتنا

مشکل اور پیچیدہ تھا۔ کہ اس کا خیال ہی لوگوں کے حوصلے توڑ دیتا تھا۔ وہ سوچتے اس تجویز کو زیر بحث لانے سے معلوم نہیں شہر میں کیا کہرام مچے۔ شہر کے کتنے ہی رؤسا، کتنے ہی حکام، کتنے ہی تجار بازار حسن سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی قدردان تھا۔ کوئی گاہک۔ کوئی جوہری۔ کوئی دلاّل اس جم غفیر سے بیَر مول لینے کی کون جرأت کرتا۔ میونسپلٹی کے اراکین ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

پدم سنگھ نے ممبروں سے مِل مِل کر اُن کی توجہ اس مسئلہ کی طرف منعطف کی۔ پربھاکرراؤ کی جادو نگاریوں کا خاص اثر ہوا۔ پمفلٹ نکالے گئے۔ اور عوام کو بیدار کرنے کے لیے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ رمیش دت اور پدم سنگھ فنِ تقریر میں مشاق تھے۔ اس کا بار انھوں نے اپنے سر لے لیا۔ تحریک نے باقاعدہ منضبط صورت اختیار کی۔

پدم سنگھ نے یہ مسئلہ چھیڑ تو دیا۔ پر وہ اس پر جتنا بھی غور کرتے تھے۔ اتنے ہی اور مایوس ہوجاتے تھے۔ انھیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ کسبیوں کے اخراج سے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے، فائدہ کی جگہ نقصان ہو۔ وہ سوچتے کہ برائیوں کا بہترین سدّباب انسان کا اخلاقی احساس ہے اس کے سوا اور کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کبھی کبھی سوچتے سوچتے انھیں وحشت سی ہونے لگتی۔ لیکن اس تحریک کا ایک رکن خاص بن کر وہ اپنے شکوک کا اظہار نہ کرسکتے تھے۔ عوام کے روبرو تو انھیں اصلاحِ قوم کا چرچا کرتے ہوئے کوئی تکلف نہ تھا۔ لیکن اپنے احباب اور ہم جنسوں کے سامنے آتے ہوئے انھیں بہت جھجک ہوتی تھی۔ یہ ان کے لیے سخت امتحان تھا۔ کوئی کہتا۔ "اجی کس پھیر میں پڑے ہو۔ بٹھل داس کے چکر میں تم بھی آگئے کیا؟ چین سے زندگی کا مزہ اُٹھاؤ ان جھمیلوں میں پڑکر کیوں مٹی خراب کرتے ہو؟" کوئی کہتا۔ "یار معلوم ہوتا ہے۔ کسی حسینہ نے تمھیں چرکا دیا ہے تبھی تو تم ان کے پیچھے اس طرح پڑے ہو" ایسے دوستوں کے سامنے فلاح اور رفاہ کی گفتگو کرنا اپنے تئیں نشانۂ ظرافت بنانا تھا۔ دورانِ تقریر میں بھی جب شرماجی جذبات کو متحرک کرنے کی کوشش کرتے تو انھیں الفاظ نہ ملتے، اور ملتے بھی تو انھیں زبان سے نکالتے ہوئے شرماجی کو بہت تأمل ہوتا۔ فی الواقع ابھی تک شعلۂ درد ان کے دل تک نہ پہنچا تھا۔ وہ جب اپنی بے حسی پر غور کرتے۔ تو انھیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا دل ابھی تک اس نشہ میں سرشار نہیں ہوا۔

کوئی تقریر ختم کرچکنے کے بعد شرماجی کو یہ جاننے کی اتنی خواہش نہ ہوتی تھی۔ کہ حاضرین پر اس کا کیا اثر ہوا۔ جتنی یہ جاننے کی کہ تقریر مدلل فصیح اور پُرجوش تھی یا نہیں۔

لیکن ان خیالوں کے باوجود یہ تحریک روزبروز پھیلتی جاتی تھی۔ یہ کامیابی شرماجی کے لیے یقین اور سوزِ باطن سے کچھ کم ہمت افزا نہ تھی۔

سدن سنگھ کی شادی کو ابھی دوماہ تھے، خانگی تفکرات سے آزاد ہوکر شرماجی اس تحریک میں دل و جان سے منہمک ہوگئے، کچہری کے کاموں میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ وہاں بھی وہی چرچے رہتے۔ ایک ہی مسئلہ پر متواتر غور و خوض کرتے رہنے سے اس سے ایک عشق سا ہوجاتا ہے۔ رفتہ رفتہ شرماجی کے دل میں شعلۂ محبت روشن ہونے لگا۔

لیکن جب شادی کے دن قریب آگئے۔ تو پدم سنگھ کو ایک ضعف کا احساس ہونے لگا۔ دل میں سوال پیدا ہوا، کہ بھائی صاحب شادی کے لیے طوائفوں کو طے کرنے کا بار مجھی پر رکھیں گے۔ اس وقت میں کیا کروں گا؟ ناچ دیکھنے کے لیے آئیں گے۔ اُن کی ضیافتِ طبع کے لیے کوئی سامان ہونا ضروری ہے۔ لوگ ایسے موقع پر ناچ کے عادی ہیں، یہ نہ ہوا۔ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ ایسی حالت میں میرا کیا فرض ہے؟ بھائی صاحب کو اس مذموم رسم کی پیروی سے روکنا چاہیے۔ لیکن کیا میں اس امر محال میں کامیاب ہوسکوں گا؟ بزرگوں کے روبرو اصول اور اخلاق کی تقریر بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے دل میں بڑے بڑے حوصلہ ہیں۔ ان کے پورے ہونے میں کچھ بھی کسر رہ گئی۔ تو انھیں ملال ہوگا۔ لیکن کچھ بھی ہو، میرا تو فرض یہ ہی ہے کہ اپنے اصول پر ثابت رہوں۔

اگرچہ شرماجی کو معلوم تھا کہ میری اصول پسندی کے قدردان بہت کم ہوں گے۔ بیشتر لوگ میرے مخالف ہی نکلیں گے۔ لیکن انھیں جذبۂ عام کے سامنے سر جھکانا غایت درجہ کی کمزوری معلوم ہوئی۔ انھوں نے طے کرلیا۔ کہ ناچ کا انتظام نہ کروں گا۔ جب اپنے گھر ہی میں اصلاح نہ کرسکا۔ تو دوسروں کے اصلاح کی سعی ابلہ فریبی سے کم نہیں۔

دل میں یہ مصمم ارادہ کرکے شرماجی مجلس کے اور سامان جمع کرنے لگے۔ وہ ایسے خوشی کے موقعہ پر بخل کو بالکل غیرمناسب سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا یہ منشا بھی تھا۔ کہ آرائش اور نفاست کے سامان اس قدر جمع کردوں۔ کہ ناچ کی کمی پوری ہوجائے۔

اور کسی کو یہ گمان نہ ہو۔ کہ کفایت کے خیال سے یہ روش اختیار کی گئی ہے۔ ایک روز بٹھل داس نے آکر فرش فروش اور آلات نادرہ کا ایک انبار لگا ہوا دیکھا۔ تو حیرت میں آگئے۔ پوچھا :"ان تیاریوں میں آپ کا کیا صرف ہوا ہوگا"۔

شرما۔ اس کا حساب واپسی پر ہوگا۔

بٹھل۔ تب بھی دوہزار سے کم تو نہ ہوں گے۔

شرما۔ ہاں شاید کچھ اس سے زیادہ ہی ہو۔

بٹھل۔ اتنے روپے آپ نے پانی میں ڈال دیے۔ کسی کار خیر میں صرف کرتے، تو اس سے قوم کو کتنا فائدہ ہوتا جب آپ جیسے روشن خیال اصحاب اس صرف بیجا کو روا رکھتے ہیں تو دوسروں سے کیا امید کی جائے؟

شرما۔ اس معاملے میں آپ سے متفق نہیں ہوں، جسے پرماتما نے توفیق دی ہو ۔ اُسے خوشی کی تقریبوں میں دل کھول کر صرف کرنا چاہیے۔ ہاں قرض لے کر نہیں۔ گھر بیچ کر نہیں۔ صرف اپنی حیثیت دیکھ کر، دل کی امنگ ایسے موقعہ پر بھی نہ نکلے گی، تو کب نکلے گی۔

بٹھل۔ آپ کے قیاس میں ڈاکٹر شیاماچرن کی حیثیت دس پانچ ہزار روپے صرف کرنے کی ہے یا نہیں؟

شرما۔ اس سے بہت زیادہ۔

بٹھل ۔مگر ابھی اپنے بڑے لڑکے کی شادی میں انھوں نے کتنی کفایت کی، ناچ، تماشا، باجا گاجا، باغ، بغیچہ کسی کا پتہ نہ تھا۔

شرما۔ ہاں ان فضول کاریوں میں انھوں نے بڑے کفایت کی لیکن اس کی کسر دعوتوں میں نکل گئی۔ اس سے کہیں زیادہ صرف ہوگیا، ان کی کفایت کا کیا نتیجہ ہوا؟ عوام کو اس سے کوئی فیض نہ پہنچا، بلکہ جو روپے غریب باجے والے، آتشباز، گل تراش، اور فراشوں کے ہاتھ لگتے وہ "مرے کمپنی" اور "ہوائٹ اوے لیڈلا کمپنی" کے نذر ہوگئے ہیں۔ میں اسے کفایت نہیں کہتا، یہ غربا کی حق تلفی ہے۔

(۳)

رات کے نو بجے تھے۔ پدم سنگھ اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شادی کے متعلق

بات چیت کررہے تھے۔ کل بارات جائے گی۔ دروازہ پر شہنائی بج رہی تھی۔ اور اندر منگل گانا ہورہا تھا۔ برآمدے میں چارپائیوں کی لمبی قطار بچھی ہوئی تھی۔ ان پر اہلِ نوید پڑے خراٹے لیتے تھے۔

مدن سنگھ نے پوچھا۔"تم نے جو گاڑیاں بھیجی ہیں۔ وہ کل شام تک امولا پہنچ جائیں گی۔"

پدم سنگھ۔ جی نہیں دوپہر تک ہی پہنچ جائیں گی۔ امولا بندھیاچل کے قریب ہے۔ آج میں نے دوپہر کے قبل ہی انھیں روانہ کردیا۔

مدن ۔تو یہاں سے کیاکیا سامان لے چلنے کی ضرورت ہے؟

پدم ۔ میرے خیال میں مجلسی سامان کی آپ کو مطلق ضرورت نہ ہوگی۔ ہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لیتے چلیے۔ ممکن ہے وہاں کے ملنے میں دیر ہو تو ناحق تکلیف ہوگی۔

مدن۔ ناچ کتنے پر طے ہوا؟ دوہی طائفے ہیں نا؟

پدم سنگھ کا رنگ فق ہوگیا۔ ناطقہ بند ہوگیا۔ وہ ڈررہے تھے۔ کہ یہ سوال ہواہی چاہتا ہے۔ شرم سے سر جھکا لیا، اور دبی زبان سے بولے۔"جی ناچ تو میں نے نہیں طے کیا"۔

مدن سنگھ چونک پڑے، جیسے کسی نے زور سے چٹکی کاٹ لی ہو اور بولے:"خوب! تم نے تو ڈونکا ہی ڈبادیا۔ پھر تم نے جنواسے کا کیا انتظام کیا ہے؟ کیا فرصت ہی نہیں ملی، یا خرچ سے ہچک گئے؟ میں نے تو اس لیے چار دن پہلے سے تمھیں اطلاع دے دی تھی جو شخص برہمن کو نیوتہ دیتا ہے۔ وہ اسے دکشنا دینے کا بھی بوتا رکھتا ہے۔ اگر تمھیں خرچ کا خیال تھا۔ تو مجھے صاف صاف لکھ دیتے۔ میں یہاں سے روپے بھیج دیتا۔ ابھی نارائن کی دیا سے کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ اب بھلا بتاؤ کیا انتظام ہوسکتا ہے۔ منہ میں کالکھ لگی یا نہیں؟ ایک بھلے مانس کے دروازے پر جارہے ہو۔ وہ اپنے دل میں کیا کہے گا؟ اس کے عزیز و اقربا دور دور سے نوید میں آئے ہوں گے۔ دور دور کے گاؤں کے لوگ بارات میں شریک ہونے کے لیے آئیں گے۔ وہ سب اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ رام رام!!"

منشی بیجناتھ گاؤں میں ۸؍کے حصہ دار تھے۔ مدن سنگھ کی طرف پُرمعنی انداز سے دیکھ کر بولے:"دل میں نہیں جناب کھول کھول کر کہیں گے تالیاں دیں گے۔ منہ پر صلواتیں سنائیں گے کہیں گے نام بڑے درشن تھوڑے سارے قرب وجوار میں ناموسی

ہوجائے گی۔ ناچ کے بغیر بھی کہیں مجلس ہوئی ہے۔ کم سے کم میں نے تو کبھی نہیں دیکھی شاید بھیا کو خیال ہی نہیں رہا، یا ممکن ہے لگن کی تیزی سے انتظام نہ ہوسکا ہو۔"

پدم سنگھ نے ندامت سے کہا۔"جی نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔"

مدن ۔تو پھر کیا بات ہے؟ تم نے اپنے دل میں بھی سوچا ہوگا، کہ سارا بار مجھی پر پڑے گا۔ پر میں تم سے ازروئے ایمان کہتا ہوں۔ کہ میں نے اس خیال سے تمھیں نہیں لکھا تھا۔ میں دوسروں کے ماتھے پھلوڑیاں کھانے کا شوق نہیں کرتا۔

پدم سنگھ بھائی کی یہ ملامت آمیز باتیں نہ برداشت کرسکے آنکھیں بھرآئیں۔ بولے۔"بھیا ایشور کے لیے آپ میری نسبت ایسا خیال نہ کریں۔ اگر میری جان بھی آپ کے کام آسکے۔ تو مجھے اُس کے دے دینے میں مطلق دریغ نہ ہوگا۔ مجھے اس کی دلی تمنا ہے۔ کہ آپ کی کوئی خدمت کرسکوں۔ یہ خطا مجھ سے محض اس لیے ہوئی ہے۔ کہ آج کل شہر مین لوگ ناچ کے رواج کو معیوب سمجھنے لگے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں اس رواج کی سخت مخالفت ہورہی ہے۔ اور میں بھی اس تحریک میں شریک ہوگیا ہوں۔ اپنے اصول کے خلاف عمل کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔"

مدن ۔ اچھا یہ بات ہے! بھلا کسی طرح لوگوں کی آنکھیں تو کُھلنے لگیں ۔میں ذاتی طور پر اس رسم کو معیوب سمجھتا ہوں ۔ لیکن بھائی نکّو نہیں بننا چاہتا ہوں۔

جب سب لوگ چھوڑدیں گے، میں بھی چھوڑدوں گا۔ مجھی کو ایسی کیا غرض پڑی ہے۔ کہ سب کے آگے آگے ہوں۔ میرے ایک ہی لڑکا ہے۔ اس کی شادی میں دل کا کوئی حوصلہ باقی نہیں رکھنا چاہتا شادی کے بعد میں بھی تمھاری تحریک میں شامل ہوجاؤں گا۔ اس وقت مجھے اپنے پرانے طریق پر چلنے دو۔ جب ایشور تمھیں لڑکا دے اور اس کی شادی کا موقع آئے، تو تم ان نئے رواجوں پر عمل کرنا میں ذرا بھی کان نہ ہلاؤں گا۔ اگر بہت زیادہ تکلیف نہ ہو ۔ تو صبح کی گاڑی سے چلے جاؤ۔ اور دونوں طائفے ساتھ لیے ہوئے امولا چلے آؤ۔ تم سے اس لیے کہتا ہوں، کہ تمھاری وہاں لوگوں سے شناسائی ہے۔ کفایت سے کام ہوجائے گا۔ دوسرے جائیں گے۔ تو لٹ جائیں گے۔

پدم سنگھ نے سرجھکالیا اور سوچنے لگے، انھیں خاموش دیکھ کر مدن سنگھ نے تیور بدلے اور کہا۔"چپ کیوں ہو؟ کیا جانا منظور نہیں؟"

پدم سنگھ نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے نہایت انکسار کے ساتھ کہا:"بھیا اگر مجھے معاف ...."

مدن سنگھ ۔ نہیں نہیں میں تمھیں مجبور نہیں کرتا۔ نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ۔ منشی بیجناتھ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن میری خاطر سے آپ ہی چلے جائیے۔

بیجناتھ۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

مدن سنگھ۔ صبح گاڑی سے جائیے، شام تک امولا پہنچ جائیے گا۔آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔

بیجناتھ۔ آپ اطمینان رکھیں، میں چلا جاؤں گا۔

کچھ دیر تک تینوں آدمی خاموش بیٹھے رہے۔ مدن سنگھ اپنے بھائی کو احسان فراموش سمجھ رہے تھے۔ اسے اپنے لڑکے کی طرح پالا۔ اور آج ذرا سی بات پر یہ نکل کھڑا ہوا۔ بیجناتھ کو اندیشہ ہورہا تھا۔ کہ مدن سنگھ کی حمایت پدم سنگھ کو ناگوار تو نہ گزرے گی۔ اور پدم سنگھ اپنے بھائی کے عتاب کے خوف سے دبے ہوئے تھے۔ سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک طرف بھائی کی ناراضگی کا خوف تھا۔ دوسری جانب حق اور اخلاق اور اصول کا خون، ایک طرف اندھیری گھاٹی تھی۔ اور دوسری جانب سیدھی چٹان، نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ برادرانہ سعادت مندی اور قومی فرض میں کشمکش ہورہی تھی۔ میں بھائی صاحب کی گود میں کھیلا ہوں۔ ان کے ہاتھوں پلا ہوں۔ یہ جسم ان کا ہے۔ ضمیر کا خون کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ لیکن ضمیر کیا ہے؟ محض حالات گرد وپیش کا مرقع ان اثرات کے قبول کرنے کی صلاحیت مجھ میں کہاں سے آئی۔ یہ اس تعلیم کی برکت ہے۔ جو بھائی صاحب ہی کے طفیل مجھے حاصل ہوئی ہے۔ ان کی رضامندی کے مقابلے میں میرے ضمیر کی کیا ہستی ہے! میرا نام، میری شہرت، میری اصول پسندی کیا چیز ہے؟ یہ میری کم ظرفی ہے۔ جو اصول کی آڑ لے رہی ہے یہ کلنک اپنے اوپر نہ لگاؤں گا۔ ان کی خاطر مجھے اصول اور ضمیر سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن ایک بار کیوں نہ پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کروں؟ اگر مان گئے۔ تو فبہا ورنہ بے عذر ان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔"

یوں دل میں فیصلہ کرکے انھوں نے ڈرتے ڈرتے کہا:"بھائی صاحب! آپ نے میری بہت سی نادانیاں معاف کی ہیں۔ میری ایک گستاخی اور معاف کیجیے۔ آپ جب ناچ کی رسم کو معیوب سمجھتے ہیں تو اس پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں؟"

مدن سنگھ جھنجلا کر بولے۔"تم تو ایسی باتیں کرتے ہو، گویا اس دیس میں پیدا ہی نہیں ہوئے کسی غیرولایت سے آئے ہوئے ہو۔ ایک یہی کیا؟ کتنے ہی ایسے رسوم ہیں، جنہیں معیوب سمجھ کر بھی ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ نہ کرو تو عزت میں بٹہ لگتا ہے، گالی، گانا کون سی اچھی بات ہے، جہیز لینا کون سی اچھی بات ہے، لیکن اگر ریت پر نہ چلو، تو لوگ ہنسی اڑاتے ہیں۔ ناچ نہ لے جاؤں۔ تو لوگ یہی کہیں گے، کہ کنجوسی کے مارے نہیں لائے۔ میری نیت کو کون دیکھتا ہے۔"

پدم سنگھ۔ اچھا اگر اسی رقم کو کسی دوسرے مناسب طریق پر خرچ کردیجیے۔ تب تو کسی کو کنجوس کی شکایت نہیں رہے گی۔ آپ دو طائفے لے جانا چاہتے ہیں۔ آج کل لگن تیز ہے۔ تین سو روپیہ سے کم صرف نہ ہوگا۔ اگر آپ تین سو کی جگہ پانچ سو کے کمل لے کر امولا کے غربا کو بانٹ دیجیے، تو کیسا ہو؟ کم سے کم دو سو آدمی آپ کو دعائیں دیں گے۔ اور جب تک کمل کا ایک دھاگا بھی باقی رہے گا، آپ کا جس گائیں گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو، تو اس جوار میں اسی روپے سے ایک پختہ کنواں بنوا دیجیے۔ اس سے آپ کا نام ہمیشہ کے لیے برقرار رہے گا۔ اس کا بار میرے اوپر رہے گا۔

مدن سنگھ نے بدنامی کا جو سہارا لیا تھا۔ وہ ان تجویزوں کے سامنے قائم نہ رہ سکا۔ وہ اس کا کوئی جواب سوچ رہے تھے۔ کہ منشی بیجناتھ جو اس وقت باوجود پدم سنگھ کی ناراضگی کے خوف کے اپنی جودت و فراست کے اظہار سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ بولے:"بھیا ہر ایک کام کے لیے موقع اور محل ہوتا ہے۔ جشن کے موقع پر جشن، خیرات کے موقع پر خیرات بے موقع بات کبھی بھی نہیں لگتی۔ اور پھر شہر کے واقف کار آدمی ہوں، تو ایک بات بھی ہے۔ دیہات کے اُجڈ کندۂ ناتراش زمینداروں کے سامنے آپ کمل تقسیم کرنے لگیں گے، تو وہ تعجب سے آپ کا منہ دیکھیں گے، اور ہنسیں گے۔"

مدن سنگھ لاجواب ہوگئے تھے۔ منشی بیجناتھ کی اس باموقعہ امداد سے بہت خوش ہوئے۔ ان کی طرف احسان مندانہ نگاہ سے دیکھ کر بولے:"ہاں اور کیا ہوگا؟ بسنت میں ملار گانے والے کو کون اچھا کہے گا؟ بے وقت کی راگنی کبھی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے تو کہتا ہوں۔ کہ آپ سویرے چلے جایئے۔ اور دونوں ڈیرے طے کر آیئے۔"

پدم سنگھ نے سوچا۔ یہ لوگ اپنے من کی تو کریں گے ہی۔ پر دیکھوں کن دلیلوں

سے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔ انھیں یہ ملال بھی ہوا۔ کہ بھائی صاحب منشی بیجناتھ پر مجھ سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ دلیر ہوکر بولے:"تو کیوں کر مان لیاجائے، کہ شادی جشن ہی کا موقع ہے میں تو سمجھتا ہوں ثواب اور خیرات کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ ہوگا۔ شادی ایک مقدس فرض ہے ایک روحانی معاہدہ ہے۔ جب ہم دنیاوی ذمہ داریوں میں قدم رکھتے ہیں ۔ جب ہمارے پیروں میں علائق دنیا کی بیڑی پڑتی ہے۔ جب ہم فرائض اور پابندیوں کے آگے اپنے سر جھکاتے ہیں۔ ایسی پاک رسم کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے اس موقع پر ہمیں متانت سے کام لینا چاہیے۔ یہ کتنی بے رحمی ہے۔ کہ جس وقت ہمارا ایک عزیز ایسا اٹل برت لے رہاہو۔ ہم جشن منانے بیٹھیں۔ وہ ان فرائض کے بارِ عظیم سے دباجاتا ہو۔ اور ہم رقص وسرود کی مجلس آراستہ کریں۔ اگر آج کل بد قسمتی سے یہ الٹی بات رائج ہوگئی ہے، تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اسی لکیر کے فقیر بنیں۔ تعلیم کا کم سے کم اتنا اثر تو ہونا چاہیے کہ مذہبی معاملات میں ہم جُہلا کی خوشی کو مقدم نہ سمجھیں۔"

بیجناتھ زمین کی طرف تاکنے لگے۔ مدن سنگھ نے آسمان کی طرف تاکا۔ پدم سنگھ کی تقریر انھیں بالکل برحق معلوم ہوتی تھی۔ پر رواج کے سامنے سچائی۔ حق اور اصول کسی کی نہیں چلتی۔ انھیں خوف تھا۔ کہ اب بیجناتھ کچھ جواب نہ دے سکیں گے۔ لیکن منشی جی ابھی ہار نہیں ماننا چاہتے تھے، بولے:"بھیا تم وکیل ہو، تم سے بحث کرنے کی لیاقت مجھ میں کہاں ہے؟ لیکن جو بات سناتن سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اس کے مٹانے میں بدنامی ضروری ہوتی ہے۔ خواہ وہ مناسب ہو یا غیر مناسب آخر ہمارے بزرگ نرے جاہل جٹ تو تھے نہیں۔ انھوں نے کچھ سمجھ کرہی اس رواج کی بنیاد ڈالی ہوگی۔"

مدن سنگھ کو یہ دلیل نہ سوجھی تھی ۔ بہت خوش ہوئے۔ بیجناتھ کی طرف قدردانہ انداز سے دیکھ کر بولے۔"ضرور انھوں نے جو رسمیں نکالی ہیں۔ ان سبھوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ چاہے وہ آج ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ آج کل کے نئے خیال والے حضرات ان رسموں کے مٹانے میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں۔ اپنے سامنے بزرگوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ہمارے پاس جو عزت و حرمت علم و شعور ہے۔ وہ سب انھیں بزرگوں کی کمائی ہے، کوئی کہتا ہے۔ جنیو پہننے سے کیا فائدہ! کوئی چوٹی کی جڑ کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی اسی دھن میں ہے۔ کہ شودر اور چانڈال سب چھتری ہوجائیں۔ کوئی

وِدھواؤں کی شادی کے راگ الاپتا پھرتا ہے۔ اور تو کچھ ایسے حضرات بھی ہیں۔ جو ذات اور بَرن کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب یہ تفریق نہ رہے گی۔ تو سارے ہندستان میں اتفاق اور اتحاد کی سلطنت قائم ہوجائے گی۔ تو بھئی یہ سب باتیں ہمارے قابو کی نہیں ہیں۔ جنھیں ماننا ہو مانے۔ اسے مبارک ہو۔ ہم کو تو وہی اپنی پرانی روش پسند ہے۔ اگر زندہ رہا، تو دیکھوں گا۔ کہ یورپ کا پودا یہاں کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کھیتی کو سب سے اعلیٰ پیشہ کہا ہے۔ لیکن آج کل یورپ کی دیکھا دیکھی لوگ مِل اور مشینوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ پر دیکھ لینا ایسا کوئی دن آئے گا۔ کہ یورپ والے خود چیتیں گے۔ اور مِل کھود کر کھیت بنائیں گے۔ آزاد کاشتکار کے سامنے کارخانہ کے مزدوروں کی کیا ہستی ہے؟ وہ کوئی ملک ہے، جہاں باہر سے کھانے کی چیزیں نہ آئیں۔ تو لوگ بھوکوں مریں جن ملکوں میں زندگی کے ایسے اُلٹے طریق رائج ہوں۔ وہ ہمارے لیے کبھی نمونہ نہیں بن سکتے صنعت اور حرفت کی یہ قدر اسی وقت تک ہے، جب تک دنیا میں کمزور اور غیر محفوظ قومیں موجود ہیں۔ ان کے گلے سستا مل مڑھ کر یورپ والے چین کرتے ہیں۔ سنگین کی نوک پر اپنی جنسیں بیچتے ہیں۔ پرجوں ہی یہ قومیں بیدار ہوں گی۔ یورپ کا اقتدار خاک میں مل جائے گا۔ اس کی ثروت اور حشمت تحت الثریٰ میں پہنچ جائے گی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یورپ والوں سے کچھ مت سیکھو۔ نہیں وہ آج دنیا کے مالک ہیں۔ اور ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اُن کی خوبیوں کو لے لو۔ برائیوں کو چھوڑدو۔ اُن سے جفاکشی سیکھو، پر تکلف پسندی نہیں۔ ان سے مستقل مزاجی سیکھو۔ پر رعونت نہیں ان کی تقلید کرکے زندگی کی ضرورتیں مت بڑھاؤ۔ نفس کے غلام مت بنو۔ خودغرضی کا کلمہ مت پڑھو۔ غریبوں کو مت کچلو۔ ہمارے اپنے رسم و رواج، ہمارے حالات اور ضروریات کے موافق ہیں ان میں پیوند لگانے کی ضرورت نہیں۔"

مدن سنگھ نے یہ باتیں کچھ ایسی اہمیت کی شان سے کیں گویا کوئی عالم اپنے علمی انکشافات بیان کررہاہے۔ حالانکہ ان کا ماخذ سُنی سُنائی باتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جن کا مطلب وہ خود بھی نہ سمجھتے تھے۔ پدم سنگھ نے فلسفیانہ صبر کے ساتھ سنا۔ اور اس خوف سے کہ کہیں یہ مباحثہ مجادلہ کی صورت نہ اختیار کرلے۔ جس کے آثار نظر آرہے تھے۔ اُسے ختم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بہت ملائمت سے بولے:"جی ہاں آپ کا یہ فرمانا بہت صحیح

ہے۔ کہ ہم لوگوں کو یورپ کی کورانہ تقلید نہ کرنی چاہیے۔ لیکن معاف کیجیے گا۔ ہمارے یہاں کا انتظام تمدن جس وقت قائم کیا گیا تھا، اس وقت سے اب تک تاریخ میں بہت کچھ انقلاب ہوگیا ہے۔ اور ان انقلابوں کا اثر ہماری معاشرے اور اخلاق پر پڑنا لازمی تھا۔ مگر میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کا ارشاد ہے تو میں صبح کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ اور طائفے طے کر لاؤں گا۔ منشی جی کو کیوں تکلیف دیجیے گا۔ ان کے چلے جانے سے یہاں کتنے ہی کام پڑے رہ جائیں گے۔ آیئے بھائی صاحب ہم دونوں آدمی باہر چلیں مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

مدن سنگھ۔ تو یہیں کیوں نہیں کرتے؟ کہو تو میں ہی اُٹھ جاؤں؟

پدم سنگھ ۔ جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ پر یہ باتیں میں منشی جی سے اطمینان کے لیے کررہا ہوں۔ بھائی صاحب بتلایئے امولا میں تماشائیوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ کوئی ایک ہزار؟

بیجناتھ نے سنبھل کر جواب دیا: ''اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے''۔

پدم سنگھ۔ اچھا آپ کے خیال میں ان میں کتنے غریب کسان ہوں گے اور کتنے خوشحال زمیندار؟

بیجناتھ۔ زیادہ تر کسان ہی ہوں گے۔ لیکن زمیندار بھی دو تین سو سے کم نہ ہوں گے۔

پدم ۔ اچھا آپ یہ مانتے ہیں کہ انسان اپنی بدنی ضرورتیں رفع کرکے تب کھیل تماشے کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

بیجناتھ ۔ ہاں یہ بھی مانتا ہوں۔ بھوکا بھلا کیا تماشا دیکھے گا۔

پدم ۔ تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ ان کسانوں کو اگر کمل یا کپڑے دے دیے جائیں تو وہ ناچ دیکھنے کے مقابلے میں زیادہ خوش ہوں گے؟

بیجناتھ۔ نہیں میں اسے نہ مانوں گا ۔ زیادہ تر کسان ایسے ہوتے ہیں۔ جو خیرات کے نام پر ایک کیا سو کمل بھی نہ لیں گے وہ جلسہ دیکھنے آئیں گے اور مجلس ویران دیکھیں گے تو ناکام لوٹ جائیں گے۔

پدم سنگھ نے سقراطی سوالات کا جو سلسلہ دل میں قائم کررکھا تھا۔ وہ برہم ہوگیا۔ سمجھ گئے کہ منشی جی ہوشیار ہیں۔ اب کوئی دوسرا داؤں کھیلنا چاہیے۔ بولے: ''اچھا اسے جانے

دیکھیے آپ مانتے ہیں، کہ بازار میں وہی جنس نظر آتی ہے۔ جس کے خریدار ہوتے ہیں اور خریداروں کی کثرت یا قلّت پر اس جنس کی کمی یا بیشی منحصر ہے۔

بیجناتھ۔ جی ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔

پدم سنگھ۔ اس لحاظ سے کسی جنس کے خریدار ہی اُسے بازار میں لانے کے باعث ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گوشت نہ کھائے۔ تو بکرے کی گردن پر چھری کیوں چلے؟

بیجناتھ سمجھ رہے تھے۔ کہ یہ حضرت مجھے کسی دوسرے پیچ میں لارہے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کی تہ تک نہ پہنچے تھے۔ ڈرتے ہوئے بولے: "ہاں بالکل صحیح ہے"۔

پدم سنگھ ۔جب آپ یہ مانتے ہیں ۔ تو آپ کو یہ ماننے میں کیا تأمل ہوسکتا ہے۔ کہ جو لوگ طائفوں کو مجلسوں میں بلاتے ہیں۔ انھیں بڑی بڑی رقمیں دے کر ان کے لیے آسائش اور تکلف کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور انھیں امیرانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ وہ اس قصاب سے کم گنہگار نہیں ہیں۔ جو بکرے کی گردن پر چھری چلاتے ہیں۔ اگر میں وکیلوں کو شان سے بگھی دوڑاتے نہ دیکھتا تو آج میں ہرگز وکیل نہ ہوتا۔

بیجناتھ نے ہنس کر کہا: "بھیا تم گھما پھرا کر اپنی بات منوالیتے ہو، لیکن بات جو کہتے ہو وہ سچّی ہے۔"

پدم سنگھ۔ تو ایسی حالت میں کیا یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ سینکڑوں عورتیں جو بالاخانوں پر بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جنھوں نے اپنی شرم اور عفت بیچ دی ہے۔ ان کی زندگی کو تباہ کرنے والے ہم ہی لوگ ہیں۔ وہ ساری قومی اور مجلسی برائیاں جو اس بے شرمانہ زندگی کا نتیجہ ہیں ان کے ذمہ دار ہمیں لوگ ہیں۔ وہ ہزاروں خاندان جو آئے دن اس نفسانیت کے بھنور میں پڑکر تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ ایشور کے دربار میں ہمارا دامن پکڑیں گے۔ اور اس وقت ہم کو کوئی جواب نہ سوجھے گا۔ جس رواج سے ایسے خطرناک اور مہلک نتائج پیدا ہوں۔ اُسے ترک کرنے میں ہم کو مطلق پس و پیش نہ ہونا چاہیے۔ انسان خیال کا پتلا ہے۔ خیال ہی ارادہ اور فعل کا محرک ہے کون کہہ سکتا ہے، کہ ایسی مجلسوں میں ہمارے خیالات پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟ جس فعل کا لازمی نتیجہ تخریب ہو۔ کیا اس سے محترز رہنا اچھی بات نہیں؟

مدن سنگھ بڑے غور سے یہ تقریر سنتے رہے۔ ان کی معقولیت کا اثر ان کے چہرہ پر نظر آرہا تھا۔ انھوں نے وہ اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ جب انسان ایک کو دو ثابت کرنے کے

لیے بھی دلیلوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور علمی آزاد خیالیوں کی دھن میں مجلسی پابندیوں کا دشمن اور اضافی قیود کا مخالف ہوتا ہے۔ نہیں وہ معمولی عقل اور فہم کے آدمی تھے۔ قابل ہوکر کج بحثی کرتے رہنا ان کی استعداد سے باہر تھا۔ مسکراکر منشی بیجناتھ سے بولے: "کہو لالہ بیجناتھ، اب کیا کہتے ہو؟ ہے کوئی نکلنے کی تدبیر؟"

بیجناتھ۔ مجھے تو کوئی راستہ نہیں نظر آتا۔

مدن سنگھ۔ اجی کٹھ حجتی ہی کرو۔

بیجناتھ ۔کچھ دنوں وکالت پڑھ لی ہوتی تو وہ بھی کرتا۔ یہاں تو اب کوئی جواب نہیں سوجھتا۔ کیوں بھیا پدم سنگھ، مان لو تم میری جگہ ہوتے تو کیا جواب دیتے؟

پدم سنگھ۔ (ہنس کر) جوابوں کی کیا کمی ہے۔ جس نے فلسفہ پڑھا ہے وہ سیاہ کو سفید کرسکتا ہے۔ آسمان کو زمین ثابت کرسکتا ہے، روشن کو تاریک ثابت کرسکتا ہے۔ فلسفہ کے لیے کوئی امر مشکل نہیں۔

مدن سنگھ ۔اتنا تو میں بھی کہوں گا۔ کہ ایسے جلسوں سے خیال ضرور خراب ہوجاتا ہے۔ میں جوانی میں جب کسی جلسہ سے لوٹتا۔ تو مہینہ تک اس طوائف کی شکل صورت ناز و انداز گانے بجانے کا چرچا کیا کرتا۔ ایک جنون سا سر پر سوار رہتا۔

بیجناتھ۔ تو بھیا پدم سنگھ ہی کے من کی ہونے دیجیے۔ یہی نہ ہوگا۔ دس پانچ آدمی ہنسیں گے کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن کنواں ضرور بنوائیے۔

پدم سنگھ ۔ادھر منڈپ میں بھانوریں پڑیں اور میں نے کنوئیں کی نیو رکھی۔

(۴)

برسات کے دن تھے گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ پنڈت اما ناتھ چنار گڑھ کے قریب گنگا کے کنارے کھڑے کشتی کا انتظار کررہے تھے۔ وہ کئی موضعوں کا چکّر لگاکر آئے تھے۔ اور اس وقت چنار کے پاس ایک گاؤں میں جانا چاہتے تھے۔ انھیں خبر ملی تھی، کہ اس گاؤں میں کوئی لائق بَر ہے، اما ناتھ آج ہی امولا لوٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ابھی تک کشتی اسی پار کھڑی تھی۔ اما ناتھ کو ملاحوں پر غصّہ آرہا تھا۔ اس سے زیادہ غصہ ان مسافروں پر آرہا تھا، جو اُس پار کشتی پر بیٹھنے کے لیے آہستہ آہستہ آتے جاتے تھے۔ جب کھڑے کھڑے دیر ہوگئی۔ تو اما ناتھ نے زور سے چلّا کر ملاحوں کو پکارا۔ لیکن ان کی صدا کو ملاحوں کے کان تک

پہنچنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ وہ لہروں سے کھیلتی ہوئی ان میں سماگئی۔

یکایک اما ناتھ کو ایک سادھو اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیا۔ لانبا آدمی تھا۔ چوڑا سینہ، سرخ آنکھیں، سر پر جٹا، گلے میں بڑے بڑے دانوں کی مالا۔ ایک ہاتھ میں سُلفے کی لمبی چلم، دوسرے ہاتھ میں لوہے کا چمٹا۔ پیٹھ پر ایک مرگ چھالا لپیٹے ہوئے۔ آکر ندی کنارے کھڑا ہوگیا وہ بھی اس پار جانا چاہتا تھا۔

اما ناتھ کو ایسا خیال آیا کہ میں نے اس سادھو کو کہیں دیکھا ہے۔ پر یاد نہیں آتا تھا، کہ کہاں؟ حافظہ پر ایک پردہ سا پڑا ہوا تھا۔

اتنے میں سادھو نے اما ناتھ کی طرف تاکا۔ اور پرنام کرکے بولا۔"مہاراج گھر پر توسب کُشل ہے؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟"

اما ناتھ کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ گیا۔ یاد تازہ ہوگئی۔ ہم صورت بدل سکتے ہیں۔ پر آواز کو نہیں بدل سکتے۔ یہ گجادھر پانڈے تھے۔

جب سے سمن کی شادی ہوئی تھی، اما ناتھ اس سے ملنے نہیں گئے تھے۔ اُسے منہ دکھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس وقت گجادھر کو اس صورت میں دیکھ کر انھیں تعجب ہوا۔ انھوں نے سمجھا، کہیں مجھے پھر دھوکا نہ ہوا ہو، پوچھا:"آپ کا نام؟"

سادھو۔ پہلے تو گجادھر پانڈے تھا۔ اب گجانند ہے۔

اما ناتھ۔ اوہو! تبھی تو میں پہچان نہ سکتا تھا۔ یاد آتا تھا کہ آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے پر آپ نے یہ بھیس کیوں لیا، بال بچے کہاں ہیں؟

سادھو۔ اس جنجال سے اب آزاد ہوگیا۔

اما ناتھ۔ سُمن کہاں ہے؟

گجانند۔ دال منڈی میں ایک کوٹھے پر۔

اما ناتھ نے متحیر ہوکر گجانند کی طرف دیکھا۔ اور تب شرم سے ان کا سر جھک گیا۔ ایک لمحہ کے بعد بولے:"یہ کیوں کر"۔

گجانند۔ بالکل اسی طرح جیسے سنسار میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ میری بدمزاجی اور بے رحمی سمن کی شوخ طبعی اور شوق آرائش دونوں نے مل کر ہمیں ملیا میٹ کردیا۔ میں اب اس وقت کی باتوں کو سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے

میں، میں نے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ شادی ہوجانے پر اس کی نازبرداری نہ کرسکا۔ میں غریب تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں اس کی کو محبت اور دلجوئی سے پورا کرتا میں نے اس کے برعکس اسے کھانے پہننے کی بھی تکلیف دی۔ وہ چوکے برتن، چولہے چکی میں مشاق نہ تھی، اور نہ ہوسکتی تھی۔ پر میں اس سے یہ سب کام لیتا تھا۔ اور ذرا بھی دیر ہوجاتی، تو بگڑتاتھا۔ اب مجھے معلوم ہورہاہے کہ میں ہی اس کی تباہی کا باعث ہوا۔ حسن اور نفاست میں وہ ہی تعلق ہے، جو پھول اور اس کی بو میں ہے۔ سمن کو مجھ سے محبت نہ تھی، اور نہ ہوسکتی تھی۔ پر وہ میری خاطر کرتی تھی، جس طرح کنگال آدمی دولت پاکر پھول اٹھتاہے۔ اسی طرح حسین بیوی پاکر وہ وہم اور شک کا شکار ہوجاتاہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں سمن سے بدگمان رہتاتھا اور علانیہ اس کا اظہار نہ کرکے اسے جلایا کرتاتھا۔ مہاراج میں نے اُس کے ساتھ جوجو بدسلوکیاں کیں۔ انھیں یاد کرکے آج اتنی کوفت ہوتی ہے۔ کہ جی چاہتا ہے کہ زہر کھالوں۔ یہ انھیں بے رحمیوں کا پرائشچت کررہاہوں، جب وہ گھر سے چلی گئی۔ تو مجھے دوچار دن وہی نشہ رہا، پر جب نشہ ہرن ہوا۔ تو وہ گھر کاٹنے لگا۔ میں پھر اندر قدم نہ رکھ سکا۔ ایک مندر کا پجاری بن گیا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے کی تکلیف سے بچا۔ مندر میں دوچار سادھو سنت ضرور ہی آجاتے تھے۔ ان کی صحبت کا موقع مل جاتاتھا۔ ان لوگوں کی گیان کی باتیں سن سن کر میری آنکھیں کچھ کچھ کھلنے لگیں۔ اب یہ بھیس لے لیا ہے۔ گاؤں گاؤں گھومتا ہوں، اور اپنے سے جو کچھ بن پڑتا ہے غریبوں کی مدد کرتا ہوں۔ آپ کیا بنارس سے آرہے ہیں؟

اما ناتھ۔ نہیں۔ ایک گاؤں سے آرہاہوں۔ سمن کی ایک بہن چھوٹی نہیں ہے اس کے لیے بَر کی تلاش ہے۔

گجانند۔ لیکن اب کے اچھا بَر ڈھونڈیے گا۔

اما ناتھ۔ بَروں کی تو کمی نہیں ہے۔ پر اپنے میں اتنی ہمت بھی تو ہو۔ سُمن کے لیے کیا کچھ کم دوڑدھوپ کی تھی۔

گجانند۔ آپ کے خیال میں کتنے روپے درکار ہوں گے۔

اما ناتھ۔ ایک ہزار تو جہیز ہی کے رکھیے۔ اور سب خرچ الگ۔

گجانند۔ آپ شادی طے کرلیں۔ ایک ہزار روپیہ کی فکر میں کردوں گا۔ یہ بھیس بدل کر

اب لوگوں کو آسانی سے ٹھگ سکتا ہوں، میں دوچار دن میں آپ سے امولا ہی میں ملوں گا۔
کشتی آگئی، دونوں آدمی سوار ہوئے۔ گجانند تو ملاحوں سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن اما ناتھ فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کا دل کہہ رہا تھا۔ کہ سمن کا قاتل میں ہوں۔

(۵)

پنڈت اما ناتھ سدن سنگھ سے شانتا کی شادی طے کر آئے ہیں۔ انھوں نے جانھوی سے گجانند کی امداد کا ذکر نہ کیا تھا۔ ڈرتے تھے کہ وہ کہیں ان روپوں کو اپنی لڑکیوں کے لیے نہ رکھ چھوڑے۔ جانھوی پر فہمائش کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ اس کے سامنے اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

انھوں نے ایک ہزار کے جہیز پر شادی طے کی تھی۔ پراب اس فکر میں پڑے ہوئے تھے کہ بارات کے لیے خرچ کا کیا انتظام ہوگا۔ کم سے کم ایک ہزار کی ضرورت تھی۔ اس کے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہاں انھیں اس خیال سے مسرت ہوتی تھی کہ شانتا کا بیاہ ایک اچھے گھر میں ہوگا۔ وہ آرام سے رہے گی۔ اور گنگاجلی کی آتما میرے اس کام سے خوش ہوگی۔

بالآخر جب شادی کو تین ہی ماہ اور رہ گئے اور روپیہ کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ تو انھوں نے اس کی فکر کرنا چھوڑدی، دل میں فیصلہ کیا، کہ بارات کے اخراجات کی مدہی غائب کردوں گا۔ کسی نہ کسی بات پر باراتیوں سے بگڑ جاؤں گا۔ وہ لوگ آپ ہی ناراض ہوکر لوٹ جائیں گے۔ یہی نہ ہوگا۔ تھوڑی سی بدنامی ہوگی، لیکن شادی تو ہوجائے گی۔ لڑکی تو آرام سے رہے گی۔ میں قضیہ ایسی خوبصورتی سے پیدا کروں گا کہ سارا الزام باراتیوں کے سر آئے۔

پنڈت کرشن چندر کو جیل خانے سے چھوٹ کر آئے ہوئے ایک ہفتہ گزرچکا تھا۔ لیکن ابھی تک اما ناتھ کو شادی کے متعلق ان سے کچھ صلاح و مشورہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ وہ کرشن چندر کے سامنے جاتے ہوئے شرماتے تھے!

کرشن چندر کے اطوار میں اب ایک بڑا تغیر نظر آتا تھا۔ ان میں متانت کی جگہ اب سبک سری پیدا ہوگئی تھی۔ اور پاس وضع نام کو بھی نہ باقی رہا تھا۔ ان کا جسم لاغر ہوگیا تھا۔ پر اعضا میں ایک خاص تیزی و طراری آگئی تھی۔ وہ اکثر رات کو لمبی آہیں بھر بھر ہائے ہائے کرتے ہوئے سنائی دیتے تھے۔ آدھی رات کو اس خوشی کے عالم میں وہ اپنی چارپائی پر

کروٹیں بدل بدل کر یہ گیت گایا کرتے تھے۔

اگیا لاگی سندر بن جر گیو

کبھی کبھی یہ دُوہا پڑھتے۔

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھیو راکھ

میں پاپن ایسی جلی کہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

ان آنکھوں میں ایک قسم کی شرارت اور مستی جھلکتی تھی۔ جانھوی ان کے سامنے کھڑی نہ ہوسکتی تھی۔ اُسے ایک دہشت سی معلوم ہوتی تھی۔

جاڑے کے دن تھے۔ کسانوں کی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے جایا کرتی تھیں۔ کرشن چندر بھی اُس طرف نکل جاتے۔ اور وہاں عورتوں سے دل لگی کیا کرتے۔ سسرال کے رشتہ سے انھیں عورتوں سے ہنسی مذاق کرنے کا حق تھا۔ لیکن کرشن چندر کی باتیں ایسی بے شرمانہ اور نگاہیں ایسی پُر معنی ہوتی تھیں، کہ عورتیں شرم سے منہ چھپالیتیں اور آکر جانھوی کو اُلہنے دیتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر پر شوریدہ سری کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔

امولا میں کتنے ہی تعلیم یافتہ شریف آدمی تھے۔ کرشن چندر ان کی صحبت سے محترز رہتے۔ اس کے برعکس وہ ہمیشہ شام کے وقت بدقماش آدمیوں کے ساتھ چرس کے دم لگاتے دکھائی دیتے تھے۔ اس مجمع جُہلا میں بیٹھے ہوئے وہ اپنے جیل خانہ کے تجربات بیان کیا کرتے۔ ان کی گفتگو فحش و مکروہ الفاظ سے پُر ہوتی تھی۔

اما ناتھ اپنے گاؤں میں اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ اپنے بہنوئی کی ان خفیف حرکات کو دیکھ کر کٹ جاتے اور ایشور سے دعا مانگتے کہ کسی طرح ان سے گلا چھوٹے۔

اور تو اور اب شانتا کو بھی اپنے والد کے روبرو آنے میں خوف اور لحاظ معلوم ہوتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں جب جانھوی سے کرشن چندر کی بے باکیوں کی سرگزشت بیان کرنے لگتیں تو شانتا پر گھڑوں پانی پڑجاتا۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ جاتی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ پتا جی کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ کیسے سلیم، کیسے بیدار مغز، کیسے بااخلاق، کیسے ثقہ آدمی تھے۔ یہ کایاپلٹ کیوں کر ہوگئی؟ قالب تو وہی ہے۔ پر وہ روح کہاں گئی؟

اس طرح ایک مہینہ گزرگیا۔ اما ناتھ دل میں چڑھتے، کہ انھیں کی لڑکی کی شادی ہے۔ اور یہی ایسے بے فکر بیٹھے ہیں۔ تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ خواہ مخواہ دردسر اٹھاؤں۔

یہ تو نہیں ہوتا کہ جاکر کہیں چار پیسے کمانے کی فکر کریں۔ اپنی زندگی خراب کررہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی لیے جاتے ہیں۔

ایک روز اما ناتھ نے کرشن چندر کے ہم جلیسوں کو دھمکا کر کہا: ”اب کبھی تم لوگوں کو ان کے ساتھ چرس پیتے دیکھا۔ تو بری طرح پیش آؤں گا۔ ایک ایک کی خبر لوں گا۔“

اما ناتھ کا رعب سارے گاؤں پر تھا۔ سب کے سب ڈر گئے۔ دوسرے دن کرشن چندر ان کے پاس گئے۔ تو انھوں نے صاف کہہ دیا: ”مہاراج آپ یہاں نہ آیا کریں۔ پنڈت اما ناتھ سے ہمارا بگاڑ نہ کرائیے۔ کہیں کوئی معاملہ کھڑا کردیں۔ تو ہم کہیں کے نہ رہیں۔“

کرشن چندر غصہ سے بھرے ہوئے اما ناتھ کے پاس آئے اور بولے: ”معلوم ہوتا ہے، تمھیں میرا یہاں رہنا اکھرنے لگا!“

اما ناتھ۔ آپ کا گھر ہے، جب تک چاہیں رہیں۔ پَر میں یہ چاہتا ہوں، کہ آپ ذلیل آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی اور میری بے عزتی نہ کرائیں۔

کرشن چندر۔ تو کس کے ساتھ بیٹھوں؟ یہاں جتنے بھلے مانس کہلاتے ہیں۔ ان میں کوئی میرے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے؟ سب کے سب مجھے حقیر سمجھتے ہیں۔ میں یہ ذلت نہیں برداشت کرسکتا۔ آپ ان لوگوں میں ایک بھی ایسا آدمی بتلاسکتے ہیں، جو نیکی کا پتلا ہو؟ سب کے سب دغاباز، حرام کار، غریبوں کا گلا کاٹنے والے ہیں۔ میں اپنے تئیں ان سے بدتر نہیں سمجھتا۔ میں اپنے کیے کا پھل بھوگ رہا ہوں۔ وہ ابھی تک بچے ہیں۔ بس مجھ میں اور ان میں اتنا ہی فرق ہے وہ ایک گناہ کو چھپانے کے لیے اور بھی صدہا گناہ کیا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے بگلا بھگتوں کے سامنے میں حقیر بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں ان لوگوں کے سامنے بیٹھتا ہوں جو اس حالت میں بھی میری عزت کرتے ہیں۔ جو اپنے کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ جو کوّے ہوکر ہنس کی نقل نہیں کرتے۔ اگر میرے اس برتاؤ سے آپ کی عزت میں بٹہ لگتا ہے۔ تو میں زبردستی آپ کے گھر نہیں رہنا چاہتا۔

اما ناتھ۔ پرماتما میرا گواہ ہے کہ میں نے اس خیال سے ان آدمیوں کو تنبیہ نہیں کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اکثر سرکاری ملازموں اور حاکموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ آپ کی اس آزادی سے مجھے اُن کے سامنے آنکھیں نیچی کرنی پڑتی ہیں۔

کرشن چندر۔ تو آپ ان حضرات سے کہہ دیجیے کہ کرشن چندر کتنا ہی گیا گزرا ہے۔ پھر بھی ان لوگوں سے اچھا ہے۔ میں بھی کبھی سرکاری ملازم تھا۔ اور ملازموں کے طور وطریق کا کچھ تجربہ رکھتا ہوں۔ وہ سب کے سب شاطر چور ہیں۔ پورے ڈاکو گناہ میں گردن تک ڈوبے ہوئے اور ایسے اسفلوں سے میں اخلاق کا سبق نہیں لینا چاہتا۔

اما ناتھ۔ آپ کو حکام کی پرواہ نہ ہو۔ لیکن میری تو روزی انھیں کے نگاہِ کرم پر منحصر ہے۔ میں کیوں کر ان کی مخالفت کرسکتا ہوں۔ آپ نے تو تھانہ داری کی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ، یہاں کا تھانہ دار آپ کی نگرانی کیا کرتاہے۔ وہ آپ کو رذیلوں کی صحبت میں دیکھے گا تو ضرور اس کی رپورٹ کرے گا۔ اور آپ کے ساتھ میں بھی غارت ہوجاؤں گا۔ یہ لوگ کس کے دوست ہوتے ہیں؟

کرشن چندر۔ یہاں کا تھانہ دار کون ہے؟

اما ناتھ۔ سید مسعود عالم۔

کرشن چندر۔ اچھا وہ دغاباز! سارے زمانے کا بے ایمان! چھٹا ہوا بدمعاش۔ وہ میرے ماتحت ہیڈکانسٹبل رہ چکا ہے۔ اور ایک بار میں نے ہی اُسے جیل سے بچایا تھا۔ اب کے اسے یہاں آنے دیجیے۔ ایسی خبر لوں کہ وہ بھی یاد کرے!

اما ناتھ۔ اگر آپ کو یہ سب طوفان کھڑا کرناہے، تو براہِ کرم مجھے اپنے ساتھ نہ سمیٹیے۔ آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا پر میں پس جاؤں گا!

کرشن چندر۔ اسی لیے آپ صاحب عزت ہیں۔ اور میرا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ مہربان کیوں منہ کھلواتے ہو؟ تھانہ داروں کی دلالی کرکے بھی تمھیں اپنی عزت کا غرّہ ہے!

اما ناتھ۔ میں بے عزت سہی، مکار سہی، دغاباز سہی، دلال سہی، پر آپ کے ساتھ میں نے جو سلوک کیے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زبان سے ایسی باتیں نہ نکلیں۔

کرشن چندر۔ تم نے میرے ساتھ سلوک کیے ہیں۔ یا میرے خاندان کو غارت کردیا؟ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔ تمھارے سلوک کی تعریف یہاں خوب سن چکا۔ تم نے میری بیوی کی جان لی۔ میری ایک لڑکی کو نہ جانے کس فاقہ مست قلانچ کے گلے باندھ دیا۔ اور دوسری لڑکی سے مزدوروں کی طرح کام لے رہے ہو؟ یہ تمھارا سلوک ہے! بے چاری بھولی بھالی عورت کو جھانسہ دے کر مقدمہ کی پیروی کرنے کے بہانہ

سے سب روپیہ اڑالیے اور تب اسے اپنے گھر لاکر اس کی مٹی خراب کی۔ آج اپنے سلوک کی شیخی بگھارتے ہو!

خود پسند انسانوں کو دوسروں کی احسان فراموشی سے جتنا صدمہ ہوتا ہے اتنا اور کسی بات سے نہیں ہوتا۔ وہ چاہے اپنی نیکیوں کے لیے احسان کا گرویدہ نہ ہو۔ چاہے اس نے نیکی کرکے دریا ہی میں ڈال دی ہو۔ پر اپنے حسن عمل کا خیال کرکے اس روحانی مسرت ہوتی ہے۔ وہ احسان کا اظہار چاہے نہ پسند کرے، پر یہ ضرور چاہتا ہے، کہ دل میں اس کی تحسین کی جائے۔ اما ناتھ نے سوچا، دنیا کتنی بدگمان ہے۔ میں نے ان کے لیے مہینوں عدالتوں کی خاک چھانی۔ وکیلوں کی کیسی کیسی خوشامدیں کیں۔ عمّال کے کیسے کیسے نازونخرے اٹھائے۔ اپنے کتنے نج کے روپے پھونک دیے۔ اس کا یہ صلہ مل رہاہے۔ تین تین عورتوں کی برسوں پرورش کی۔ سمن کی شادی کے لیے مہینوں سرگرداں رہا۔ اور شانتا کی شادی کے لیے مہینوں سے دوادوش کررہاہوں دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑگئے۔ روپے پیسے کی فکر میں جسم گھل گیا۔ دانہ پانی چھوٹ گیا۔ اس کا یہ ثمرہ! واہ ری اندھی دنیا! یہاں بھلائی کرنے میں بھی داغ لگ جاتا ہے۔ یہ سوچ کر ان کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ بولے: ”بھائی صاحب! میں نے جو کچھ کیا۔ وہ بہتری ہی کے خیال اور ارادہ سے کیا۔ پر میرے ہاتھوں میں جَس نہیں ہے۔ ایشور کو اگر یہی منظور ہے کہ میرا کیا کرایا سارا مٹی میں مل جائے ۔ تو یہی سہی۔ میں نے آپ کو لوٹ لیا۔ آپ کی ساری دولت ہضم کرلی۔ اب جو سزا چاہے دیجیے۔اور کیا کہوں؟“

اما ناتھ کہنا چاہتے تھے کہ اب تو جو کچھ ہوگیا وہ ہوگیا۔ اب سے میرا گلا چھوڑیے۔ شانتا کی شادی کا انتظام کیجیے۔ اپنا گھر بار سنبھالیے۔ پر ڈر ہے، کہ غصہ کی حالت میں یہ سچ مچ شانتا کو لے کر یہاں سے کسی طرف نکل نہ جائیں۔اس لیے غم کھانا ہی مصلحت سمجھا۔ غصہ ضعیف نیک دلوں میں رحم کی صورت اختیار کرلیتاہے۔ کسی گداگر کی گالیاں سُن کر ایک شریف انسان خاموش رہنے کے سوا اور کیا کرسکتا ہے! نہیں بلکہ اسے اس پر رحم آجاتا ہے۔

اما ناتھ کے تحمل نے کرشن چندر کا غصہ بھی فرو کیا۔ پر ان میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خیالات میں ڈوبے بیٹھے تھے جیسے دو کتے لڑنے کے بعد آمنے

سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اما ناتھ سوچتے تھے، بہت اچھا ہوا کہ میں خاموش ہوگیا۔ ورنہ دنیا مجھے کو بُرا کہتی، کرشن چندر سوچتے تھے، میں نے بُرا کیا۔ جو یہ گڑے مردے اکھاڑے بے جا غصہ اکثر بیداریٔ روح کا باعث ہوتا ہے۔ کرشن چندر کو اب اپنے فرض کا راستہ نظر آنے لگا۔ شام کے وقت انھوں نے اما ناتھ سے پوچھا: "شانتا کی شادی تو آپ نے کہیں طے کرر کھی ہے نا؟"

اما ناتھ۔ جی ہاں چنار میں پنڈت مدن سنگھ کے لڑکے سے؟

کرشن چندر۔ نام سے تو کوئی معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کتنا جہیز ٹھیرا ہے؟

اما ناتھ۔ ایک ہزار۔

کرشن چندر۔ اور غالبًا اتنا ہی اور اوپر خرچ ہوگا؟

اما ناتھ۔ ہاں اور کیا۔

کرشن چندر نے جرأت سے پوچھا۔ "اتنے روپیوں کا انتظام کیوں کر ہوگا؟"

اما ناتھ۔ ایشور کسی نہ کسی طرح بیڑا پار لگائیں گے۔ ایک ہزار تو میرے پاس ہے۔ صرف ایک ہزار کی اور فکر ہے۔

کرشن چندر نے نہایت ندامت آمیز انکسار سے کہا: "میری حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں ....۔"

اتنا کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

اما ناتھ نے تسکین آمیز لہجہ میں کہا: "آپ کچھ اندیشہ نہ کریں، میں سب انتظام کرلوں گا۔"

کرشن چندر۔ پرماتما آپ کو اس نیکی کا اجر خیر دیں گے۔ بھیا آج میں غصہ میں تمھیں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ اس کا برا نہ ماننا۔ میں ابھی اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہوں۔ اس دوزخی نے مجھے دیوانہ بنادیا ہے۔ اس نے میری روح کو کچل ڈالا ہے۔ میرے جذبات مردہ ہوگئے ہیں۔ اس طلسم میں پڑکر فرشتہ بھی دیو ہوجائے تو عجب نہیں مجھ میں یہ طاقت کہاں ہے کہ شادی کا اتنا بھاری بوجھ سنبھال سکوں۔ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچالیا۔ پر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میں یہ بوجھ تمھاری گردن پر رکھ کر خود کاہل بنا بیٹھا رہوں۔ مجھے بھی اجازت دو کہ جاکر کہیں چار پیسے کمانے کی فکر کروں۔ میں کل بنارس جاؤں گا۔ یوں میرے

پہلے کے کئی ملاقاتی ہیں پر میں ان کے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا۔ سمن کا گھر کس محلّہ میں ہے؟

اما ناتھ کا چہرہ فق ہوگیا۔ بولے: "شادی تک تو آپ یہیں رہیے اس کے بعد جہاں مرضی ہو چلے جایئے گا"۔

کرشن چندر۔ نہیں مجھے کل جانے دو۔ شادی کے ایک ہفتہ قبل لوٹ آؤں گا۔ دوچار دن سمن کے یہاں ٹھہر کر کوئی ملازمت تلاش کرلوں گا۔ کس محلّہ میں رہتی ہے؟

اما ناتھ۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ادھر عرصہ سے اُدھر نہیں گیا۔ شہر والوں کا ٹھکانہ ہی کیا ہے روز مکان بدلتے پھرتے ہیں۔ معلوم نہیں، اب کس محلّہ میں ہو۔

رات کو کھانا کھانے کے وقت کرشن چندر نے شانتا سے سمن کا پتہ پوچھا۔ شانتا اما ناتھ کا اشارہ نہ سمجھ سکی، پورا پتہ بتلادیا۔

(۶)

شہر کی میونسپل بورڈ میں کل ۱۸ ممبر تھے۔ اُن میں آٹھ مسلمان تھے۔ اور ۱۰ ہندو۔ تعلیم یافتہ ممبروں کی تعداد غالب تھی۔ اس لیے پدم سنگھ شرما کو کامل یقین تھا۔ کہ بورڈ میں اربابِ نشاط کے اخراج کی تجویز منظور ہوجائے گی۔ وہ سب ممبروں سے مل چکے تھے اور اس مسئلہ کے متعلق ان کے اعتراضات اور شکوک کا ازالہ کرچکے تھے۔ لیکن ان میں بعض اصحاب ایسے تھے۔ جن کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ یہ سب لوگ بہت معزز، بارسوخ مہاجن اور تاجر تھے۔ اس لیے شرماجی کو یقین کے ساتھ یہ خوف بھی تھا کہ کہیں تعلیم یافتہ اصحاب بھی ان کے دباؤ میں نہ آجائیں۔ ہندوؤں میں مخالف جماعت کے سرغنہ سیٹھ بلبھدرداس تھے۔ اور مسلمانوں میں حاجی ہاشم، جب تک بٹھل داس کے اہتمام میں یہ تحریک تھی کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ لیکن جب سے پدم سنگھ اور چند دیگر اراکین اس تحریک میں شامل ہوگئے تھے، تب سے سیٹھ جی اور حاجی صاحب کے پیٹ میں چوہے دوڑرہے تھے، انھیں معلوم تھا کہ عنقریب یہ تجویز بورڈ میں پیش ہوگی۔ اس لیے دونوں حضرات اس حملہ کی مدافعت کی پیش بندیاں کررہے تھے۔ پہلے حاجی صاحب نے مسلمان ممبروں کو جمع کیا۔ حاجی صاحب کا عوام پر بہت اثر تھا۔ اور وہ شہر کے مسلمانوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ باقی سات ممبروں میں مولانا تیغ علی ایک امام باڑہ کے متولی

تھے۔ منشی ابوالوفا عطر اور تیل کے ایک کارخانہ کے مہتمم تھے۔ بڑے شہروں میں ان کی کئی دکانیں تھیں۔ منشی عبد اللطیف ایک بڑے زمیندار۔ لیکن بیشتر شہر ہی میں رہتے تھے۔ انھیں شعروسخن کا ذوق تھا اور خود بھی اچھے شاعر تھے۔ شاکر بیگ اور شریف حسن وکالت کرتے تھے۔ ان کے تمدنی خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ سیّد شفقت علی پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور خان صاحب شہرت خاں اطبا میں بہت ممتاز تھے۔ یہ دونوں حضرات گوشۂ عافیت کے دلدادہ تھے مگر تنگ خیال نہ تھے۔ دونوں راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ اہل قوم انھیں عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حاجی ہاشم نے فرمایا: ''برادرانِ وطن کی یہ نئی چال آپ لوگوں نے ملاحظہ کی؟ واللہ ان کو سوجھتی خوب ہے۔ بغلی گھونسے مارنا کوئی ان سے سیکھ لے۔ میں تو ان کی ریشہ دوانیوں سے اتنا بدظن ہوگیا ہوں کہ اگر ان کی نیک نیتی پر ایمان لانے سے نجات بھی ہوتی ہو تو نہ لاؤں۔''

منشی ابوالوفا بولے: ''مگر اب خدا کے فضل سے ہمیں بھی اپنے نفع نقصان کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ ہماری مجموعی تعداد کو گھٹانے کی صریح کوشش ہے۔ طوائفیں نوّے فیصد مسلمان ہیں جو روزہ رکھتی ہیں، عزاداری کرتی ہیں، مولود اور عرس کرتی ہیں۔ ہم کو ان کے ذاتی فعلوں سے کوئی بحث نہیں ہے۔ نیک وبد کی سزا وجزا دینا خدا کا کام ہے ہم کو تو صرف ان کی تعداد سے غرض ہے۔

تیغ علی۔ مگر ان کی تعداد کیا اتنی زیادہ ہے، کہ اس سے ہماری مجموعی ووٹ پر کوئی اثر پڑسکتا ہے؟

ابوالوفا۔ کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہی پڑے گا۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ برادرانِ وطن کو دیکھیے۔ وہ ڈوموں کو بھی اپنی قوم میں ملانے پر آمادہ ہیں۔ اُن کے سایہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ انھیں جانوروں سے زیادہ حقیر سمجھتے ہیں۔ مگر محض اپنے پولیٹکل مفاد کے لیے انھیں اپنے قومی جسم کا ایک عضو بنائے ہوئے ہیں۔ ڈوموں کا شمار جرائم پیشہ فرقوں میں ہے۔ علیٰ ہذٰہ پاسی، بہرہ وغیرہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، سرقہ، رہزنی، قتل، یہ ان کے پیشے ہیں مگر جب انھیں ہندو جماعت سے علیٰحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ہمارے اہلِ وطن کیسے چراغ پا ہوتے ہیں۔ وید اور شاستر سے سندیں پیش کرتے پھرتے ہیں۔ ہم کو اس معاملہ میں

انھیں سے سبق لینا چاہیے۔

سیّد شفقت علی نے متانت سے فرمایا۔ ان جرائم پیشہ اقوام کے لیے گورنمنٹ نے شہروں میں خطّے علیحدہ کردیے ہیں، ان پر پولیس کی نگرانی ہوتی ہے۔ میں خود اپنے دورانِ ملازمت میں ان کی نقل و حرکت کی رپورٹ لکھا کرتا تھا۔ مگر میرے خیال میں کسی ذمہ دار ہندو نے گورنمنٹ کے اس طرزِ عمل کی مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ میری نگاہ میں سرقہ یا قتل اتنے مکروہ افعال نہیں ہیں، جتنی عصمت فروشی۔ ڈومنی بھی جب درجہ عصمت سے گرجاتی ہے تو وہ اپنی اپنی برادری سے خارج کردی جاتی ہے۔ اگر کسی ڈوم کے پاس کافی دولت ہو تو وہ اس حُسن کے بازار میں من مانا سودا خرید سکتا ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم اپنے پولیٹکل مفاد کے لیے اس حدتک ذلیل بننے پر مجبور ہوں۔ اگر ان طوائفوں کی دینداری کے طفیل میں خدا سارے مسلمان کو جنت عطا کرے۔ تو میں دوزخ میں جانا پسند کروں گا، اگر ان کی تعداد کی بنا پر ہم کو اس ملک میں بادشاہی بھی ملتی ہو، تو میں قبول نہ کروں، میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ انھیں مرکزشہر ہی سے نہیں، حدود شہر سے خارج کردینا چاہیے۔

حکیم شہرت خاں۔ جناب میرے امکان میں ہوتو میں انھیں ہندستان سے نکال دوں۔ ان سے ایک جزیرہ الگ آباد کروں۔ مجھے اس بازار کے خریداروں سے اکثر سابقہ رہتا ہے۔ اگر میرے مذہبی عقائد میں فرق نہ آئے تو میں یہ کہوں گا۔ کہ طوائفیں ہیضے اور طاعون کا اوتار ہیں۔ ہیضہ دوگھنٹوں میں کام تمام کردیتا ہے۔ پلیگ دو دن میں۔ لیکن یہ جہنمی ہستیاں رُلارُلا کر اور گھلاگھلاکر مارتی ہیں۔ منشی ابوالوفا صاحب انھیں جنت کی حوریں سمجھتے ہوں۔ لیکن فی الواقع یہ وہ کالی ناگنیں ہیں جن کی آنکھوں میں زہر ہے۔ یہ وہ چشمے ہیں، جن سے جرائم کے دریا نکلتے ہیں۔ کتنی ہی نیک بیویاں ان کی بدولت زندہ درگور ہیں، کتنے ہی شریف زادے اُن کی بدولت خون کے آنسو رورہے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بے شرم طوائفیں اپنے تئیں مسلمان کہتی ہیں۔

شریف حسن نے فرمایا:''اس میں تو کوئی برائی نہیں ہے کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتی ہیں برائی یہ ہے کہ اسلام بھی انھیں راہِ راست پرلانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اسلام نے بھی انھیں اپنے دائرہ عمل سے خارج کر دیاہے۔ بیشک ہمارے مولانا

صاحب سبز عمامہ باندھے، آنکھوں میں گہرا سرمہ لگائے، گیسو سنوارے۔ ان کی مذہبی تلقین و تسکین کے لیے جا پہنچے ہیں۔ اُن کے دسترخوان سے میٹھے لقمے کھاتے ہیں خوشبودار خمیرے کے کش لگاتے ہیں۔ اور ان کے خاصدان سے معطر بیڑے اڑاتے ہیں۔ بس اسلام کی مذہبی قوتِ اصلاح یہیں ختم ہوجاتی ہے۔ اپنے بُرے فعلوں پر نادم ہونا انسانی خاصہ ہے۔ یہ گمراہ عورتیں پیشتر نہیں تو شراب کا نشہ اترنے پر ضرور اپنی حالت پر افسوس کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت ان کا پچھتانا بے سود ہوتا ہے۔ اُن کے گزران کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہتی کہ ان لڑکیوں کی جائز طور پر شادی ہوسکے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی پرورش کی بھی صورت نکل آئے۔ تو میرے خیال میں زیادہ نہیں تو ۷۵ فیصد طوائفیں ضرور اسے خوشی سے قبول کرلیں۔ ہم چاہے خود کیسے ہی سیاہ کار ہوں۔ پر اپنی اولاد کو نیک اور راستباز دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، طوائفوں کو شہر سے خارج کردینے سے ان کی اصلاح نہیں ہوسکتی اس نقطہ خیال سے تو میں اخراج کی تحریک پر اعتراض کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں۔ پر پولیٹکل مفاد کی بناپر میں اس کی مخالفت نہیں کرسکتا میں کسی فعل کو قومی خیال سے پسندیدہ نہیں سمجھتا تاوقتیکہ وہ اخلاقاً بھی پسندیدہ نہ ہو۔

تیغ علی۔ بندہ نواز، سنبھل کر باتیں کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے اوپر کفر کا فتویٰ صادر ہو جائے۔ یہ پولیٹکل مفاد کا دور ہے۔ حق اور انصاف کا نام نہ لیجیے۔ اگر آپ مدرس ہیں تو ہندو لڑکوں کو فیل کیجیے، تحصیلدار ہیں تو ہندوؤں پر بیجا ٹیکس لگائیے۔ مجسٹریٹ ہیں تو ہندوؤں کو سخت سزائیں دیجیے۔ سب انسپکٹر پولیس ہیں تو ہندوؤں پر جھوٹے مقدمے دائر کیجیے۔ تحقیقات کرنے جائیے تو ہندوؤں کے بیانات غلط لکھیے۔ اگر آپ چور ہیں تو کسی ہندو کے گھر ڈاکہ ڈالیے۔ اگر آپ کو حسن و عشق کا ذوق ہے تو کسی ہندو نازنین پر ڈورے ڈالیے۔ تب آپ قوم کے خادم، قوم کے محسن، قومی کشتی کے ناخدا سب کچھ ہیں۔

حاجی ہاشم تلملاگئے۔ منشی ابوالوفا کے تیوروں پر بل پڑگئے۔ تیغ علی کی تیغِ آبدار نے انھیں گھائل کردیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ شاکربیگ بول اُٹھے۔"بھائی صاحب! یہ طعن و طنز کا موقع نہیں ہے یہ ہمارا باہمی مشورہ ہے کوئی مناظرہ کی مجلس نہیں زبان تیز مصالحت کے حق میں زہر قاتل ہے۔ میں شاہدان طناز کو نظام تمدن میں بالکل بیکار یا مایۂ شر نہیں سمجھتا۔ جب آپ کوئی مکان تعمیر کراتے ہیں۔ تو اس میں بدررو کا بنانا ضروری

سمجھتے ہیں۔ اگر بدررو نہ ہو، تو چند سالوں میں دیواروں کی بنیادیں ہل جائیں۔ اس فرقہ کو سوسائٹی کا بدررو سمجھنا چاہیے۔ اور جس طرح بدررو مکان کے نمایاں حصے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ نگاہ سے پوشیدہ ایک گوشہ میں بنائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس فرقہ کو بھی شہر کے پُر فضا مقامات سے ہٹاکر کسی گوشہ میں آباد کرنا چاہیے۔"

منشی ابوالوفا اس تقریر کا پہلا حصہ سُن کر بہت خوش ہوئے تھے پر بدررو کی تشبیہ پر ان کا چہرہ افسردہ ہوگیا، حاجی ہاشم نے عبد اللطیف کی طرف مایوسانہ انداز سے دیکھ کر کہا، "جناب کچھ آپ بھی فرماتے ہیں یا قومی اتحاد کی رَو میں آپ کے قدم بھی اکھڑ گئے؟"

عبداللطیف نے جواب دیا، "جناب رندوں کو کسی کی دشمنی یا دوستی سے کیا واسطہ؟ اپنا مشرب تو صلح کن ہے۔ میں اب تک یہی فیصلہ نہیں کرسکا۔ کہ عالمِ بیداری میں ہوں یا خواب میں ایسے ایسے لائق و فائق حضرات کو ایک بے سر پیر کی بات کی تائید میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے دیکھتا ہوں۔ کیونکہ باور کروں، کہ بیدار ہوں۔ صابن، چمڑے، اور مٹی کے تیل کی دکانوں سے آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔ کپڑے، برتن، ادویات وغیرہ کی دکانیں، چوک میں ہیں۔ آپ انھیں مطلق بے موقع نہیں سمجھتے۔ کیا آپ کی نگاہ میں حُسن کی اتنی بھی وقعت نہیں، اور کیا یہ ضروری ہے کہ اسے کسی تنگ وتاریک کوچہ میں بند کردیا جائے؟ کیا وہ باغ باغ کہلانے کا مستحق ہے۔ جہاں سرو کی قطاریں ایک گوشہ میں ہوں بیلے اور گلاب کے تختے دوسرے گوشہ میں ۔ اور روشوں کی دونوں طرف نیم اور ببول کے درخت لگے ہوں۔ وسط میں پیپل کا ایک ٹھونٹھ ہو۔ اور حوض کے کنارے ناگ پھنی کا کنج؟ چیل اور کوّے دونوں طرف درختوں پر بیٹھے اپنا راگ الاپتے ہوں۔ اور بلبلیں کسی گوشہ تاریک میں درد کے ترانے گاتی ہوں، میں اس تحریک کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔ میں اسے اس قابل ہی نہیں سمجھتا، کہ اس پر متانت سے بحث کی جائے۔

حاجی ہاشم مسکرائے، ابوالوفا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ دیگر حضرات نے فلسفیانہ تبسم کے ساتھ یہ مضحِک تقریر سنی۔ پر مولانا تیغ علی اتنے متحمل نہ تھے۔ تیز ہوکر بولے: "کیوں غریب پرور اب کے بورڈ میں یہ تجویز کیوں نہ پیش کردی جائے۔ کہ میونسپلٹی عین چوک میں خاص اہتمام کے ساتھ ایک مینا بازار آراستہ کرے۔ اور جو حضرات اس بازار کی سیر کو تشریف لے جائیں۔ انھیں سرکار کی جانب سے خوشنودیٔ مزاج کا پروانہ عطا

کیاجائے۔ میرے خیال میں اس تجویز کی تائید کرنے والے بہت نکل آئیں گے۔ اور محرک کا نام زندہ جاوید ہوجائے گا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے مزار پر عرس ہوں گے، اور اپنے گوشۂ لحد میں پڑا ہوا حسن کی بہار لوٹے گا، اور دل پذیر نغمے سنے گا۔"

منشی ابوالوفا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ حاجی ہاشم نے دیکھا۔ کہ بات بڑھنا چاہتی ہے۔ تو بولے، "میں اب تک سنا کرتا تھا۔ کہ اصول بھی کوئی چیز ہے۔ پر آج معلوم ہوا، کہ محض ایک وہم ہے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا۔ کہ آپ ہی حضرات اسلامی وظائف کے ڈیپوٹیشن لے کرگئے تھے۔ مسلمان قیدیوں کو مذہبی تلقین کی تجویزیں کررہے تھے۔ اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو اُن موقعوں پر آپ ہی لوگ پیش پیش نظر آتے تھے۔ مگر آج یکایک یہ انقلاب دیکھ رہاہوں۔ خیر آپ کا تلون آپ کو مبارک ہے۔ بندہ اتنا سہل الیقین نہیں ہے۔ میں نے یہ زندگی کا اصول بنالیا ہے کہ برادرانِ وطن کی ہر ایک تجویز کی مخالفت کروں گا۔ کیونکہ مجھے ان سے کسی بہبودی کی توقع نہیں ہوسکتی۔"

ابوالوفا نے فرمایا: "علی ہٰذہ مجھے رات کو آفتاب کے ظہور کا یقین ہوسکتا ہے۔ پر برادرانِ یوسف کی نیک نیتی پر یقین نہیں آسکتا"۔

سیّد شفقت علی۔حاجی صاحب قبلہ۔ آپ نے ہم لوگوں کو بے اصول اور زمانہ ساز سمجھتے ہیں متانت سے کام نہیں لیا۔ ہمارا اُصول جو تب تھا۔ وہی اب بھی ہے، اور وہی ہمیشہ رہے گا۔ اور وہ ہے اسلامی وقار کا قائم کرنا۔ اور ہر ایک جائز طریق سے برادرانِ ملت کے بہبود کی کوشش کرنا۔ اگر ہمارے فائدے میں برادرانِ وطن کا نقصان ہو۔ تو ہم کو اس کی پرواہ نہیں۔ لیکن جس تجویز کے نفاذ سے ان کے ساتھ ہمیں بھی فائدہ پہنچتا ہے اور ان سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کی مخالفت کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ہم مخالفت کے لیے مخالفت کرنا پسند نہیں کرتے۔

رات زیادہ جاچکی تھی، مجلس برخاست ہوئی۔ اس مباحثہ سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہوسکا۔ لوگ دلوں میں جو خیال قائم کرکے آئے تھے۔ اسی پر قائم رہے۔ حاجی ہاشم کو اپنی فتح کا جو یقین کامل تھا، اس میں اب کچھ شبہ نظر آنے لگا۔

(۷)

اس تجویز کے مخالف ہندو ممبروں کو جب مسلمانوں کے اس جلسہ کا حال معلوم ہوا

تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ انھیں مسلمانوں سے جو امید تھی۔ وہ منقطع ہوگئی۔ کل دس ہندو ممبر تھے۔ سیٹھ بلبھدرداس چیرمین تھے۔ ڈاکٹر شیاماچرن، وائس چیرمین، لالہ چمن لال اور دیناناتھ تیواری اہل تجارت کے قائم مقام تھے۔ پدم سنگھ اور مسٹر رستم بھائی وکیل تھے رمیش دت کالج کے پروفیسر، لالہ بھگت رام ٹھیکہ دار، پنڈت پربھاکرراؤ ہندی اخبار ''جگت'' کے ایڈیٹر اور کنور انرُدھ بہادر سنگھ ضلع کے سب سے بڑے تعلقہ دار تھے۔ چوک کی دکانوں میں زیادہ تر بلبھدرداس اور چمن لال کی دکانیں تھیں۔ چاول منڈی میں کتنے ہی مکانات دیناناتھ کے تھے۔ یہ تینوں حضرات اس تجویز کے خلاف تھے۔ لالہ بھگت رام کا کاروبار چمن لال کی مالی امداد سے چلتا تھا۔ اس لیے ان کی رائے بھی انھیں کی طرف تھی۔ پربھاکرراؤ، رمیش دت، رستم بھائی اور پدم سنگھ اس تجویز کے معاون تھے، ڈاکٹر شیاماچرن اور کنور صاحب کی رائیں ابھی تک غیر معلوم تھیں۔ دونوں فریق ان سے مدد کی امید رکھتے تھے۔ انھیں پر دونوں کی ہارجیت کا فیصلہ تھا۔ پنڈت پدم سنگھ ابھی بارات سے نہیں لوٹے تھے۔ بلبھدرداس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور سب ہندو ممبروں کو اپنی آراستہ کوٹھی میں مدعو کیا۔ اس کا خاص مدعا یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور کنورانرُدھ سنگھ کو اپنا ہم خیال بنالیا جائے۔ پربھاکرراؤ، مسلمانوں کے زبردست مخالف تھے۔ چنانچہ وہ لوگ اس مسئلہ کو ہندو، مسلمان کا رنگ دے کر انھیں بھی اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے۔

دیناناتھ تیواری نے فرمایا،''ہمارے مسلم بھائیوں نے تو اس معاملہ میں بڑی دلیری سے کام لیا۔ مجھے ان سے ایسی توقع نہ تھی۔ لیکن اس میں جو راز پوشیدہ ہے۔ غالبًا وہ آپ لوگوں پر روشن ہوگا۔ انھوں نے ایک پنتھ دوکاج کی پالیسی برتی ہے۔ ایک طرف تو اصلاح معاشرت کی نیک نامی ہاتھ آتی ہے۔ اور دوسری جانب ہندوؤں کا نقصان پہنچانے کا ایک بہانہ ملتا ہے۔ ایسے موقع پر بھلا وہ کب خطا کرنے والے تھے؟''

سیٹھ چمن لال۔ مجھے پالیٹکس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور نہ اس کے قریب جاتاہوں۔ لیکن ہمارے مسلم بھائیوں نے اس وقت ہماری گردن بری طرح پکڑی ہے۔ انھیں چپڑیاں مل رہی ہیں اور دو، دو، چاول منڈی اور چوک میں زیادہ تر مکانات ہندوؤں کے ہیں، اگر بورڈ نے یہ تجویز منظور کرلی۔ تو اس کا سارا وبال ہندوؤں کے سر پڑے گا۔ اور انھیں مفت کی نیک نامی حاصل ہوگی۔ میں تو ان دوررسی کا قائل ہوں۔ چھپے حملے کرنا کوئی ان سے سیکھ

لے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے، کہ سود کے پردے میں ہندوؤں پر حملے کیے۔ اب یہ نئی ترکیب نکالی، افسوس ہے کہ ہمارے ہی بھائیوں میں چند حضرات، سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے برادرانِ وطن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کا یہ انحراف ہندو قوم کے لیے کس قدر نقصان کا باعث ہوگا۔

مقامی کونسل میں سود کا مسئلہ درپیش تھا۔ تو پربھاکرراؤ نے اس کی خوب مخالفت کی تھی۔ چمن لال نے ان کا ذکر کرکے اور اخراج کی تحریک کو مالی نقطہ نظر سے پیش کرکے پربھاکرراؤ کو مطابقت کی زنجیر میں باندھنے کی کوشش کی۔ پربھاکرراؤ نے بکیسانہ انداز سے رستم بھائی کی طرف دیکھا۔ گویا ان سے کہہ رہے ہیں۔ کہ لوگ مجھ پر دو مُنہی تلوار چلارہے ہیں۔ آپ مجھے ان سے بچائیے۔ رستم بھائی نہایت بیباک اور صاف گو آدمی تھے۔ وہ چمن لال کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اور بولے:"مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتاہے۔ کہ اب لوگ ایک تمدنی معاملہ کو ہندو، مسلم نزاع کی صورت دے رہے ہیں، سود کی تجویز کو بھی یہی رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسے قومی معاملات کو امر متنازعہ بنانے سے ممکن ہے۔ چند ساہوکاروں کو فائدہ ہو۔ لیکن اس قومیت کو جو صدمہ ہوتاہے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ تجویز زیرِ بحث کے پاس ہوجانے سے ہندو ساہوکاروں کو زیادہ نقصان ہوگا۔ لیکن مسلمانوں پر بھی اس کا کم و بیش اثر ضرور پڑے گا۔ چوک اور چاول منڈی میں مسلمانوں کے مکانات کم نہیں ہیں۔ ہم کو اختلاف یا تعصب کی دُھن میں اپنے مسلمان بھائیوں کی نیت کی صفائی پرشک کرنا مناسب نہیں۔ انھوں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ محض بہبودِ خلق کے خیال سے کیا ہے۔ اگر ہندوؤں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے، تو یہ حالات کی دوسری صورت ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر مسلمانوں کے مکانات زیادہ ہوتے، تب بھی ان کا یہی فیصلہ ہوتا۔ اس جلسے میں شاید کوئی صاحب ایسے ہوں گے جو ان اخلاقی اور مجلسی خرابیوں سے بے خبر ہوں۔ جن کی اصلاح کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی ہے۔ اگر آپ صدق دل سے ان برائیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ تو آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔ خواہ اس سے کتنا ہی مالی نقصان ہو اخلاق کے معاملہ میں جان کو بھی سر جُھکانا پڑتاہے۔ مال کا ذکر ہی کیا۔

پربھاکرراؤ کی جان میں جان آئی۔ بولے:"بس یہی میں بھی عرض کرنے والا تھا۔ یہ

ایک اخلاقی اور تمدنی مسئلہ ہے۔ مالی پہلو ہرگز اس کا اہم ترین پہلو نہیں ہے۔ ہندو قوم اپنی سخت گیریوں کے لیے پہلے ہی بدنام ہے اور اگر اس مسئلہ کے حل کرنے میں بھی اس پہلو کو تفوق دیا گیا، تو برادرانِ وطن کو پھر آواز کسنے کا موقع ملے گا۔ یہ بات آفتاب کی طرح روشن ہے کہ بازار حسن ہماری سوسائٹی کا ایک نہایت شرمناک حصہ ہے۔ اور اسے شہر کے نمایاں مقامات پر جگہ نہ ملنی چاہیے۔"

کنور انرُدھ بہادر سنگھ نے پربھاکر راؤ کی طرف دیکھ کر کہا: "حضرت آپ تو اپنے اخبار کی ترتیب میں محو رہتے ہیں۔ آپ کے پاس زندگی کے لطف اٹھانے کے موقع ہی کہاں ہیں۔ پر ہم جیسے بے فکروں کو تو تفریح کا کوئی نہ کوئی سامان چاہیے۔ شام کا وقت تو پولو کھیلنے میں کٹ جاتا ہے۔ دوپہر کا وقت سونے میں اور صبح کا وقت حکام کی ملاقات یا سیر سپاٹے میں۔ لیکن شام سے دس بجے رات تک بیٹھے کیا کریں گے؟ آج آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے۔ کل آپ کہیں گے کہ میونسپلٹی کے اندر کوئی بغیر اجازت کے ناچ یا مجرا نہ کرے۔ تب تو ہم لوگوں کا شہر میں رہنا ہی محال ہوجائے گا۔"

پربھاکر راؤ مسکرا کر بولے: "کیا پولو اور ناچ گانے کے سوا وقت گزاری کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کچھ پڑھا کیجیے۔"

کنور صاحب۔ پڑھنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ ہمیں کتابوں کے کیڑے بننے کی ضرورت نہیں۔ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے۔ اس کی تعلیم ہمیں مل چکی ہے۔ ہم فرانس اور اسپین کا ناچ جانتے ہیں۔ آپ نے اس کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کا ذکر انگریزی ناولوں میں پڑھا ہوگا۔ پیانو پر بیٹھا دیجیے۔ وہ راگ الاپوں کہ تبھوون اور موزارٹ بھی شرمندہ ہوجائیں۔ انگریزی آداب و اخلاق کے ہم ماہر ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کس موقع پر سولا ہیٹ پہننا چاہیے۔ کس موقعہ پر پگڑی ۔ ہم کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ آپ ہمارے کمرے میں کئی الماریاں کتابوں سے سجی ہوئی پائیں گے۔ پران کتابوں میں چمٹتے نہیں۔ آپ کی اس تجویز کے نفاذ سے ہمارا قلع قمع ہوجائے گا۔ اور پھر میرا تو عقیدہ ہے کہ جب تک انسان مدرسۂ حسن میں شاگردی نہ کرلے۔ اس کے مزاج میں نفاست اور لطافت نہیں آتی۔ پرانے زمانہ میں لوگ اس مدرسہ میں خوش طبعی، خوش گوئی، خوش فہمی، کی تعلیم پاتے تھے۔ آج کل کے تعلیم یافتہ حضرات جو بالکل روکھے

لے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے، کہ سود کے پردے میں ہندوؤں پر حملے کیے۔ اب یہ نئی ترکیب نکالی، افسوس ہے کہ ہمارے ہی بھائیوں میں چند حضرات، سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے برادرانِ وطن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کا یہ انحراف ہندو قوم کے لیے کس قدر نقصان کا باعث ہوگا۔

مقامی کونسل میں سود کا مسئلہ درپیش تھا۔ تو پربھاکرراؤ نے اس کی خوب مخالفت کی تھی۔ چمن لال نے ان کا ذکر کرکے اور اخراج کی تحریک کو مالی نقطۂ نظر سے پیش کرکے پربھاکرراؤ کو مطابقت کی زنجیر میں باندھنے کی کوشش کی۔ پربھاکرراؤ نے بکیسانہ انداز سے رستم بھائی کی طرف دیکھا۔ گویا ان سے کہہ رہے ہیں۔ کہ لوگ مجھ پر دو مُنھی تلوار چلارہے ہیں۔ آپ مجھے ان سے بچایئے۔ رستم بھائی نہایت بیباک اور صاف گو آدمی تھے۔ وہ چمن لال کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اور بولے:"مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتاہے۔ کہ اب لوگ ایک تمدنی معاملہ کو ہندو، مسلم نزاع کی صورت دے رہے ہیں، سود کی تجویز کو بھی یہی رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسے قومی معاملات کو امر متنازعہ بنانے سے ممکن ہے۔ چند ساہوکاروں کو فائدہ ہو۔ لیکن اس قومیت کو جو صدمہ ہوتاہے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ تجویز زیرِبحث کے پاس ہوجانے سے ہندو ساہوکاروں کو زیادہ نقصان ہوگا۔ لیکن مسلمانوں پر بھی اس کا کم و بیش اثر ضرور پڑے گا۔ چوک اور چاول منڈی میں مسلمانوں کے مکانات کم نہیں ہیں۔ ہم کو اختلاف یا تعصب کی دُھن میں اپنے مسلمان بھائیوں کی نیت کی صفائی پرشک کرنا مناسب نہیں۔ انھوں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ محض بہبودِ خلق کے خیال سے کیا ہے۔ اگر ہندوؤں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے، تو یہ حالات کی دوسری صورت ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر مسلمانوں کے مکانات زیادہ ہوتے، تب بھی ان کا یہی فیصلہ ہوتا۔ اس جلسے میں شاید کوئی صاحب ایسے ہوں گے جو ان اخلاقی اور مجلسی خرابیوں سے بے خبرہوں۔ جن کی اصلاح کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی ہے۔ اگر آپ صدق دل سے ان برائیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ تو آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔ خواہ اس سے کتنا ہی مالی نقصان ہو اخلاق کے معاملہ میں جان کو بھی سر جُھکانا پڑتاہے۔ مال کا ذکر ہی کیا۔

پربھاکرراؤ کی جان میں جان آئی۔ بولے:"بس یہی میں بھی عرض کرنے والا تھا۔ یہ

ایک اخلاقی اور تمدنی مسئلہ ہے۔ مالی پہلو ہرگز اس کا اہم ترین پہلو نہیں ہے۔ ہندو قوم اپنی سخت گیریوں کے لیے پہلے ہی بدنام ہے اور اگر اس مسئلہ کے حل کرنے میں بھی اس پہلو کو تفوق دیا گیا، تو برادرانِ وطن کو پھر آواز کسنے کا موقع ملے گا۔ یہ بات آفتاب کی طرح روشن ہے کہ بازار حسن ہماری سوسائٹی کا ایک نہایت شرمناک حصہ ہے۔ اور اسے شہر کے نمایاں مقامات پر جگہ نہ ملنی چاہیے۔"

کنورانرُدھ بہادر سنگھ نے پربھاکرراؤ کی طرف دیکھ کر کہا:"حضرت آپ تو اپنے اخبار کی ترتیب میں محو رہتے ہیں۔ آپ کے پاس زندگی کے لطف اٹھانے کے موقع ہی کہاں ہیں۔ پر ہم جیسے بے فکروں کو تو تفریح کا کوئی نہ کوئی سامان چاہیے۔ شام کا وقت تو پولو کھیلنے میں کٹ جاتا ہے۔ دوپہر کا وقت سونے میں اور صبح کا وقت حکام کی ملاقات یا سیر سپاٹے میں۔ لیکن شام سے دس بجے رات تک بیٹھے کیا کریں گے؟ آج آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے۔ کل آپ کہیں گے کہ میونسپلٹی کے اندر کوئی بغیر اجازت کے ناچ یا مجرا نہ کرے۔ تب تو ہم لوگوں کا شہر میں رہنا ہی محال ہوجائے گا۔"

پربھاکرراؤ مسکراکر بولے:"کیا پولو اور ناچ گانے کے سوا وقت گزاری کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کچھ پڑھا کیجیے"۔

کنور صاحب۔ پڑھنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ ہمیں کتابوں کے کیڑے بننے کی ضرورت نہیں۔ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے۔ اس کی تعلیم ہمیں مل چکی ہے۔ ہم فرانس اور اسپین کا ناچ جانتے ہیں۔ آپ نے اس کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کا ذکر انگریزی ناولوں میں پڑھا ہوگا۔ پیانو پر بیٹھا دیکھیے۔ وہ راگ الاپوں کہ تھوون اور موزارٹ بھی شرمندہ ہوجائیں۔ انگریزی آداب و اخلاق کے ہم ماہر ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کس موقع پر سولا ہیٹ پہننا چاہیے۔ کس موقعہ پر پگڑی ۔ ہم کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ آپ ہمارے کمرے میں کئی الماریاں کتابوں سے سجی ہوئی پائیں گے۔ پر ان کتابوں میں چمٹتے نہیں۔ آپ کی اس تجویز کے نفاذ سے ہمارا قلع قمع ہوجائے گا۔ اور پھر میرا تو عقیدہ ہے کہ جب تک انسان مدرسۂ حسن میں شاگردی نہ کرلے۔ اس کے مزاج میں نفاست اور لطافت نہیں آتی۔ پرانے زمانہ میں لوگ اس مدرسہ میں خوش طبعی، خوش گوئی، خوش فہمی، کی تعلیم پاتے تھے۔ آج کل کے تعلیم یافتہ حضرات جو بالکل روکھے

خشک، بے مذاق ہوتے ہیں۔ اس کا باعث صرف یہی ہے کہ وہ اس مدرسہ سے بے فیض رہتے ہیں۔ تان سین کی تان اور سورداس کے پد بھی ان کی طبیعت کو گرم نہیں کرسکتے۔ یہ تجویز اس بداخلاقی اور خشک دلی کا رنگ اور بھی پختہ کردے گی۔ میں اس سے ہرگز اتفاق نہیں کرسکتا۔"

کنورصاحب کی اس ظریفانہ اور طنز آمیز تقریر نے دونوں فریق کو مطمئن کردیا۔

ڈاکٹر شیاماچرن نے کنور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا،"میں اس مسئلہ کے متعلق کونسل میں چند سوالات پیش کرنے والا ہوں۔ جب تک گورنمنٹ ان کا کوئی جواب نہ دے۔ میں اپنی رائے نہیں ظاہر کرسکتا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے سوالات پڑھ کر سنادیے۔

رومیش دت نے کہا،"گورنمنٹ ان سوالات کا غالباً کوئی جواب نہ دے سکے گی۔"

ڈاکٹر صاحب۔ جواب ملے یا نہ ملے، سوال تو ہوجائے گا۔ اس کے سوا ہم اور کرہی کیا سکتے ہیں۔

سیٹھ بلبھدرداس کو یقین ہوگیا، کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ انھوں نے ایک مدلل تقریر میں اس تجویز کے ہرایک پہلو سے بحث کی، اور فرمایا،"میں تمدنی انقلاب کا موئد نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سوسائٹی بروقت ضرورت اپنی ترمیم خودبخود کرلیاکرتی ہے۔اُسے کسی مصلح کی ضرورت نہیں۔ اور جب تک وہ ترمیم عام طور سے مسلّم نہ ہوجائے۔ کوئی خارجی تحریک اسے پیدا نہیں کرسکتی۔ غیرملکی سفر کی روکاوٹیں، ذات پات کی تفریق، کھانے پینے کے بے معنی قیود۔ سب کے سب حالات روزگار کے سامنے سرجھکائے چلے جاتے ہیں۔ میں ان معاملات میں سوسائٹی کو بالکل آزاد رکھنا چاہتاہوں، ہم لوگ حریت پر جان دیتے ہیں۔ کیا ملکی حریت تمدنی آزادی کے بغیر حاصل ہوسکتی ہے؟ جس وقت قوم ہم آواز ہوکر کہے گی، کہ بالاخانوں پر یہ صورتیں دیکھنی ہمیں پسند نہیں۔ تو دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں ہے جو اس آواز کو اَن سُنی کرسکے۔" سیٹھ جی نے اپنی پُرمعنی تقریر کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا۔

آپ کو اپنے فنِ موسیقی پر بجا ناز تھا۔ جو لوگ اٹلی اور فرانس کے نغمات کا لطف اٹھاچکے ہیں وہ بھی ہمارے نغمہ کی لطافت، تاثیر اور روحانیت کے قائل ہیں۔ مگر وہی فرقہ

جس کی بیخ کنی پر ہمارے چند سرگرم احباب تُلے ہوئے ہیں۔ اس پاکیزہ اور بہشتی نعمت کا پاسبان بناہوا ہے۔ کیا آپ اس فرقہ کو نیست و نابود کرکے اپنے بزرگوں کے اس بے بہا ترکہ کو، اس طرح سے خاک میں ملادیں گے؟ کیا آپ نہیں جانتے؟ کہ ہم میں اس وقت جو کچھ قومی اور مذہبی جذبات باقی رہ گئے ہیں اور ناموران سلف سے جو کچھ عقیدت ہے۔ وہ خاصتاً اسی فن کا طفیل ہے۔ ورنہ آج کوئی رام اور کرشن، شیو اور شنکر کا نام بھی نہ جانتا۔ ہمارا بڑے سے بڑا دشمن بھی ہمارے دلوں سے قومیت کا احساس مٹانے کے لیے اس سے بہتر تدبیر خیال میں نہیں لاسکتا۔ میں یہ نہیں کہتا، کہ یہ فرقہ تخریب اخلاق کا معاون نہیں۔ یہ دعویٰ کرنا واقعات پر خاک ڈالناہے۔ لیکن مرض کا علاج موت نہیں دوا ہے، کوئی مذموم رسم تحقیر اور تذلیل سے نہیں مٹتی اس کی اصلاح تعلیم، ہمدردی اور اخلاق سے ہوتی ہے جنت میں پہنچنے کے لیے کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ پل صراط پر سے ضرور گزرنا ہوگا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ کسی پیغمبر کی دعا اور شفاعت سے کودکر جنت میں جا بیٹھیں گے۔ وہ ان سے زیادہ قابل خندہ زنی نہیں ہیں۔ جو سمجھتے ہیں، کہ چوک سے ارباب نشاط کو خارج کرتے ہی ہندستان کے روزِ سیاہ کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اور ایک نیا آفتاب روشن ہوجائے گا۔ ہمارے بعض احباب نے اس مسئلہ کے صرف مالی پہلو پر نگاہ ڈالی ہے۔ لیکن میں مسٹر رستم بھائی اور پنڈت پربھاکرراؤ کا ہم خیال ہوں۔ بیشک اخلاق کے مقابلے میں مالی نقصانات کی کوئی وقعت نہیں۔ تاہم مشتبہ اور مشکوک اخلاقی نتائج کے لیے میں خطیر اور کثیر مالی نقصان برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر آپ نے سرمایہ داروں کے جذبات کا لحاظ نہ کرکے بورڈ میں اس تجویز کو پاس کرانا چاہا۔ تو آپ کو ان سے شکایت کا کوئی موقعہ نہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ ہر ممکن ذریعہ سے اپنے اغراض کی محافظت کریں۔ اپنے سرمایہ دار احباب سے بھی میرا یہ التماس ہے کہ دولت کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ قومی تحریکیں اہلِ دولت ہی کی فیاضیوں پر نشوونما پاتی اور زندہ رہتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ مخالفت کی دُھن میں دائرہ اعتدال سے تجاوز نہ فرمائیں گے۔"

(۸)

جس طرح کوئی آلسی آدمی کسی کے پکارنے کی آواز سن کر بیدار ہوجاتاہے۔ مگر پھر ادھر اُدھر دیکھ کر نیند میں مست ہوجاتا ہے۔ اسی طرح پنڈت کرشن چندر غصہ اور خفت

کے جوش کے فرو ہوتے ہی اپنے فرض سے بے خبر ہوگئے۔ انھوں نے سوچا، میرے یہاں رہنے سے پنڈت اماناتھ پر ایسا کون سا بار پڑرہاہے۔ آدھ سیر آٹا ہی تو کھاتاہوں۔ یا اور کچھ؟ لیکن اسی دن سے انھوں نے نیچے آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر چرس پینا چھوڑدی اب وہ اکثر برآمدے میں بیٹھے ہوئے سامنے سے گزرنے والی عورتوں کو گھورا کرتے۔ وہ ہرایک معاملہ میں اماناتھ کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ کھانا کھاتے وقت جو کچھ سامنے آجاتا۔ وہ چپ چاپ کھالیتے۔ خواہش رہنے پر بھی کچھ اور نہ مانگتے۔ وہ کتنے ہی باتیں محض تعلق سازی کے لیے اماناتھ سے کہتے۔ ان کی خودداری غائب ہوگئی تھی۔

اما ناتھ شانتا کی شادی کے بارے میں جب ان سے کچھ کہتے تو وہ فروتنی سے جواب دیتے، ''آپ جو چاہیں کریں، اس کے آپ ہی مالک ہیں'' وہ اپنے تئیں سمجھاتے، جب ان کے روپے خرچ ہورہے ہیں، تو ہرایک کام انھیں کی مرضی کے موافق ہونا چاہیے۔

لیکن اما ناتھ ان کی دل شگاف باتیں نہ بھولے تھے۔ آبلے پر مکھن لگانے سے ایک لمحہ کے لیے تکلیف کم ہوجاتی ہے لیکن پھر سوزش ہونے لگتی ہے۔ کرشن چندر کی ندامت آمیز باتیں اماناتھ کو جلد بھول گئیں۔ اور ان کے احسان فراموشانہ الفاظ کانوں میں تو بجتے رہے جب وہ اندر سونے گئے۔ تو جانھوی نے پوچھا،''آج لالہ جی تم سے کیا بگڑرہے تھے؟''

اماناتھ نے شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا،''میرا جس گارہے تھے کہہ رہے تھے، تم نے مجھے لوٹ لیا، میری بیوی کی جان لی، میری ایک لڑکی کو کوئیں میں ڈال دیا۔ اور دوسری لڑکی کو کوس کوس کر مارے ڈالتے ہو۔''

جانھوی۔ تو تمھارے منہ میں زبان نہ تھی؟ کہا ہوتا۔ کیا میں کسی کو نیوتہ دینے گیا تھا؟ کہیں تو ٹھکانہ نہ تھا۔ دربدر ٹھوکریں کھاتی پھرتیں۔ براجی سے گیا۔ کھانے والے کو مزہ ہی نہ آیا۔ یہاں لاج ڈھوتے ڈھوتے مرگئے۔ اس کا یہ پھل! اتنے دنوں تھانہ داری کی۔ ہزاروں کمائے پر گنگاجلی نے کبھی بھول کر بھی ایک ڈبیا سیندور کی نہ بھیجی۔ میرے سامنے کہا ہوتا۔ تو ایسی ایسی سُناتی، کہ دانت کھٹے ہوجاتے۔ دو جوان جوان لڑکیاں گلے پر سوار کردیں۔ اس پر بولنے کو مرتے ہیں۔ ان کے پیچھے فقیر ہوگئے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے۔ اب اپنا پریوار لے کر کہیں کیوں نہیں جاتے؟ کیوں پاؤں میں مہندی رچائے بیٹھے ہیں؟

اماناتھ۔ اب تو جانے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے تم سے سمن کا پتہ پوچھا تھا۔

جانھوی۔ تو کیا اب بیٹی کے گلے پڑیں گے۔ واہ رے بے غیرت۔
اماناتھ۔ نہیں ایسا کریں گے، شاید دوچار دن وہاں ٹھہریں۔
جانھوی ۔ کہاں کی بات، ان سے اب کچھ نہ ہوگا۔ ان کی آنکھوں کا پانی مرگیا۔ جاکے اسی کے سر پڑیں گے۔ مگر دیکھ لینا وہاں ایک دن بھی نباہ نہ ہوگا۔

اماناتھ نے اب تک سمن کی حیافروشی کی داستان جانھوی سے چھپائی تھی۔ وہ جانتے تھے، کہ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی یہ کسی نہ کسی سے ضرور ہی کہہ دے گی۔ اور رازطشت ازبام ہوجائے گا۔ جب کبھی وہ جانھوی کی دلجوئیوں سے خوش ہوتے۔ تو اس سے یہ داستان کہنے کی انھیں بڑی پُرزور تحریک ہوتی۔ دل میں ایک ہلچل ہونے لگتی۔ لیکن نتیجہ کا خیال کرکے ضبط کرجاتے تھے۔ پر آج کرشن چندر کی فرض شناسی اور جانھوی کی ہمدردانہ دمسازیوں نے انھیں رام کرلیا۔ پیٹ میں بات نہ رک سکی جیسے کسی نالی میں رُکی ہوئی چیز اندر سے پانی کا زور پاکر باہر نکل پڑے۔ اسی طرح سمن کی رام کہانی ان کے منہ سے نکل پڑی۔ انھوں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ رات کو جب آنکھ کھلی تو انھیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ پر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

جانھوی نے شوہر سے وعدہ تو کیاتھا۔ کہ یہ راز کسی سے نہ کہوں گی پر اب اسے اپنے سینہ پر ایک بوجھ سا رکھا ہوا معلوم ہوتاتھا۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا۔ وہ اماناتھ پر جھنجھلاتی کہ کہاں سے کہاں انھوں نے مجھ سے یہ بات کہی۔ اسے سمن سے نفرت نہ تھی، ہمدردی نہ تھی، غصہ نہ تھا۔ محض ایک عبرت خیز تذکرہ کا۔ انسان کی اخلاقی پستی پر رائے زنی کرنے کا مسالا ملتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کے خلاف کیسی پُرزور دلیل تھی۔ جانھوی اس لذت افشا سے اپنے تئیں بہت دنوں تک محروم نہ رکھ سکی یہ محال تھا۔ ان چند نیک سرشت عورتوں کے ساتھ بے وفائی تھی۔ جو اپنے گھر کا رتی رتی حال اس سے کہہ دیا کرتی تھیں۔ ماسوا اس کے جانھوی کو یہ جاننے کی خواہش بھی کچھ کم نہ تھی، کہ دوسری عورتیں اس معاملہ پر کیا گل فشانیاں کرتی ہیں۔ وہ کئی دنوں تک اپنے دل کو روکتی رہی۔ ایک دن کبیر پنڈت کی بیوی سبھاگی نے آکر کہا، ”بہن آج ایکادشی ہے، گنگا نہانے چلوگی؟“

جانھوی کا سبھاگی سے بہت میل تھا۔ بولی، ”چلتی تو پر یہاں تو دروازہ پر ایک جم دوت بیٹھا ہواہے۔ اس کے مارے کہیں ہلنے پاتی ہوں۔“

سبھاگی۔ بہن ان کی باتیں تم سے کیا کہوں شرم آتی ہے۔ میرے گھروالے سُن لیں۔ تو سرکاٹنے پر اتارو ہوجائیں۔ کل میری لڑکی کو سنا سناکر نہ جانے کون گیت گارہے تھے۔ آج سویرے میں نے اسے اُن کے ساتھ کنوئیں پر ہنستے دیکھا۔ بہن تم سے کون پردہ ہے۔ کوئی نیک وبد ہوگیا، تو سارے گاؤں کی ناک کٹ جائے گی، یہ بوڑھے ہوئے۔ انھیں ایسا چاہیے؟ میری لڑکی سمن سے دوایک سال بڑی ہوگی۔ اور کیا۔ بھلا سالی ہوتی، تو ایک بات بھی۔ وہ تو ان کی بھی بیٹی ہی ہوتی ہے۔ ان کو اتنا بھی بچار نہیں ہے۔ کہیں میرے پنڈت جی سن لیں، تو خون خرابہ ہوجائے۔ تم سے کہتی ہوں۔ کسی طرح آڑے بلاکر انھیں سمجھادو۔

اب جاھنوی سے نہ ضبط ہوسکا۔ اس نے سمن کی ساری کتھا سبھاگی سے خوب نمک مرچ لگاکر بیان کی۔ جب کوئی ہم سے اپنے راز کہہ دیتا ہے۔ تو ہم اس سے اپنے راز پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔

دوسرے ہی دن کبیر پنڈت نے اپنی لڑکی کو سسرال بھیج دیا۔ اور دل میں عہد کیا۔ کہ اس ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا۔

(۹)

سدن سنگھ کی شادی کا روزِ سعید آپہنچا۔ چنار سے برات امولا چلی۔ اس کی تفصیل لکھنا تضیع اوقات ہے جیسی اور براتیں ہوتی ہیں، ویسی ہی یہ بھی تھی۔ وحشیانہ تکلف اور دردانگیز پریشان حالی کا عجیب اجتماع، پالکیوں پر زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی۔ لیکن کہاروں کی وردیاں بوسیدہ اور کرم خوردہ۔ گنگا جمنی کے عصا، اور بلّم نیم برہنہ مزدوروں کے ہاتھ میں۔

امولا یہاں سے کوئی دس کوس تھا۔ راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی۔ بارات کشتیوں پر اتری۔ ملاحوں سے مزدوری کے لیے گھنٹوں سر مغزن ہوا۔ تب کہیں جاکر انھوں نے ناویں کھولیں۔ مدن سنگھ نے بگڑکر کہا، "نہ ہوئے تم لوگ ہمارے گاؤں میں۔ نہیں تو اتنی بیگار لیتا۔ کہ یاد کرتے۔" لیکن پدم سنگھ ملاحوں کی اس جرأت پر خوش تھے۔ انھیں اس میں ملاحوں کی حریت پسندی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

شام کے وقت برات امولا پہنچی۔ پدم سنگھ کے محررّ صاحب نے پہلے ہی سے شامیانہ نصب کررکھاتھا۔ کئی چھولداریاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ چھولداریوں کے سامنے گیس کی لالٹینیں تھیں شامیانہ شیشہ و آلات سے آراستہ تھا۔ کارچوبی مسند، گاؤ تکیے، خاصدان، گلاب

پاش وغیرہ سب موقع سے رکھے ہوئے تھے۔ دھوم تھی، کہ ناچ کے کئی ڈیرے آرہے ہیں۔

دوار پوجا ہوئی، اماناتھ کندھے پر ایک انگوچھا ڈالے براتیوں کا خیر مقدم کررہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں سائبان میں کھڑی منگلاچرن گاتی تھیں۔ براتیوں کی نظر انتخاب بہترین حسن کی تلاش میں سرگرم تھی ادھر سے بھی آنکھوں کی کٹاریں براتیوں کا سواگت کئے دیتی تھیں جانھوی اداس تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ دولہا میری چندرا کو ملتا، تو اچھا ہوتا۔ سبھاگی یہ جاننے کے لیے بے قرارر تھی کہ سمدھی کون ہے۔ کرشن چندر سدن سنگھ کے پیر دھورہے تھے۔ اور دل میں کہہ رہے تھے۔ یہ کیسا بیہودہ رواج ہے مدن سنگھ دھیان سے دیکھ رہے تھے کہ تھال میں کتنے روپے ہیں۔

برات جنواسے چلی۔ رسد سامان تقسیم ہونے لگا۔ وہ ہڑبونگ مچا کہ الامان! ایک طرف سے اور کے لیے اصرار۔ دوسری طرف صاف انکار۔ کوئی کہتا تھا۔ مجھے گھی کم ملا۔ کوئی فریاد کرتا تھا مجھے اپلے نہیں ملے، لالہ بیجناتھ شراب کے لیے بضد تھے برات سے روٹھے جاتے تھے۔ کئی آدمی انھیں منا رہے تھے۔

سامان تقسیم ہوگیا۔ تو لوگوں نے اپلے جلائے اور ہانڈیاں چڑھائیں۔ دھوئیں سے آسمان سیاہ ہوگیا، گیس کی روشنی زرد پڑگئی۔

سدن مسند لگاکر بیٹھا۔ محفل آراستہ ہوئی عطروپان سے تواضع ہونے لگی۔ سنگیت ودیالہ کے کلاونتوں نے طنبورے سنبھالے، شیام کلیان کی دلآویز دُھن گونجنے لگی، ہزاروں آدمی شامیانہ کے چاروں طرف جمع تھے۔ کچھ لوگ مرزائیاں پہنے۔ پگڑیاں باندھے ہاتھ میں تمباکو اور چھالیوں کا بٹوا لیے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے، لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ ڈیرے کہاں ہیں؟ کوئی اس چھولداری میں جھانکتا تھا۔ کوئی اس چھولداری میں، اور حیرت سے کہتا تھا۔ کیسی بارات ہے کہ ایک ڈیرا بھی نہیں۔ کہاں کے کنگلے ہیں۔ یہ بڑا شامیانہ کاہے کو کھڑا کررکھا ہے۔ شیام کلیان کی دھن انھیں بے مزہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نغمے کے نہیں دیدار کے رسیا تھے، ناز و ادا کے بھوکے۔ مدن سنگھ یہ باتیں سن سن کر دل میں پدم سنگھ پر کڑبڑا رہے تھے اور پدم سنگھ شرم اور خوف کے مارے ان کے روبرو آتے ہوئے ڈرتے تھے۔

سبھاگی۔ بہن ان کی باتیں تم سے کیا کہوں شرم آتی ہے۔ میرے گھروالے سُن لیں۔ تو سر کاٹنے پر اتارو ہوجائیں۔ کل میری لڑکی کو سنا سناکر نہ جانے کون گیت گارہے تھے۔ آج سویرے میں نے اسے اُن کے ساتھ کنوئیں پر ہنستے دیکھا۔ بہن تم سے کون پردہ ہے۔ کوئی نیک وبد ہوگیا، تو سارے گاؤں کی ناک کٹ جائے گی، یہ بوڑھے ہوئے۔ انھیں ایسا چاہیے؟ میری لڑکی سمن سے دوایک سال بڑی ہوگی۔ اور کیا۔ بھلا سالی ہوتی، تو ایک بات بھی۔ وہ تو ان کی بھی بیٹی ہی ہوتی ہے۔ ان کو اتنا بھی بچار نہیں ہے۔ کہیں میرے پنڈت جی سن لیں، تو خون خرابہ ہوجائے۔ تم سے کہتی ہوں۔ کسی طرح آڑے بلاکر انھیں سمجھادو۔

اب جانھوی سے نہ ضبط ہوسکا۔ اس نے سمن کی ساری کتھا سبھاگی سے خوب نمک مرچ لگاکر بیان کی۔ جب کوئی ہم سے اپنے راز کہہ دیتا ہے۔ تو ہم اس سے اپنے راز پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔

دوسرے ہی دن کبیر پنڈت نے اپنی لڑکی کو سسرال بھیج دیا۔ اور دل میں عہد کیا۔ کہ اس ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا۔

(۹)

سدن سنگھ کی شادی کا روزِ سعید آپہنچا۔ چنار سے برات امولا چلی۔ اس کی تفصیل لکھنا تضیع اوقات ہے جیسی اور براتیں ہوتی ہیں، ویسی ہی یہ بھی تھی۔ وحشیانہ تکلف اور دردانگیز پریشان حالی کا عجیب اجتماع، پالکیوں پر زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی۔ لیکن کہاروں کی وردیاں بوسیدہ اور کرم خوردہ۔ گنگا جمنی کے عصا، اور بلّم نیم برہنہ مزدوروں کے ہاتھ میں۔

امولا یہاں سے کوئی دس کوس تھا۔ راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی۔ بارات کشتیوں پر اتری۔ ملاحوں سے مزدوری کے لیے گھنٹوں سر مغزن ہوا۔ تب کہیں جاکر انھوں نے ناویں کھولیں۔ مدن سنگھ نے بگڑکر کہا، "نہ ہوئے تم لوگ ہمارے گاؤں میں۔ نہیں تو اتنی بیگار لیتا۔ کہ یاد کرتے۔" لیکن پدم سنگھ ملاحوں کی اس جرأت پر خوش تھے۔ انھیں اس میں ملاحوں کی حریت پسندی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

شام کے وقت برات امولا پہنچی۔ پدم سنگھ کے محرّر صاحب نے پہلے ہی سے شامیانہ نصب کررکھاتھا۔ کئی چھولداریاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ چھولداریوں کے سامنے گیس کی لالٹینیں تھیں شامیانہ شیشہ و آلات سے آراستہ تھا۔ کارچوبی مسند، گاؤتکیے، خاصدان، گلاب

پاش وغیرہ سب موقع سے رکھے ہوئے تھے۔ دھوم تھی، کہ ناچ کے کئی ڈیرے آرہے ہیں۔

دوارپوجا ہوئی، اماناتھ کندھے پر ایک انگوچھا ڈالے براتیوں کا خیر مقدم کررہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں سائبان میں کھڑی منگلاچرن گاتی تھیں۔ براتیوں کی نظر انتخاب بہترین حسن کی تلاش میں سرگرم تھی ادھر سے بھی آنکھوں کی کٹاریں براتیوں کا ستھراؤ کئے دیتی تھیں جانھوی اداس تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ دولہا میری چندرا کو ملتا، تو اچھا ہوتا۔ سبھاگی یہ جاننے کے لیے بے قرارر تھی کہ سمدھی کون ہے۔ کرشن چندر سدن سنگھ کے پیر دھورہے تھے۔ اور دل میں کہہ رہے تھے۔ یہ کیسا بیہودہ رواج ہے مدن سنگھ دھیان سے دیکھ رہے تھے کہ تھال میں کتنے روپے ہیں۔

برات جنواسے چلی۔ رسد سامان تقسیم ہونے لگا۔ وہ ہڑبونگ مچا کہ الامان! ایک طرف سے اور کے لیے اصرار۔ دوسری طرف صاف انکار۔ کوئی کہتاتھا۔ مجھے گھی کم ملا۔ کوئی فریاد کرتاتھا مجھے اپلے نہیں ملے، لالہ بیجناتھ شراب کے لیے بضد تھے برات سے روٹھے جاتے تھے۔ کئی آدمی انھیں منا رہے تھے۔

سامان تقسیم ہوگیا۔ تو لوگوں نے اپلے جلائے اور ہانڈیاں چڑھائیں۔ دھوئیں سے آسمان سیاہ ہوگیا، گیس کی روشنی زرد پڑگئی۔

سدن مسند لگاکر بیٹھا۔ محفل آراستہ ہوئی عطروپان سے تواضع ہونے لگی۔ سنگیت ودیالہ کے کلاونتوں نے طنبورے سنبھالے، شیام کلیان کی دلآویز دُھن گونجنے لگی، ہزاروں آدمی شامیانہ کے چاروں طرف جمع تھے۔ کچھ لوگ مرزائیاں پہنے۔ پگڑیاں باندھے ہاتھ میں تمباکو اور چھالیوں کا بٹوا لیے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے، لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ ڈیرے کہاں ہیں؟ کوئی اس چھولداری میں جھانکتا تھا۔ کوئی اس چھولداری میں، اور حیرت سے کہتا تھا۔ کیسی بارات ہے کہ ایک ڈیرا بھی نہیں۔ کہاں کے کنگلے ہیں۔ یہ بڑا شامیانہ کاہے کو کھڑا کررکھا ہے۔ شیام کلیان کی دھن انھیں بے مزہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نغمے کے نہیں دیدار کے رسیا تھے، ناز و ادا کے بھوکے۔ مدن سنگھ یہ باتیں سن سن کر دل میں پدم سنگھ پر کڑبڑا رہے تھے اور پدم سنگھ شرم اور خوف کے مارے ان کے روبرو آتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اتنے میں لوگوں نے شامیانے پر پتھر پھینکنے شروع کیے۔ لالہ بیجناتھ اٹھ کر چھولداری میں بھاگے۔ کچھ لوگ ان مفسدوں کو گالیاں دینے لگے۔ ایک ہلچل مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا۔ کوئی اُدھر، کوئی گالی بکتا تھا۔ کوئی مار پیٹ پر آمادہ تھا۔ دفعتاً ایک تناور، قوی ہیکل سادھو سر منڈائے بھسم لگائے۔ ہاتھ میں ایک ترسول لیے آکر شامیانہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی لال لال آنکھیں چراغ کی طرح جل رہی تھیں۔ چہرہ سے رعب وجلال برستا تھا۔ محفل پر سناٹا چھا گیا سب لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سادھو کو دیکھنے لگے۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آگیا؟

سادھو نے ترسول جھنکار کر ملامت آمیز انداز سے کہا:

"ہائے افسوس! یہاں کوئی ناچ نہیں، کوئی رنڈی نہیں! سب باوا لوگ اداس بیٹھے ہیں شیام کلیان کی دھن کیسی منوہر ہے پر کوئی نہیں سنتا۔ کسی کے کان نہیں۔ سب ناچ دیکھنا چاہتے ہیں یا تو انھیں ناچ دکھاؤ۔ یا اپنے سر تڑواؤ۔ چلو میں ناچ دکھاؤں۔ دیوتاؤں کا ناچ دیکھنا چاہتے ہو؟ دیکھو سامنے درخت کی پتیوں پر نرمل چاند کی کرنیں کیسی ناچ رہی ہیں؟ دیکھو تالاب میں کمل کے پھول پر پانی کی بوندیں کیسی ناچتی ہیں۔ جنگل میں جاکر دیکھو، مور پَر پھیلائے کیسا ناچ رہا ہے۔ کیا یہ دیوتاؤں کا ناچ پسند نہیں ہے؟ اچھا چلو بھوتوں کا ناچ دکھاؤں۔ تمھارا پڑوسی غریب کسان زمیندار کے جوتے کھاکر کیسا ناچ رہاہے، تمھارے بھائیوں کے یتیم بچے بھوک سے باؤلے ہوکر کیسے ناچ رہے ہیں۔ اپنے گھر میں دیکھو۔ تمھاری بیوہ بھاوج کی آنکھوں میں درد اور غم کے آنسو کیسے ناچتے ہیں۔ یہ ناچ بھی پسند نہیں؟ تو اپنے من دیکھو کپٹ اور چھل کیسا ناچ رہاہے مد اور موہ کیسا تھرک رہا ہے، سارا رنگ بھوم ہے اس میں سب اپنا اپنا ناچ رہے ہیں۔ کیا یہ دیکھنے کے لیے تمھاری آنکھیں نہیں ہیں؟ آہ اگیان کے مورتو، شہوت کے غلامو! تمھیں ناچ کا نام لیتے لاج نہیں آتی۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو، تو اس ریت کو مٹاؤ۔ نفس پرستی چھوڑو۔ اس گندی کیچڑ سے نکلو؟"

ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ صورت تصویر بنے ہوئے سادھو کی مجذوبانہ تقریر سن رہے تھے کہ دفعتاً وہ غائب ہوگئے اور سامنے والے آم کے درختوں کے آڑ سے ان کے نغمۂ شیریں کی صدا سنائی دینے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اسی تاریکی میں محو ہوگئی۔ جیسے رات کو کشتی فکر بحرِ خواب میں ڈوب جاتی ہے، جیسے جواریوں کا جتھا پولیس کے کسی

افسر کو دیکھ کر بدحواس ہوجاتا ہے۔ کوئی روپے پیسے سمیٹنے لگتا ہے۔ کوئی کوڑیوں کو چھپانے لگتا ہے اسی طرح سادھو کے اتفاقی ظہور۔ ان کی پُر جلال صورت اور ان کی مجذوبانہ تقریر نے لوگوں کے دلوں کو ایک نامعلوم خوف سے پُر کردیا۔ مفسدوں نے چپکے سے گھر کی راہ لی۔ اور جو لوگ محفل میں بیٹھے بیٹھے پچھتا رہے تھے کہ ناحق آئے۔ وہ بھی گانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کچھ خوش اعتقاد لوگ ان کی تلاش میں دوڑے۔ پر ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

(۱۰)

پنڈت مدن سنگھ اپنی چھولداری میں بیٹھے ہوئے آمدنی اور خرچ کا حساب لکھ رہے تھے۔ کہ منشی بیجناتھ دوڑے ہوئے آئے۔ اور بولے:"بھائی صاحب بڑا ظلم ہوا۔ آپ نے یہاں ناحق شادی کی"۔

مدن سنگھ نے متعجب ہوکر پوچھا:"کیوں کیا بات ہے؟ کچھ گڑبڑ ہے؟"

بیجناتھ۔ ہاں ابھی اسی گاؤں میں ایک آدمی مجھ سے ملا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی ایسی قلعی کھولی۔ کہ میرے ہوش اُڑگئے۔

مدن سنگھ۔ کیا یہ لوگ ہیٹے خاندان کے ہیں؟

بیجناتھ۔ ہیٹے خاندان کے تو نہیں۔ لیکن معاملہ گڑبڑ ہے۔ لڑکی کا باپ حال ہی میں جیل خانہ سے چھوٹ کر آیاہے۔ اور لڑکی کی بہن گھر سے نکل گئی ہے۔ دال منڈی میں جو سمن بائی ہے۔ وہ اسی لڑکی کی سگی بہن ہے۔

مدن سنگھ کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی درخت سے پھسل پڑے آنکھیں پھاڑکر بولے:"وہ آدمی ان لوگوں کا کوئی دشمن تو نہیں ہے رخنہ ڈالنے کے لیے لوگ اکثر ایسے فتنے کھڑے کردیا کرتے ہیں۔"

پدم سنگھ نے کہا:"ہاں کچھ ایسی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔"

بیجناتھ۔ جی نہیں وہ تو کہتا تھا، میں ان لوگوں کے منہ پر کہہ دوں گا۔

مدن سنگھ۔ تو کیا لڑکی اماناتھ کی نہیں ہے؟

بیجناتھ۔ نہیں وہ ان کی بھانجی ہے۔ وہ جو ایک بار تھانیدار پر مقدمہ چلنے کی خبر مشہور ہوئی تھی۔ وہی تھانیدار اماناتھ کے بہنوئی تھے کئی مہینوں سے چھوٹ کر آگئے ہیں۔

مدن سنگھ نے سر پکڑ کر کہا،"ہائے ایشور! تم نے کہاں لاکے پھنسادیا۔"

پدم سنگھ - اما ناتھ کو بلانا چاہیے۔

اتنے میں اما ناتھ خود ایک نائی کے ساتھ آتے ہوئے نظر آئے۔ بہو کے لیے زیورات اور کپڑوں کی ضرورت تھی۔ جونہی وہ چھولداری کے دروازہ پر پہنچے کہ مدن سنگھ تیزی سے جھپٹے اور ان کے دونوں ہاتھ پکڑکر جھنجھوڑتے ہوئے بولے،"کیوں جی تیلک دھاری مہاراج! تمھیں دنیا میں کوئی اور نہ ملتا تھا۔ کہ تم نے اپنے منہ کی کالکھ میرے منہ لگائی؟"

بلی کے پنجہ میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح بیکسانہ انداز سے تاکتے ہوئے اما ناتھ نے جواب دیا:"مہاراج مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی ہے؟"

مدن سنگھ۔ تم نے وہ کام کیا ہے۔ کہ اگر تمھارا گلا کاٹ لوں تو عین ثواب ہو۔ جس لڑکی کی بہن آوارہ ہوجائے۔ اس کے لیے تمھیں میرا ہی گھر تاکنا تھا؟

اما ناتھ نے دبی زبان سے کہا:"مہاراج! دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے، اگر کسی نے مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہو۔ تو آپ کو اس پر یقین نہ کرنا چاہیے۔ اس آدمی کو بلوایئے، جو کچھ کہنا ہو، میرے منہ پر کہیے۔"

پدم سنگھ۔ ہاں بہت ممکن ہے، کہ یہی بات ہو۔ اس آدمی کو بلوانا چاہیے۔

مدن سنگھ نے بھائی کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا:"تم کیوں بیچ میں بولتے ہو جی۔(اما ناتھ سے) ممکن ہے تمھارے کسی دشمن نے ہی کہی ہو۔ لیکن یہ بات سچی ہے یا نہیں؟"

اما ناتھ۔ کون بات؟

پدم سنگھ۔ یہی کہ سمن اس لڑکی کی سگی بہن ہے۔

اما ناتھ کا چہرہ زرد ہوگیا۔ شرم سے سر جھک گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔ بولے، "مہاراج ....۔"

مدن سنگھ نے گرج کر کہا:"صاف کیوں نہیں کہتے۔ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ؟"

اما ناتھ نے پھر جواب دینا چاہا۔ لیکن "مہاراج" کے سوا اور زبان سے کچھ نہ نکلا۔

مدن سنگھ کو اب کوئی شبہ نہ رہا۔ غصہ کی آگ دہک اُٹھی۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے جسم کانپنے لگا۔ اما ناتھ کی طرف آتشیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے،"اب اپنی خیریت

چاہتے ہو۔ تو میری نگاہوں سے دور ہوجاؤ۔ مکار، دغاباز، بے ایمان کہیں کا، تیلک لگا کے پنڈت بنا پھرتا ہے۔ اب تیرے دروازہ پر پانی نہ پیوں گا۔ اپنی لڑکی کو جنتر بنا کے گلے میں پہن۔"

یہ کہہ کر مدن سنگھ جھلا اٹھے۔ اور اس چھولداری میں چلے گئے۔ جہاں سدن پڑا سورہا تھا۔ اور زور سے چلا کر کہاروں کو پکارا۔

ان کے جانے کے بعد اما ناتھ نے پدم سنگھ سے کہا: "وکیل صاحب! کسی طرح پنڈت جی کو منایئے۔ میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ سمن کا حال تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ اس ابھاگنی نے ہمارے منہ میں کالکھ لگادی۔ ایشور کی مرضی تھی، پر اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ، آپ ہی انصاف کیجیے۔ میں اس معاملے کو چھپانے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا؟ اس لڑکی کی شادی تو کرنی ہی تھی۔ بلا چھپائے کیوں کر کام چلتا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ مجھے یہ بات آپ کے یہاں شادی طے ہوجانے کے بعد معلوم ہوئی۔"

پدم سنگھ نے متفکرانہ انداز سے جواب دیا، "بھائی صاحب کے کانوں میں بات نہ پڑی ہوتی۔ تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، دیکھیے میں ان کے پاس جاتا ہوں، پَر ان کا راضی ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

مدن سنگھ کہاروں سے چلا چلاکر کہہ رہے تھے کہ جلد یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ سدن بھی اپنے کپڑے سمیٹ رہاتھا۔ مدن سنگھ نے اس سے ساری حقیقت بیان کردی تھی۔ اتنے میں پدم سنگھ نے آکر واعظانہ انداز سے کہا، "بھیا اتنی عجلت نہ کیجیے، ذرا سوچ سمجھ کر کام کیجیے۔ دھوکا تو ہو ہی گیا، پر یوں واپس جانے سے تو اور بھی جگ ہنسائی ہوگی۔"

سدن چچا کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھا، اور مدن سنگھ نے استعجاب سے، پدم سنگھ نے پھر کہا، "دوچار آدمیوں سے پوچھیے، ان کی صلاح لیجیے، دیکھیے ان کی کیا رائے ہے؟"

مدن سنگھ۔ کیا کہتے ہو، کیا جان بوجھ کر مکھی نِگل جاؤں؟

پدم سنگھ۔ اس میں کم سے کم جگ ہنسائی تو نہ ہوگی۔

مدن سنگھ۔ تم ابھی لڑکے ہو۔ یہ باتیں کیا جانو۔ جاؤ واپسی کا سامان کرو اس وقت کی جگ ہنسائی اچھی ہے، خاندان میں تو داغ نہ لگے گا۔

پدم سنگھ۔ لیکن یہ تو خیال کیجیے کہ اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ اس بے چاری نے کیا خطا کی ہے۔

مدن سنگھ نے جھڑک کر کہا، ”تم تو ہو بڑے احمق، چل کر ڈیرے لدواؤ۔ کل کو کوئی بات پڑجائے گی تو تم ہی طعنے دوگے، کہ روپیوں پر پھسل پڑے ان معاملوں میں وکالت کام نہیں دیتی۔“

پدم سنگھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا:”مجھے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں مطلق عذر نہیں ہے۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ اس لڑکی کا کیا حال ہوگا۔ بے چاری کی زندگی خراب ہوجائے گی۔“

مدن سنگھ۔ تم خواہ مخواہ غصہ دلاتے ہو۔ لڑکی کا میں نے ٹھیکہ لیا ہے۔ جو کچھ اس کی تقدیر میں ہے، ہوگا، مجھ سے مطلب؟

پدم سنگھ نے مایوسانہ انداز سے کہا،”سمن بائی کی تو یہاں مطلق آمد و رفت نہیں ہے ان لوگوں نے اسے ترک کردیا ہے۔

مدن سنگھ۔ میں نے تم سے کہہ دیا، کہ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ تمھیں ایسی باتیں زبان سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بڑے رفارمر کی دُم بنے ہو۔ ایک ہرجائی کی بہن سے اپنے بیٹے کا بیاہ کرلوں! چھی چھی! تمھاری عقل پر پردہ پڑگیا ہے کیا؟

پدم سنگھ نے خفیف ہوکر سر جھکالیا۔ ان کا دل کہہ رہاتھا، کہ بھائی صاحب اس وقت جو کچھ کررہے ہیں۔ وہی شاید ایسی حالت میں میں بھی کرتا۔ لیکن نتائج کا خیال کرکے اُنھوں نے ایک بار پھر بولنے کی جرأت کی، جس طرح کوئی طالب علم نتیجہ کے گزٹ میں اپنا نام نہ پاکر مایوس ہوتے ہوئے بھی غلط نام کی طرف لپکتا ہے۔ اسی طرح پدم سنگھ دھوکا دے کر بھائی سے دبی زبان سے بولے:”سمن بائی بھی تو اب بدھوا آشرم میں داخل ہوگئی ہے۔“

پدم سنگھ سرنیچا کیے باتیں کررہے تھے۔ بھائی سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ نہ ہوتاتھا۔ یہ الفاظ منہ سے نکلے ہی تھے، کہ دفعتاً مدن سنگھ نے انھیں اتنے زور سے دھکادیا، کہ وہ لڑکھڑاکر گرپڑے۔ چونک کر سر اُٹھایا، مدن سنگھ کھڑے غصہ سے کانپ رہے تھے۔ نفریں اور ملامت کے وہ سخت الفاظ جو ان کے منہ سے نکلنے والے تھے۔ پدم سنگھ کو زمین پر گرتے دیکھ کر ندامت اور تاسف سے دب گئے۔ ان کی اس وقت وہی حالت تھی، جب انسان غصہ میں اپنا ہی گوشت کاٹنے لگتا ہے۔

یہ آج زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پدم سنگھ نے بھائی کے ہاتھوں یہ ذلت اُٹھائی۔ سارا لڑکپن گزر گیا۔ بڑی بڑی شرارتیں کیں۔ مگر بھائی نے کبھی ہاتھ نہ اُٹھایا، کبھی تیز نگاہوں سے نہ دیکھا۔ سخت صدمہ ہوا۔ بچوں کی طرح سسکتے تھے، ہچکیاں لیتے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی، مگر دل میں غصہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف یہی خیال دل کو مسوس رہا تھا، کہ جس نے ہمیشہ پیار کیا، کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی، اُسے آج میری ضد سے اتنا ملال ہوا۔ یہ مار نہیں ہے، یہ مایوسی اور غرور شکستہ اور حسِ شرم کا عملی ثبوت ہے! یہ دل پر غم کا نالۂ درد ہے، یہ سوزِ نہاں کا شعلہ ہے، یہ مقیاس الحرارت ہے، تپ دروں کا۔ سدن نے جلدی سے پدم سنگھ کو اُٹھایا، اور اپنے باپ کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھ کر بولا، "آپ تو جیسے باؤلے ہوگئے ہیں۔"

اتنے میں کئی آدمی آگئے۔ اور پوچھنے لگے، مہاراج کیا بات ہوئی؟ بارات کو لوٹنے کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ ایسا کچھ کیجیے، کہ دونوں طرف کی آبرو قائم رہے۔ اب ان کی اور آپ کی عزت ایک ہے۔ لین دین میں اگر کچھ کمی بیشی ہو، تو آپ ہی دب جایئے۔ نارائن نے آپ کو کیا نہیں دیا ہے؟ ان کی دولت سے آپ کے پاس تھوڑے ہی دولت ہوجائے گی۔ مدن نے کسی کو کچھ جواب نہ دیا۔

محفل میں کھلبلی پڑگئی ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کیا ماجرا ہے؟ چھولداری کے سامنے آدمیوں کا ہجوم بڑھتا جاتا تھا۔

محفل میں لڑکی کی طرف کے کتنے ہی آدمی تھے، وہ اما ناتھ سے پوچھنے لگے: "بھیا یہ لوگ بارات لوٹانے پر کیوں آمادہ ہیں۔" جب اما ناتھ نے کوئی قابلِ اطمینان جواب نہیں دیا۔ تو وہ سب آکر مدن سنگھ سے منتیں کرنے لگے۔ ہم لوگوں سے کیا خطا ہوئی ہے، اور جو چاہے سزا دیجیے۔ پر بارات نہ لوٹایئے۔ نہیں تو سارا گاؤں بدنام ہوجائے گا۔ مدن سنگھ نے ان سے صرف اتنا کہا، "اس کا سبب جاکر اما ناتھ سے پوچھو، وہ ہی بتائیں گے۔"

پنڈت کرشن چندر نے جب سے سدن کو دیکھا تھا، خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ بھانوروں کی ساعت قریب تھی۔ وہ بَر کے آنے کا انتظار کررہے تھے، کہ اتنے میں کئی آدمیوں نے آکر انھیں یہ کیفیت سنائی، اُنھوں نے پوچھا، کیوں لوٹے جاتے ہیں، کیا اما ناتھ سے کوئی حجت ہوگئی ہے۔

لوگوں نے کہا، ”ہمیں نہیں معلوم س اما ناتھ تو کھڑے منا رہے ہیں۔“

کرشن چندر جھلائے ہوئے بارات کی طرف چلے۔ بارات کا لوٹانا لڑکوں کا کھیل ہے؟ یہ کوئی گڑیا گڈے کا بیاہ ہے کیا؟ اگر شادی نہیں کرنی تھی، تو بارات کیوں لائے تھے؟ دیکھتا ہوں بارات کیسے لوٹتی ہے؟ خون کی ندیاں بہادوں گا۔ یہی نہ ہوگا، کہ پھانسی ہوجائے گی، پر انھیں اس کا مزہ چکھا دوں گا۔ کرشن چندر اپنے ساتھیوں سے یہی باتیں کرتے قدم بڑھاتے ہوئے جنواسے میں پہنچے، اور للکار کر بولے، ”کہاں ہیں پنڈت مدن سنگھ مہاراج ذرا باہر آیئے۔“

مدن سنگھ یہ للکار سن کر باہر نکل آئے، اور تند لہجہ میں بولے، ”کہیے کیا کہتے ہیں؟“

کرشن چندر۔ آپ بارات کیوں لوٹا لیے جاتے ہیں؟

مدن۔ اپنی طبیعت ہمیں شادی نہیں کرنی ہے۔

کرشن۔ آپ کو شادی کرنی ہوگی۔ یہاں آکر آپ اس طرح نہیں لوٹ سکتے۔

مدن۔ آپ جو کرنا ہو کیجیے، ہم شادی نہیں کرتے۔

کرشن۔ کوئی سبب؟

مدن۔ سبب کیا آپ کو نہیں معلوم ہے؟

کرشن۔ جانتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔

مدن۔ تو پنڈت اما ناتھ سے پوچھیے۔

کرشن۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔

مدن۔ بات دبی رہنے دیجیے۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔

کرشن۔ اچھا! سمجھ گیا، میں جیل خانہ ہو آیا ہوں۔ یہ اس کی سزا ہے۔ واہ رے آپ کا انصاف۔

مدن۔ اس بات پر بارات نہیں لوٹ سکتی تھی۔

کرشن۔ تو شاید اما ناتھ نے جہیز کا خراج دینے میں کچھ بخل کیا ہوگا؟

مدن۔ ہم اتنے کمینے نہیں ہیں؟

کرشن۔ تو پھر ایسی کون سی بات ہے؟

مدن۔ ہم کہتے ہیں، ہم سے نہ پوچھیے۔

کرشن۔ آپ کو بتلانا پڑے گا، دروازہ پر آکر بارات لوٹا لے جانا کیا آپ نے لڑکوں کا کھیل سمجھا ہے۔ یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ آپ اس بھروسہ میں نہ رہیے گا۔

مدن۔ اس کا ہمیں غم نہیں، ہم یہاں مرجائیں گے۔ لیکن آپ کی لڑکی سے شادی نہ کریں گے۔ آپ کے گھر عزت بیچنے اور آبرو گنوانے نہیں آئے ہیں۔

کرشن۔ تو کیا ہم آپ سے نیچے ہیں؟

مدن۔ ہاں آپ ہم سے نیچے ہیں۔

کرشن۔ اس کا کوئی ثبوت؟

مدن۔ ہاں ثبوت ہے۔

کرشن۔ تو اس کے ظاہر کرنے میں آپ کو کیوں تامل ہوتا ہے۔

مدن۔ اچھا تو سنیے، مجھے الزام نہ دیجیے گا۔ آپ کی لڑکی سمن جو اس لڑکی کی حقیقی بہن ہے۔ آوارہ ہوگئی ہے۔ آپ کا جی چاہے، تو جاکر اُسے دال منڈی میں دیکھ آئیے۔

کرشن چندر نے بدگمان ہوکر کہا، "یہ بالکل جھوٹ ہے، سراسر غلط ہے۔"

پھر ایک لمحہ میں انھیں یاد آگیا، کہ جب میں نے اما ناتھ سے سمن کا پتہ پوچھا تھا۔ تو اُنھوں نے ٹال دیا تھا کتنے ہی ایسے کنایوں کے معنے سمجھ میں آگئے، جو جانھوی بات بات میں ان پر کرتی رہتی تھی، یقین آگیا۔ شرم سے سر جھک گیا، وہ بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔ دونوں طرف کے صدہا آدمی وہاں کھڑے تھے۔ لیکن سب کے سب سناٹے میں آگئے کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ معاملہ ایسا نازک تھا، کہ وہاں فہمائش کا گزر نہ تھا۔

آدھی رات ہوتے ہوتے ڈیرے خیمے سب اکھڑ گئے، اس باغ میں پھر تاریکی مسلط ہوگئی، پھر گیڈروں کی مجلس آراستہ ہوئی۔ اور اُلو اپنا راگ گانے لگے۔

(۱۱)

بٹھل داس نے سمن کو بدھوا آشرم میں خفیہ طور سے رکھا تھا۔ کارکن کمیٹی کے کسی رکن کو اس کی اطلاع نہ دی تھی۔ آشرم کی بدھواؤں سے کہا تھا یہ بھی بدھوا ہے۔ لیکن منشی ابوالوفا جیسے خواصوں سے یہ بات زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہی۔ اُنھوں نے ہریا کو ڈھونڈ نکالا۔ اور اس سے سمن کا پتہ پوچھ لیا۔ تب اپنے دوسرے رنگین مزاج دوستوں کو بھی یہ

مژدہ سنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرات کی نظرِ عنایت آشرم پر روز افزوں ہونے لگی۔ کبھی سیٹھ چمن لال آتے، کبھی سیٹھ بلبھدرداس، کبھی پنڈت جی جلوہ افروز ہوتے۔ اور کبھی منشی ابوالوفا۔ ان بھلے آدمیوں کو اب آشرم کی صفائی اور سجاوٹ ، اس کی مالی حالت اور دیگر انتظامی امور سے خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ شب وروز آشرم کے فلاح و بہبود کی فکر میں غرق رہتے تھے۔

بٹھل داس سخت مصیبت میں گرفتار تھے، باربار ارادہ کرتے تھے۔ کہ اس خدمت سے استعفا دے دوں۔ کیا میں نے ہی آشرم کا ذمہ لیا ہے؟ کمیٹی میں اور بھی کتنے ہی اصحاب ہیں۔ جو اس کام کو سنبھال سکتے ہیں۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔ مجھے اپنی آنکھوں سے تو یہ اندھیر نہ دیکھنا پڑے گا۔ کبھی سوچتے کیوں نہ ایک دن اُن رنگے سیاروں کو پھٹکاروں ۔ پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن جب سکون کی حالت میں اس مسئلہ پر غور کرتے تو انھیں اس آشرم کا وجود اپنی ہی ذات کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ہی اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ میں نے ہی اُسے اب تک زندہ رکھا ہے۔ اگر میں نے کنارہ کیا۔ تو چندہی دنوں میں یہ سرسبز پودا خشک ہوجائے گا۔ ہاں وہ ان حضرات سے بڑی بے اعتنائی اور بے رخی سے پیش آتے ۔ان کی خیرخواہانہ صلاحوں کی ہنسی اڑاتے۔ اور کنایتاً ان پر ظاہر کرتے کہ آپ لوگوں کی یہ آمدورفت مجھے سخت ناپسند ہے۔ لیکن غرض کے بندے باریک بین نہیں ہوتے۔ دونوں سیٹھ ان کی باتیں سن کر خلق مجسم بن جاتے، تیواری جی ایسے حلیم و سلیم ہوجاتے گویا انھیں کبھی غصہ آہی نہیں سکتا۔ ان کی رضا جوئی اور خندہ طبعی بٹھل داس کو نرم کردیتی تھی۔

اس طرح ایک مہینہ گزرگیا۔ صبح کا وقت تھا۔ بھٹل داس انھیں تفکرات میں ڈوبے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے مصمم ارادہ کرلیاتھا۔ کہ آج اس خلجان کو مٹادوں گا۔ آشرم ٹوٹ جائے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اس سے بدرجہ بہتر ہے۔ کہ وہ ایسی نااہلیوں کا نشانہ نہ بنے۔ دفعتاً ایک فٹن آشرم کے دروازہ پر آکر رُکی۔ اس میں سے کون لوگ اترے؟ عبداللطیف اور ابوالوفا۔

بٹھل داس دل میں تلملاکر رہ گئے۔ جی میں تو آیا کہ دونوں کو دُت کار دوں، پر صبر سے کام لیا۔

منشی ابوالوفا نے فرمایا، ''آداب عرض ہے، بندہ نواز! آج طبیعت کچھ پریشان ہے کیا۔ واللہ آپ کا ایثار دیکھ کر روح کو تقویت ہوتی ہے، کہ ابھی ہم میں کچھ انسان باقی ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ قوم جس میں آپ جیسے سچے خادم موجود ہیں۔ ایک ہماری خودغرض، خودنما قوم ہے۔ جسے ان باتوں کی حِس ہی نہیں۔ جو حضرات بہت نیک نام ہیں وہ بھی غرض سے پاک نہیں۔

عبد اللطیف ۔ جناب ہماری قوم کو کچھ نہ کہیے۔ خودغرض، خودفروش، خودمطلب، کج فہم، کج رو، کج بیں، جو کہیے تھوڑا ہے۔ بڑے بڑوں کو دیکھیے رنگے ہوئے سیار ہیں۔ ریا کا جامہ پہنے ہوئے۔ آپ کی ذات مصدر برکات ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خداوندتعالےٰ نے زمرہ ملائک میں سے انتخاب کرکے آپ کو اس خوش نصیب قوم پر نازل کیا ہے۔

ابوالوفا۔ آپ کی پاک نفسی دلوں پر خواہ مخواہ اثر ڈالتی ہے۔ آپ کے یہاں کچھ سوزن کاری اور بیل بوٹے کے کام تو ہوتے ہی ہوں گے؟ میرے ایک دوست نے سوزن کاری کے کئی درجن چادروں کی فرمائش لکھ بھیجی ہے۔ حالانکہ شہر میں اور کئی جگہ یہ کام ہوتا ہے۔ لیکن میں نے خیال کیا۔ کہ آشرم کو دوسرے پرائیویٹ کام کرنے والوں پر ترجیح ہونی چاہیے۔ آپ کے یہاں کچھ نمونے موجود ہوں تو تکلیف کرکے دکھا دیجیے۔ اگر اس وقت امر مانع ہو یا نمونے موجود نہ ہوں تو پھر کسی وقت حاضر ہوں۔

عبداللطیف۔ میرے گھر میں بھی چکن کے تھان کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ کے تھان بازار میں ہیں۔ لیکن میں ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق آشرم ہی کو یہ آرڈر دینا چاہتا ہوں۔

بٹھل داس نے بے رُخی سے کہا، ''میرے یہاں سوزن کاری بالکل نہیں ہوتی۔''

ابوالوفا۔ مگر ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ دریافت کیجیے۔ کچھ مستورات ضرور اس فن میں ماہر ہوں گی۔ ہمیں ایسی کوئی عجلت نہیں ہے۔ پھر حاضر ہوں گے۔ ایک، دو، چار، دس، بارہ آنے میں ہم کو کوئی عذر نہیں ہے آپ اپنا سب کچھ نثار کررہے ہیں۔ تو کیا ہم سے اتنا بھی نہ ہوگا۔ میں ان معاملات میں قومی تفریق مناسب نہیں سمجھتا۔

بٹھل داس۔ میں ان عنایات کے لیے آپ کا مشکور ہوں لیکن کمیٹی نے فیصلہ کردیا ہے کہ یہاں سوزن کا کام نہ کرایا جائے۔ کیونکہ اس سے بینائی کمزور ہوتی ہے، اس وجہ سے مجبور ہوں۔

یہ کہہ کر بٹھل داس اٹھ کھڑے ہوئے اب دونوں حضرات کو لوٹ جانے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی دل میں بٹھل داس کو صلوٰتیں سناتے ہوئے فٹن پر سوار ہوگئے۔

لیکن ابھی فٹن کی آواز کانوں میں آہی رہی تھی کہ چمن لال کا موٹرکار آپہنچا۔ سیٹھ جی لکڑی کے سہارے اترے اور بٹھل داس سے ہاتھ ملاکر بولے،"کیوں بابو صاحب! ناٹک کے متعلق آپ نے کیا رائے قائم کی؟ شکنتلا کو انگریز لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ کچھ پارٹ یاد کرائے ہوں۔ تو میں بھی سنوں۔ کبھی کبھی ضرورت کے وقت ہمیں ایسی چالیں سوجھ جاتی ہیں۔ جو سوچنے سے دھیان میں نہیں آتیں۔ بٹھل داس نے بہت سوچا تھا کہ ان موٹے مل سے کیوں کر پنڈ چھوٹے۔ لیکن کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی تھی اس وقت دفعتاً انھیں ایک حکمت سوجھ گئی بولے،"جی نہیں اس کے کھیلنے کی صلاح نہ ہوئی۔ میں نے اس معاملے میں کلکٹر صاحب سے رائے لی تھی۔ اُنھوں نے منع فرمایا، سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ لوگ پالیٹکس کے کیا معنی لیتے ہیں۔ آج جب میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے اس آشرم کے لیے کچھ سالانہ امداد کی درخواست کی تو بولے میں پالیٹکل کاموں میں مدد نہیں دے سکتا۔ میں حیرت میں آگیا پوچھا آپ آشرم کو کس لحاظ سے پالیٹکل سمجھتے ہیں؟ اس کا صرف یہ جواب دیا کہ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

سیٹھ چمن لال کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بولے،"تو صاحب آشرم کو پالیٹکل سمجھ لیا؟"

بٹھل۔ جی ہاں صاف صاف کہہ دیا۔

چمن لال۔ جب ان کا یہ خیال ہے۔ تو یہاں آنے جانے والوں کی دیکھ بھال بھی ضرور ہوتی ہوگی؟

بٹھل داس۔ جی ہاں اور کیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جن لوگوں کے دلوں میں قوم کا درد ہے وہ ان باتوں کی پرواکب کرتے ہیں۔

چمن لال۔ جی نہیں، میں ان درمندانِ قوم میں نہیں ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ یہ لوگ رام لیلا بھی پالیٹکل سمجھتے ہیں تو میں اسے بند کردوں۔ پالیٹکس کے نام سے میری روح فنا ہوتی ہے آپ میرے گھر دیکھ کر آیئے۔ بھگوت گیتا کی ایک جلد بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے نوکروں کو سخت تاکید کردی ہے، کہ بازار سے چیزیں پتوں میں لایاکریں۔ میں

اخباروں کی پڑیاں تک گھر میں نہیں آنے دیتا۔ رانا پرتاب کی ایک پرانی تصویر کمرہ میں تھی۔ اسے میں نے اتار کر صندوق میں بند کرادیا ہے۔ تو اب مجھے اجازت دیجیے؟"

یہ کہہ کر وہ توند سنبھالتے ہوئے موٹرکار کی طرف لپکے۔ اور دم زدن میں موٹر کی گرد اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ بٹھل داس دل میں خوب ہنسے۔ اچھی چال سوجھی۔ لیکن انھیں اس کا مطلق خیال نہ تھا۔ کہ جھوٹ کتنا بولنا پڑا۔ اور اس سے روح کو کتنا زوال پہنچا۔ یہ نیکی کا پتلا اپنے ذاتی معاملات میں دروغ سے کوسوں بھاگتا تھا۔ لیکن قومی معاملات میں وقتاً فوقتاً اس سے مدد لینے میں دریغ نہ کرتا تھا۔

چمن لال کے جانے کے بعد بٹھل داس نے چندے کا رجسٹر اٹھایا، اور چندہ وصول کرنے کو چلے۔ لیکن کمرہ سے باہر بھی نہ نکلے تھے، کہ سیٹھ بلبھدرداس کو پیرگاڑی پر آتے دیکھا۔ غصہ کی ایک لہر ساری رگوں میں دوڑگئی، رجسٹر پٹک دیا، اور آمادۂ جنگ ہو بیٹھے۔ راہِ فرار نہ تھی۔

بلبھدرداس نے آگے بڑھ کر کہا، "کہیے بابوصاحب! کل میں نے جو پودے بھیجے تھے وہ آپ نے بٹھا دیئے یا نہیں؟ ذرا میں بھی دیکھنا چاہتاہوں۔ ضرورت ہو تو اپنا مالی بھیج دوں۔"

بٹھل داس بے رُخی سے بولے، "جی نہیں آپ کو مالی بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ وہ پودے یہاں لگ سکتے ہیں۔"

بلبھدر۔ کیوں، لگ کیوں نہیں سکتے؟ میرا مالی آکر سب ٹھیک کردے گا۔ آج ہی لگوا دیجیے۔ ورنہ سب سوکھ جائیں گے۔

بٹھل۔ سوکھ جائیں یا رہیں، پریہاں وہ لگ نہیں سکتے۔

بلبھدر۔ نہیں لگانے تھے تو پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ میں نے سہارنپور سے منگوائے تھے۔

بٹھل۔ برآمدے میں پڑے ہیں۔ اٹھوالے جائیے۔

سیٹھ جی خوددار اور بے باک آدمی تھے، یوں وہ نہایت خلیق، سلیم، بامروّت آدمی تھے۔ لیکن ذرا کسی نے اکڑکر بات کی، ذرا نگاہ بدلی، اور وہ ذہانت کا پتلا آگ ہوجاتا تھا۔ اسی وجہ سے خاص حلقوں میں وہ مغرور اور بدمزاج مشہور تھے۔ لیکن انھیں اوصاف کے باعث وہ رعایا کے منظورِ نظر بنے ہوئے تھے۔ پبلک کو ان پر کامل اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ

کبھی حق کے معاملے میں قدم پیچھے نہ ہٹائیں گے۔ اپنی ذاتی شہرت یا مفاد کے لیے پبلک کا بُرا نہ سوچیں گے۔ ڈاکٹر شیاما چرن پر پبلک کو یہ اعتماد نہ تھا۔ جمہور کی نگاہ میں علم اور عقل، اعزاز و امتیاز کی اتنی وقعت نہیں ہوتی، جتنی اخلاقی قوت کی۔ بٹھل داس کی کج عقلی نے ان کے تیوروں پر بل ڈال دیے۔ اینٹ اور پتھر کی جنگ شروع ہوئی، تن کر بولے، ''آج آپ اتنے برہم کیوں ہیں؟''

بٹھل داس ۔ مجھے چکنی چپڑی باتیں کرنی نہیں آتیں۔

بلبھدر۔ چکنی چپڑی باتیں نہ کیجیے۔ لیکن لاٹھی تو نہ ماریے۔ شرافت کے یہ معنی نہیں ہیں۔''

''میں آپ سے شرافت کا سبق نہیں لینا چاہتا۔''

''آپ جانتے ہیں، میں بھی کارکن کمیٹی کا ممبر ہوں۔''

''جی ہاں جانتا ہوں۔''

''چاہتا تو کمیٹی کا صدر ہوتا۔''

''جانتا ہوں۔''

''میرے عطیے کسی سے کم نہیں ہیں۔''

''ان پرانی باتوں کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔''

''چاہوں تو آشرم کی ہستی کو خاک میں ملادوں۔''

''غیر ممکن۔''

''کارکن کمیٹی کے ممبروں کو اشارے پر نچاسکتا ہوں۔''

''ممکن ہے۔''

''ایک دن میں اس کی ہستی مٹاسکتا ہوں۔''

''غیر ممکن۔''

''آپ کس گھمنڈ میں پھولے ہوئے ہیں؟''

''ایشور کے بھروسے پر۔''

سیٹھ جی آشرم کی طرف پُرغضب نگاہوں سے تاکتے ہوئے پیرگاڑی پر سوار ہوگئے۔ لیکن بٹھل داس پر ان کی دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا، انھیں یقین تھا، کہ وہ آشرم کے متعلق

ممبروں سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ ان کا غرور انھیں اتنا نیچا نہ کرنے دے گا۔ ممکن ہے وہ اس خفت کو مٹانے کے لیے ممبروں سے آشرم کی تعریف کریں، لیکن یہ آگ کبھی نہ کبھی بھڑکے گی۔ ضرور اس میں شک نہ تھا۔ غرور اپنی ذلت کو نہیں فراموش کر سکتا۔ اس کا خدشہ ہونے پر بھی بٹھل داس کو وہ ملال نہ تھا جو کسی بدمزگی کے بعد دل پر چھا جایا کرتا ہے۔ اس کے برعکس انھیں اپنے فرض کو پورا کرنے کا اطمینان تھا۔ اور وہ پچھتا رہے تھے کہ میں نے اب تک اتنی تاخیر کیوں کی، اس اطمینانِ قلب کا ان پر ایسا سرور ہوا، کہ وہ بلند آواز سے یہ پد گانے لگے۔

پربھوجی مجھے کاہے کی لاج

جنم جنم یونہی بھرمانیوا بھانی بے کاج

(بھٹکتا ہوں) مغرور بے مصرف

پربھوجی مجھے کاہے کی لاج

اسی اثنا میں انھیں پدم سنگھ آتے نظر آئے۔ متفکر، زرد، خستہ، پریشان حالی کی مجسم صورت، گویا ابھی روکر آنسو پونچھے ہیں۔ بٹھل داس آگے بڑھ کر ان سے گلے ملے، اور پوچھا، "کہیے کچھ طبیعت ناساز ہے کیا بالکل پہچانے نہیں جاتے؟"

پدم سنگھ۔ جی نہیں بیمار تو نہیں ہوں، ذرا پریشان رہا۔

بٹھل داس ۔ شادی بخیریت ہوگئی؟

پدم سنگھ نے چھت کی طرف تاکتے ہوئے کہا، "اس کا قصہ نہ پوچھیے۔ شادی کیا ہوئی ایک غریب لڑکی کی زندگی خاک میں ملا آئے۔ وہ لڑکی سُمن بائی کی بہن نکلی۔ بھائی صاحب کو جونہی معلوم ہوا، وہ دروازہ سے بارات لوٹا لائے۔

بٹھل داس۔ یہ تو ایک سانحہ ہے۔ آپ نے اپنے بھائی صاحب کو سمجھایا نہیں؟

پدم سنگھ۔ آپ سمجھانے کی کہتے ہیں۔ میں لڑا، جھگڑا، مار تک کھائی، لیکن بے سود۔

بٹھل ۔ دیکھیے اب بے چاری لڑکی کی کیا کیا گت ہوتی ہے۔ سمن سنے گی تو روئے گی۔

پدم۔ کہیے یہاں کی کیا خبریں ہیں۔ سمن کے آنے سے آشرم میں کوئی ہنگامہ تو نہیں مچا، ودھوائیں اس سے نفرت تو ضرور کرتی ہوں گی۔

بٹھل۔ راز کھل جائے۔ تو آج آشرم خالی نظر آئے۔

پدم ۔ اور سمن کیسے رہتی ہے؟
بٹھل۔ بالکل اس طرح گویا آشرم ہی میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے حسن اخلاق سے اپنے داغ کو مٹانا چاہتی ہے۔ ہرایک کام کرنے کو تیار اور بہ خندہ پیشانی، ودھوائیں سوتی رہتی ہیں۔ اور وہ ان کے کمروں میں جھاڑو دے آتی ہے۔ کئی عورتوں کو کھانا پکانا سکھاتی ہے۔ کئی عورتیں اس سے سینا پرونا سیکھتی ہیں، سب کی سب ہر ایک معاملہ میں اسی کی صلاح پر چلتی ہیں۔ اس چاردیواری کے اندر اب اس کا راج ہے۔ مجھے اس سے ہرگز ایسی امید نہ تھی۔ یہاں اس نے کچھ پڑھنا بھی شروع...... کردیا ہے۔ اور جناب دل کا حال تو پرماتما ہی جان سکتا ہے۔ پر بظاہر اس کی کایا پلٹ سی ہوگئی ہے۔
پدم سنگھ۔ نہیں جناب اس کے اطوار کبھی بُرے نہیں رہے۔ میرے یہاں مہینوں اس کی آمدورفت تھی میرے گھر میں اس کی بڑی تعریف کیا کرتی تھیں۔ کچھ ایسے ناگوار اتفاقات ہی ہوگئے۔ جن کی بدولت اُسے یہ ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ سچ پوچھیے۔ تو ہماری حماقتوں کا خمیازہ اسے اُٹھانا پڑا۔ ہاں کچھ اس طرف کی خبریں بھی ملیں؟ سیٹھ بلبھدرداس نے اور کوئی چال چلی؟
بٹھل۔ ہاں صاحب وہ چپ بیٹھنے والے آدمی ہیں؟ آج کل خوب دوڑدھوپ ہورہی ہے۔ تین دن ہوئے ہندو ممبروں کا ایک جلسہ بھی ہواتھا۔ میں تو جا نہ سکا، پر سنتا ہوں۔ میدان انھیں لوگوں کے ہاتھ رہا۔ اب پریذیڈنٹ کے دو ووٹ ملاکر ان کے پاس چھ ووٹ ہیں اور ہمارے پاس صرف چار، ہاں مسلمانوں کے ووٹ ملاکر برابر ہوجائیں گے۔
پدم۔ تو ہم کو کم سے کم ایک ووٹ اور ملنا چاہیے؟ ہے اس کی کوئی امید؟
بٹھل۔ مجھے تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔
پدم۔ فرصت ہو تو چلیے ذرا ڈاکٹر صاحب اور لالہ بھگت رام کے پاس چلیں۔
بٹھل۔ ہاں چلیے میں تیار ہوں۔

(۱۲)

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ قریب ہی تھا۔ لیکن ان دونوں صاحبوں نے ایک گاڑی کرایہ کی لی۔ ڈاکٹرصاحب کے دولت خانہ پر پیدل جانا فیشن کے خلاف تھا۔ راستہ میں بٹھل داس نے آج کے سب حالات مبالغہ کے ساتھ بیان کیے۔ اور اپنی فراست کا خوب اظہار

کیا۔ پدم سنگھ نے یہ کیفیت سنی تو اندازِ تفکر سے بولے،"تو اب ہمیں اور بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، غالباً انجام یہ ہوگا۔ کہ آشرم کا سارابار ہمیں لوگوں پر پڑے گا۔ بلبھدرداس ابھی چاہے خاموش ہوجائیں پر کبھی نہ کبھی اس کا غبار نکلے گا ضرور۔"

بٹھل داس۔ میں کیا کروں۔ مجھ سے یہ اندھیر دیکھ کررہا نہیں جاتا بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یہ حضرات علم اور تہذیب اور اخلاق کے پتلے بنے پھرتے ہیں۔ اور حرکات ایسی ناشائستہ!

پدم سنگھ۔ خیر یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ یہ بھی میرے اعمال کا نتیجہ ہے دیکھیے ابھی اور کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ جب سے بارات واپس آئی ہے۔ میری عجیب حالت ہورہی ہے، نہ بھوک، نہ پیاس، رات بھر کروٹیں بدلا کرتاہوں۔

یہی غم ستایا کرتا ہے کہ اس بدنصیب لڑکی کی کیاگت ہوگی، اگر کہیں آشرم کی فکر بھی سر پر آپڑی تو جان ہی پر بن جائے گی۔ ایسے اتھاہ دلدل میں پھنس گیاہوں کہ جوں جوں اوپر اُٹھنا چاہتا ہوں اور نیچے دباجاتاہوں۔

اتنے میں ڈاکٹرصاحب کا بنگلہ آگیا۔ ۱۰ بجے تھے ڈاکٹرصاحب اپنے سجے ہوئے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی بڑی لڑکی مس کانتی سے شطرنج کھیل رہے تھے۔ میزپر دو ٹیریر کتے بیٹھے بڑے غور سے شطرنج کی چالوں کا ملاحظہ کررہے تھے اور کبھی کبھی جب ان کے خیال میں کھلاڑیوں سے کوئی غلطی ہوجاتی تھی۔ تو وہ پنجوں سے مہروں کو ٹھیک کردیا کرتے تھے۔ مس کانتی اُن کی اس شرارت پر ہنس کر انگریزی میں کہتی تھی۔"یوناٹی" میز کے بائیں ایک کرسی پر سیّد تیغ علی صاحب رونق افروز تھے۔ اور مس کانتی کو چالیں بتاتے جاتے تھے۔

اسی اثنا میں یہ دونوں آدمی کمرہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹرصاحب نے تپاک سے اُٹھ کر ان سے ہاتھ ملائے۔ مس کانتی نے ان کی طرف دبی نگاہوں سے دیکھا۔ اور میز پر سے ایک اخبار اُٹھاکر پڑھنے لگیں۔

ڈاکٹرصاحب نے انگریزی میں فرمایا:"آپ سے مل کر بہت خوش ہوا، آیئے آپ لوگوں کو مس کانتی سے انٹروڈیوس کرادوں۔"

تعارف ہوجانے پر مس کانتی نے دونوں آدمیوں سے ہاتھ ملایا۔ اور شگفتہ ہوکر بولیں،"پاپا ابھی آپ ہی صاحبوں کا ذکر کررہے تھے۔ آپ سے مل کرمیں بہت خوش ہوئی۔"

ڈاکٹر شیاماچرن۔ مس کانتی ابھی ڈلہوزی پہاڑ سے آئی ہیں۔ ان کا اسکول جاڑوں میں بند ہوجاتا ہے۔ وہاں تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔ یہ انگریزوں کی لڑکیوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہیں۔ لیڈی پرنسپل نے اب کے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ کانتی! ذرا اپنی لیڈی پرنسپل کی چٹھی انھیں دکھادو۔ مسٹر سنہا (پدم سنگھ) اپ کانتی کی انگریزی تقریر سن کر دنگ رہ جائیں گے (ہنستے ہوئے) یہ مجھے کتنے ہی نئے محاورے سکھا سکتی ہے۔

مس کانتی نے شرماتے ہوئے اپنا سرٹیفکیٹ پدم سنگھ کو دکھایا۔ وہ اسے پڑھ کر بولے، "کیا آپ لیٹن بھی پڑھتی ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "لیٹن میں اب کے ایک تمغا انعام ملا ہے۔ کل کلب میں کانتی نے ایسا گیم (کھیل) دکھایا، کہ انگریز لیڈیاں حیرت میں آگئیں۔ اس نے سب کے چھکے چھڑا دیے۔ ہاں اب کی بار آپ ہندو ممبروں کے جلسے میں نہیں تھے؟"

پدم سنگھ۔ جی نہیں میں ذرا مکان پر چلاگیا تھا۔

شیاماچرن۔ آپ ہی کی تجویز درپیش تھی۔ میں تو مناسب سمجھتا ہوں کہ ابھی آپ اسے بورڈ میں پیش کرنے میں عجلت نہ کریں۔ ابھی کامیابی کی امید بہت کم ہے۔

تیغ علی۔ جناب مسلمان ممبروں کی طرف سے تو آپ کو پوری مدد ملے گی۔

شیاماچرن۔ درست ہے۔ لیکن ہندو ممبروں میں تو اختلاف ہے۔

پدم سنگھ۔ اگر آپ اعانت فرمائیں، تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔

شیاماچرن۔ مجھے آپ کی کامیابی سے کامل ہمدردی ہے لیکن آپ کو معلوم ہے میں گورنمنٹ کا نامزد کردہ ممبر ہوں۔ جب تک یہ تحقیق نہ ہوجائے، کہ گورنمنٹ اس تجویز کو پسند کرتی ہے، یا نہیں اس وقت تک میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

بٹھل داس نے بے تمیزانہ انداز سے کہا: "جب ممبر ہونے سے آپ کے خیالات کی آزادی میں فرق آتا ہے۔ تو میرے خیال میں آپ کو استعفا دے دینا چاہیے۔"

تینوں آدمیوں نے بٹھل داس کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔ ان کی یہ گفتگو بالکل بے موقع تھی۔ تیغ علی نے طنز سے کہا، "استعفا دے دیں، تو یہ قدرومنزلت کیوں کر حاصل ہو؟ لاٹ صاحب کے برابر کرسی پر کیسے بیٹھیں؟ آنریبل کیوں کہلائیں؟ بڑے بڑے انگریزوں سے ہاتھ ملانے کا اعزاز کیوں کر حاصل ہو، سرکاری دعوتوں میں بڑھ

بڑھ کر ہاتھ مارنے کے موقع کیوں کر میسر ہوں، نینی تال کی سیر کیوں کر کریں، اپنی تقریر کا اعجاز کیوں کر دکھائیں؟ یہ بھی تو سوچیے۔"

بٹھل داس کٹ گئے۔ تیغ علی نے انھیں بڑی بے رحمی سے جھنجھوڑا۔ پدم سنگھ پچھتائے۔ کہ ناحق ایسے آدمی کے ساتھ آئے۔

ڈاکٹر صاحب نے متین لہجہ میں کہا، "عوام کا خیال ہے کہ لوگ اسی اعزاز و وقار کی ہوس میں ممبری کے لیے ڈوڑتے ہیں۔ وہ مطلق نہیں سمجھتے کہ یہ کتنی عظیم ذمہ داری کا کام ہے۔ غریب ممبر کو اپنا کتنا وقت، کتنی محنت، کتنی دولت اس ذمہ داری پر قربان کرنی پڑتی ہے۔ اس کے صلے میں اسے بجز اس اطمینان کے اور کیا ملتاہے کہ میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کررہا ہوں۔ یہ اطمینان نہ ہو۔ تو کوئی ممبری کی پروا بھی نہ کرے۔"

تیغ علی۔ جی ہاں اس میں کیا شک ہے، جناب صحیح فرماتے ہیں۔ جس کے سر پر عظیم الشان ذمہ داری پڑتی ہے۔ اس کا دل ہی جانتا ہے۔

گیارہ بج گئے تھے۔ پدم سنگھ اور بٹھل داس یہاں سے چلے۔ راستہ میں بٹھل داس نے کہا، "میرے کھانے کا وقت آگیا، میں اب جاتاہوں۔ آپ شام کو تشریف لائیے گا۔" پدم سنگھ نے کہا، "ہاں ہاں شوق سے جائیے گا۔" انھیں خیال آیا، کہ جب ایسا دھن کا پکا آدمی کھانے میں ذراسی دیر ہوجانے پر بے چین ہوجاتا ہے۔ تو دوسروں سے کیا امید کی جاسکتی ہے لوگ قوم اور ملت کے خادم بنتے ہیں۔ پرذرا سی بھی تکلیف نہیں اُٹھانی چاہتے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ لالہ بھگت رام کے مکان پر آپہنچے۔

لالہ بھگت رام دھوپ میں تخت پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ان کی چھوٹی لڑکی گود میں بیٹھی ہوئی دھوئیں کو پکڑنے کے لیے باربار لپکتی تھی، سامنے زمین پر کئی مستری اور معمار بیٹھے ہوئے تھے۔ بھگت رام پدم سنگھ کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور پالاگن کرکے بولے، "میں نے شام ہی کو سنا تھا کہ آپ آگئے۔ آج صبح ارادہ کیا کہ چلوں۔ لیکن کچھ ایسی جھنجھٹ میں پھنس گیا کہ فرصت ہی نہ ملی۔ یہ ٹھیکیداری بڑے جھگڑے کا کام ہے۔ کام کرائیے، اپنے روپے لگائیے اس پر دوسروں کی خوشامد کیجیے۔ آج کل انجنیر صاحب نہ جانے کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میرا کوئی کام انھیں پسندہی نہیں آتا ایک پُل بنانے کا ٹھیکہ لیاتھا۔ اسے تین بار گراچکا ہوں، کبھی کہتے ہیں، یہ نہیں بنا، کبھی کہتے ہیں وہ نہیں بنا۔ نفع

کیا ہوگا۔ اُلٹا نقصان اُٹھارہاہوں۔ کوئی سننے والا نہیں، آپ نے ہندو ممبروں کے جلسے کی کیفیت تو سُنی ہوگی۔

پدم سنگھ۔ جی ہاں سنا۔ اور سن کر رنج ہوا، آپ سے مجھے پوری امید تھی۔ کیا آپ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے؟

بھگت رام۔ جناب محض اتفاق ہی نہیں ہے اس کی دل سے مدد کرنا چاہتا ہوں۔ پر میں اپنی رائے کا مالک نہیں ہوں۔ میں نے اپنے تئیں غرض کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ مجھے آپ گراموفون کا ریکارڈ سمجھیے۔ جو کچھ بھردیا جاتاہے وہی کہتا ہوں، اور کچھ نہیں۔

پدم سنگھ۔ لیکن آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قومی بہبود کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینی چاہیے۔

بھگت رام۔جی ہاں اصولاً اسے تسلیم کرتاہوں۔ لیکن عمل کی جرأت نہیں۔ آپ جانتے ہیں میرا سارا کاروبار سیٹھ چمن لال کی مدد سے چلتا ہے اگر انھیں ناراض کردوں تو یہ سارا ٹھاٹ بگڑجائے شہر میں میری جو کچھ عزت ہے۔ وہ اسی ٹھاٹ کے باعث ہے علم اور عقل ہے ہی نہیں صرف اسی سوانگ کا بھروسا ہے۔ آج اگر قلعی کھل جائے۔ تو کوئی بات بھی نہ پوچھے۔ دودھ کی مکھی کی طرح سماج سے نکال دیاجاؤں بتلائیے شہر میں ایسا کون ہے، جو محض میرے اعتبار پر بلا سود کے ہزاروں روپے قرض دے دے؟ اور پھر صرف اپنی ہی فکر نہیں کم سے کم تین سوروپیہ ماہوار خاندان کا خرچ ہے۔ قوم کے لیے میں خود تکلیف اُٹھانے کے لیے تیارہوں۔ لیکن عیال کو کیوں کر منجدھار میں چھوڑدوں؟

ہم جب اپنے کسی فرض سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو الزام سے بچنے کے لیے ایسی ایسی پُرزور دلیلیں اختراع کرتے ہیں۔ کہ کوئی اعتراض نہ کرسکے۔ اس وقت ہم شرم اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی دلیری سے اپنے متعلق ایسے ایسے رازوں کا افشا کردیتے ہیں، جو کسی وقت ہماری زبان پر نہ آتے۔ پدم سنگھ سمجھ گئے کہ ان سے بھی کوئی امید نہیں ہے، بولے،"ایسی حالت میں آپ پر کیوں زور دے سکتاہوں۔ مجھے صرف ایک ووٹ کی فکر ہے۔ کوئی تدبیر بتلائیے۔ کیوں کر حاصل ہو؟"

بھگت رام۔ میری صلاح تویہ ہے کہ آپ کنورصاحب کے پاس جائیے۔ ان کا ووٹ آپ کو یقیناً مل جائے گا۔ سیٹھ بلبھدرداس نے ان پر تیس ہزار کی نالش کی ہے۔ کل ان کی

ڈگری بھی ہوگئی۔ کنور صاحب آج کل سیٹھ جی سے تنے ہوئے ہیں بس چلے تو انھیں گولی ماردیں۔ انھیں قابو میں لانے کی ایک اور تدبیر آپ کو بتلاتا ہوں۔ آپ انھیں کسی جلسہ کا پریزیڈنٹ بنا دیجیے۔ بس ان کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہوجائے گی۔

پدم سنگھ نے ہنس کر کہا، "اچھی بات ہے، انھیں کے ہاں چلتا ہوں۔"

دوپہر ہوگئی تھی، لیکن پدم سنگھ کو بھوک پیاس نہ تھی۔ بگھی پر بیٹھ کر چلے۔ کنور صاحب برنا کے کنارے ایک بنگلہ میں رہتے تھے۔ آدھ گھنٹہ میں جا پہنچے۔ بنگلہ کے احاطہ میں نہ کوئی سجاوٹ تھی، نہ صفائی۔ پھول پتی کا نام نہ تھا۔ برآمدے میں کئی کتے زنجیروں سے بندھے کھڑے تھے۔ کنور صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ کبھی کبھی کشمیر تک کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے ستار بجا رہے تھے۔ دیواروں پر ہرنوں کے سینگ اور چیتوں کی کھالیں زیب دے رہی تھیں۔ ایک گوشہ میں کئی بندوقیں اور بھالے رکھے ہوئے تھے دوسری طرف ایک بڑی میز پر ایک گھڑیال بیٹھا ہواتھا۔ پدم سنگھ نے کمرہ میں قدم رکھا۔ تو اسے دیکھ کر ایک بار چونک پڑے۔ کھال میں ایسی صفائی سے بھوسا بھرا گیاتھا۔ کہ اس میں جان سی پڑگئی تھی۔

کنور صاحب نے پدم سنگھ کو دیکھا۔ تو ٹوٹ کر گلے ملے۔ اور بولے، "آیئے جناب! آپ کی زیارت ہی نصیب نہیں ہوتی۔ مکان سے کب آئے؟"

پدم سنگھ۔ کل آیا۔

کنور ۔چہرہ اترا ہوا ہے، بیمار تھے کیا؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں، کوئی خاص شکایت نہیں ہے۔

کنور۔ شربت پیجیے، پیاس لگی ہوگی؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں، معاف کیجیے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ کیاستار کی مشق ہورہی ہے؟

کنور۔ جی ہاں مجھے تو اپنے ستار ہی سے عشق ہے۔ ہارمونیم اور پیانو سن کر طبیعت مالش کرنے لگتی ہے ان انگریزی باجوں نے ہمارے فنِ موسیقی کا قلع قمع کردیا۔ ان کا چرچا ہی اُٹھ گیا۔ جو کچھ تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی، وہ تھیٹروں نے پوری کردی۔ بس جسے دیکھیے غزل اور قوالی کی رٹ لگارہا ہے۔ چند دنوں میں ہمارے فنِ حرب کی طرح اس کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔ موسیقی دلوں میں پاکیزہ جذبات پیدا کرتی ہے۔ جب سے فن نغمہ کی

کساد بازاری ہوئی۔ ہم بے حس ہوگئے۔ ہمارے دلوں میں نازک جذبات کا مادہ ہی نہیں رہا۔ اور اس کا سب سے بُرا اثر ہماری ادبیات پر نظر آتا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ جس قوم نے رامائن جیسی عدیم المثال تصنیف کی، سورساگر جیسا گلزار معانی سجایا۔ وہی قوم اب معمولی ناولوں کے لیے ترجمہ کی محتاج ہے۔ بنگال اور دکن میں ابھی تک گانے کا کچھ رواج ہے۔ اسی لیے وہاں جذبات کا ایسا فقدان نہیں ہے۔ کہیے، آپ کی تجویز کا کیا حشر ہوتا نظر آرہا ہے۔

پدم سنگھ۔ آپ یہ سوال پوچھ کر میرے اوپر ستم کررہے ہیں۔ مجھ کو آپ سے زیادہ ہمدردی کی توقع تھی۔

کنورصاحب نے قہقہہ مارا۔ ان کی ہنسی کمرہ میں گونج اٹھی۔ پیتل کی ڈھال جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ اس آواز سے جھنکارنے لگی۔ بولے،"آپ کو غالباً میری جانب سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ساری قوتِ تقریر آپ کی حمایت میں صرف کی۔ اس سے زیادہ میں اور کیا کرسکتا تھا؟ یہاں تک کہ میں نے اس تجویز کے مخالفین سے متانت کے ساتھ بحث کرنا بھی بیکار سمجھا۔ طنز آمیز تمسخر کا پہلو اختیار کیا (کچھ یاد کرکے) ہاں بات ہوسکتی ہے۔ سمجھ گیا۔ (پھر قہقہہ مارکر) اگر یہ بات ہے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ میونسپل بورڈ بچھیا کے تاوؤں ہی سے بھری ہوئی ہے۔ غالباً اس تمسخر کا منشا ہی کسی نے نہ سمجھا۔ کاشی کے روشن خیال، مہذب، معاملہ فہم بورڈ میں ایک شخص بھی ایسا سخن فہم نہ نکلا! سخت افسوس ہے۔ جناب آپ کو یقیناً میری جانب سے سخت غلط فہمی ہوئی۔ معاف کیجیے، مجھے آپ کی تجویز سے کامل اتفاق ہے۔

پدم سنگھ جب یہاں سے چلے تو ان کی طبیعت ایسی شگفتہ تھی۔ گویا کسی پُرفضا مقام کی سیر کرکے آئے ہوں۔ کنورصاحب کی شفقت اور اخلاق نے انھیں گرویدہ کرلیا تھا۔

(۱۳)

سدن جب مکان پر پہنچا۔ تو اس کی حالت اسی آدمی کی سی تھی، جو برسوں کی کمائی لیے دل میں ہزاروں منصوبے باندھتا۔ مسرت سے پھولا گھر آئے۔ اور یہاں صندوق کھولنے پر اسے اپنی تھیلیاں خالی نظر آئیں!

خیالات کی آزادی علم، صحبت، اور تجربہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سدن ان تینوں ارکانوں سے بے بہرہ تھا۔ یہ اس کی زندگی کا وہ زمانہ تھا۔ جب ہمیں اپنے مذہبی عقائد پر، اپنے معاشرتی رسوم پر، ایک غرور سا ہوتا ہے۔ جب ہمیں ان میں کوئی عیب نہیں نظر آتا۔ جب ہم ان کے خلاف کوئی دلیل یا اعتراض سننے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ اس وقت ہم میں "کیا" اور "کیوں" کی تمیز نہیں ہوتی۔ سدن کو گھر سے نکل بھاگنا منظور ہوتا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے گھر کی مستورات کو گنگا نہلانے لے جائے۔ اگر عورتوں کی ہنسی کی آواز کبھی مردانے میں سنائی دیتی، تو وہ تیور بدلے گھر میں آتا اور اپنی ماں کو آڑے ہاتھوں لیتا۔ سبھدرا کو اپنی ساس کی حکومت بھی اتنی سخت نہ معلوم ہوتی تھی۔ اخلاقی کمزوریوں کو وہ فلسفی کی فیاض نگاہوں سے نہیں۔ زاہد کی خشک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے گاؤں کے ایک ٹھاکر نے ایک بیڑن گھر میں ڈال لی تھی۔ تو سارے گاؤں نے اس کے دروازہ پر آنا جانا ترک کردیا تھا۔ اور کچھ اس طرح سے اس کے پیچھے پڑے تھے کہ اسے جبراً و قہراً بیڑن کو گھر سے نکالنا پڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سمن بائی پر جان دیتا تھا۔ لیکن اس کے مذہب میں یہ محبت اتنا ناقابلِ عفو گناہ نہ تھا۔ جتنا سمن کی پرچھائیں کا اس کے گھر میں آجانا۔ اس نے اب تک سمن کے یہاں پان تک نہ کھایا تھا۔ وہ اپنی خاندانی نجابت اور مجلسی رسم و رواج کو اپنے ضمیر سے بھی زیادہ وقیع سمجھتا تھا۔ اس ذلت اور رسوائی کا خیال ہی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ جو ایک خانہ برباد عورت سے قرابت ہوجانے کے باعث اس کے خاندان پر نازل ہوتی۔ اس کے مقابلے میں وہ ڈوب مرنا اچھا سمجھتا تھا۔ جنواسے میں پدم سنگھ کی باتیں سن سن کر بے حد اشتعال ہورہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں والدصاحب ان کی باتوں میں نہ آجائیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ چچا صاحب کو کیا جنون ہوگیا ہے۔ اگر یہی دلیلیں اس نے کسی دوسرے آدمی کی زبان سے سنی ہوتیں۔ تو بے محابا اس کی زبان پکڑلیتا۔ لیکن پدم سنگھ کا وہ بہت لحاظ کرتا تھا۔ اور دل میں پیچ وتاب کھاکر رہ جاتا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں جوابی دلیلوں کا ایک طوفان سا اٹھا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کبھی اتنی جولاں نہ ہوئی تھی۔ اور اگر یہ مباحثہ دلیلوں ہی تک رہتا۔ تو غالباً وہ ضرور اپنے چچا صاحب سے الجھ پڑتا۔ لیکن مدن سنگھ کی دست درازی نے اس کے جذبہ تردید کو ہمدردی کی صورت میں تبدیل کردیا۔

ادھر سے مایوس ہوکر سدن کا دل بے قرار پھر سمن بائی کی طرف لپکا لذتِ نشاط کا چسکہ پڑجانے کے بعد طبیعت کو روکنا دشوار تھا۔ وہ پدم سنگھ کے ساتھ ہی بنارس چلا آیا۔ لیکن یہاں آکر وہ ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ اسے اندیشہ ہونے لگا۔ کہ کہیں سمن کو ساری حقیقت معلوم نہ ہوگئی ہو۔ وہ خود تو وہاں نہ رہی ہوگی۔ ان لوگوں نے ضرور اسے ترک کردیا ہوگا۔ لیکن غیر ممکن ہے۔ کہ اسے شادی کی خبر نہ رہی ہو اگر اس پر سب حالات روشن ہوگئے ہوں گے۔ تو وہ مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گی۔ کیا عجب ہے مجھے جھڑک دے۔ لیکن شام ہوتے ہی اس نے کپڑے بدلے۔ گھوڑا کھنچوایا۔ اور دال منڈی کی طرف چلا، وصال کی دل خوش کن آرزو نے ان شکوک کو زیر کردیا۔ وہ سوچ رہاتھا۔ سمن مجھ سے کیا کہے گی۔ اور میں اسے کیا جواب دوں گا۔ کہیں اسے کچھ نہ معلوم ہو۔ اور وہ جاتے ہی محبت سے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہے۔ تم بڑے بے وفا ہو۔ تو بڑا مزہ آئے۔ اس تخیل نے اس کے شوق کو اور بھی تیز کردیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک لمحہ میں دال منڈی کے سامنے جا پہنچا۔ لیکن جس طرح ایک کھلاڑی لڑکا مدرسہ کے دروازہ پر آکر اندر جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اسی طرح سدن دال منڈی کے سامنے آکر ٹھٹک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام پر آکر کھڑا ہوگیا۔ جہاں سے سمن کا بالاخانہ صاف نظر آتا تھا...... یہاں سے اس نے نگاہ خوف سے سمن کے دروازہ کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا، قفل پڑا ہوا تھا۔ سدن کے دل پر سے ایک بوجھ سا اترگیا۔ یہ مایوسی کامیابی سے بدرجہا اطمینان بخش ثابت ہوئی۔ اسے کچھ وہی مسرت ہوئی۔ جو اس آدمی کو ہوتی ہے۔ جو جیب میں پیسے نہ رہنے پر بھی لڑکے کی ضد سے مجبور ہوکر کھلونے کی دکان پر جائے اور اسے بند پائے۔

مگر یہ مسرت ناکامی بہت دیر تک قائم نہ رہی۔ سدن جب مکان پر لوٹا تو بہت اداس تھا اسے اپنے دل میں ایک خلا۔ ایک سونا پن محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سب کچھ کھوگیا ہو۔ رات کو جب سب لوگ سوگئے۔ تو وہ چپکے سے اُٹھا اور دال منڈی کی طرف چلا۔ جاڑے کی رات تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاند کہرے کی آڑ سے جھانکتا تھا۔ اور کسی گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح تیزی سے دوڑتا چلا جاتا تھا۔ سدن دال منڈی تک ہوا کی طرح آیا۔ پر یہاں آکر پھر اس کے پیر بندھ گئے۔ اور جوش بھی ٹھنڈا پڑگیا اسے خیال آیا۔

کہ اس وقت میرا یہاں آنا نہایت شرمناک ہے۔ سمن کے یہاں جاؤں۔ تو وہ مجھے کیا سمجھے گی؟ اس کے نوکرچاکر آرام سے سورہے ہوں گے۔ مجھے کون پوچھتا ہے۔ اسے تعجب ہوتاتھا۔ کہ میں یہاں کیسے چلا آیا۔ میری عقل کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اسی وقت لوٹ پڑا۔

دوسرے دن شام کو وہ پھر چلا۔ دل میں فیصلہ کرلیاتھا۔ کہ اگر سمن نے مجھے دیکھ لیا۔ اور بلالیا تو جاؤں گا۔ ورنہ سیدھے اپنی راہ چلاجاؤں گا۔ اس کا مجھے بلانا ہی بتادے گا۔ کہ اس کا دل میری طرف سے صاف ہے۔ نہیں تو اس افسوسناک واقعہ کے بعد وہ مجھے بلانے ہی کیوں لگی۔ کچھ دیر اور آگے چل کر اس نے سوچا۔ کیا وہ مجھے بلانے کے لیے جھروکے پر بیٹھی ہوگی؟ اسے کیا معلوم کہ میں یہاں آگیا۔ نہیں مجھے ایک بار خود اس کے پاس چلنا چاہیے۔ سمن کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوسکتی۔ اور ناراض بھی ہو۔ تو کیا میں اسے منا نہیں سکتا۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑوں گا۔ اس کے پیر پڑوں گا۔ اور اپنے آنسوؤں سے اس کے دل کا غبار دھوؤں گا۔ وہ مجھ سے کتنی ہی بیزار ہو۔ پر میری محبت کے نقش کو دل سے مٹا نہیں سکتی۔ آہ! وہ اگر اپنے کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھرے میری طرف تاکے تو میں اس کے لیے کیا کچھ نہ کرڈالوں گا۔ اسے کوئی فکر ہوتو اس فکر کو دور کرنے کے لیے میں اپنی جان تک قربان کرسکتاہوں تو کیا وہ میری اس خطا کو معاف نہ کرے گی؟ لیکن جوں ہی دال منڈی کے مقابل پہنچا۔ اس کی بیتابیاں اس طرح غائب ہوگئیں۔ جیسے اپنے گاؤں میں شام کے وقت نیم کے نیچے دیوی کی مورت دیکھ کر اس کی دلیلیں غائب ہوجاتی تھیں۔ اس نے سوچا۔ کہیں وہ مجھے دیکھے اور دل میں کہے وہ جارہے ہیں کنور صاحب گویا سچ مچ کسی ریاست کے مالک ہیں۔ کیسا مکار آدمی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے پیروں میں زنجیر سی پڑگئی۔ آگے نہ بڑھ سکا۔

اسی طرح کئی دن گزرگئے۔ دن بھر اس کی تمنائیں جو بالو کی دیوار کھڑی کرتیں۔ وہ شام کو دال منڈی کے سامنے جاتے ہی حجاب کے صدمہ سے گرپڑتی تھی۔

ایک دن وہ گھومتے ہوئے کوئنس پارک جا پہنچا۔ وہاں ایک شامیانہ تنا ہوا تھا۔ اور لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے پُروفیسر رومیش دت کی پُراثر تقریر سن رہے تھے۔ سدن گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور بڑے غور سے تقریر سننے لگا۔ اس کے دل نے فیصلہ کیا بیشک یہ عصمت فروش فرقہ سوسائٹی کے لیے زہر قاتل ہے۔ میں بہت بچا ورنہ کہیں کا نہ رہتا۔ اسے شہر

سے باہر نکال دینا چاہیے۔ اگر سمن بازار میں نہ ہوتی۔ تو میں اس کے دامِ محبت میں ہرگز نہ پھنستا۔

دوسرے دن وہ پھر کوئنس پارک کی طرف گیا۔ آج وہاں منشی ابوالوفا کی مرصع تقریر ہورہی تھی۔ سدن نے اسے بھی غور سے سنا۔ اور اپنے دل میں کہا، "بیشک یہ فرقہ بے جا طور پر بدنام ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ یہ نہ ہوں تو۔ ہمارے دیوتاؤں کی یاد خیر کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔ یہ بھی سچ ہی کہا۔ کہ بازارِ حسن ہی وہ مقام ہے جہاں ہندو مسلمان دل کھول کر ملتے ہیں۔ جہاں حسد اور باہمی مخالفت کا گزر نہیں ہے جہاں ہم کارزار ہستی سے دم لینے کے لیے اپنے رنج و غم کو غلط کرنے کے لیے پناہ گزیں ہوتے ہیں یقیناً انھیں شہر سے نکال دینا انھیں پر نہیں۔ ساری آبادی پر سخت ظلم ہوگا۔

کئی دن کے بعد اس کے خیال نے پھر پلٹا کھایا۔ اور یہ سلسلہ بند نہ ہوتا تھا۔ اس میں اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی کسی مسئلہ کے حُسن و قبح کے تولنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کا سر ہر ایک پُرزور دلیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔

اس نے ایک دن پدم سنگھ کی تقریر کا نوٹس دیکھا۔ تین ہی بجے سے چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اور چار بجے بنی باغ میں جا پہنچا۔ وہاں ابھی کوئی آدمی نہ تھا۔ ہاں کچھ لوگ فرش بچھا رہے تھے۔ وہ گھوڑے سے اترا اور فرش بچھانے میں لوگوں کی مدد کرنے لگا۔ پانچ بجتے بجتے مجمع ہونے لگا۔ اور آدھ گھنٹہ میں وہاں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوگیا۔ تب اس نے ایک فٹن پر پدم سنگھ کو آتے دیکھا۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ پہلے مسٹر رستم بھائی نے ایک نظم پڑھی۔ جو خاص اس موقع کے لیے سید تیغ علی نے لکھی تھی۔ ان کے بیٹھنے پر لالہ بٹھل داس کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ان کی تقریر روکھی تھی۔ نہ کہیں لطفِ زبان تھا۔ نہ پُرمزہ چٹکیاں۔ لیکن ان کی باتوں کو لوگ بڑے غور سے سنتے رہے ان کے بے غرض قومی مشاغل نے پبلک کو ان کا معتقد بنادیا تھا۔ ان کی خشک اور پھیکی تقریر کو لوگ ایسے شوق سے سنتے تھے۔ جیسے پیاسا آدمی پانی پیتا ہے۔ان کے پانی کے سامنے دوسروں کا شربت پھیکا پڑ جاتا تھا۔

بالآخر پدم سنگھ اٹھے۔ سدن کے سینے میں گدگدی ہونے لگی۔ گویا کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ تقریر نہایت دلآویز اور جذبۂ درد سے پُر تھی۔ زبان کی سلاست اور

لطافت دلوں پر تسخیر کا عمل کر رہی تھی۔ موقع موقع پر ان کا طرز بیان اتنا مؤثر ہوجاتا تھا۔ کہ سدن کے روئیں کھڑے ہوجاتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے اس اخراج کی تجویز اس لیے نہیں کی ہے۔ کہ ہمیں ان عورتوں سے نفرت ہے۔ ہمیں ان سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ ان کے ساتھ سخت بے انصافی ہوگی ۔ یہ ہماری ہی ہوس رانیاں، ہماری ہی تمدنی برائیاں، ہماری ہی مذموم رسم و رواج ہیں۔ جنھوں نے یہ مجسم صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ بازار حسن ہماری پُرداغ معاشرت کا عکس، ہماری ہی شیطانی گمراہیوں کی زندہ تصویر ہے۔ ہم کس منہ سے انھیں حقیر سمجھیں؟ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم انھیں راہِ راست پر لائیں ان کی اصلاح کریں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب وہ شہر سے باہر مکروہات اور ترغیبات سے دور رہیں۔

سدن ہمہ تن گوش ہوکر یہ تقریر سنتا رہا۔ جب اس کے قریب کے آدمی تقریر کی تعریف کرتے۔ بیچ بیچ میں تالیاں بجنے لگتیں۔ تو اس کا دل خوشی سے متوالا ہوجاتا تھا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ حاضرین ایک ایک کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔ ان میں زیادہ وہ لوگ تھے جو ارباب نشاط کی مذمت اور ان کے نازبرداروں کی ہجو سننے کے لیے آئے تھے۔ انھیں پدم سنگھ کی یہ رواداری بے موقع معلوم ہوتی تھی۔ پبلک بٹھل داس کی معتقد تھی۔ یا منشی ابوالوفا کی۔ پدم سنگھ کی مصلحت اندیشی اسے قائل نہ کرسکتی تھی۔ وہ ندی کے اس پار رہنا چاہتی تھی۔ یا اُس پار بیچ میں رہنا اُسے منظور نہ تھا۔

(۱۴)

سدن کو تقریروں کی ایسی چاٹ پڑی ۔ کہ جہاں کہیں کسی تقریر کے ہونے کی خبر پاتا وہاں ضرور جاتا۔ دونوں طرف کی رایوں کو مہینوں تک متواتر سننے اور ان پر غور کرنے سے اس میں اپنی رائے قائم کرنے کی قابلیت پیدا ہونے لگی۔ اب وہ کسی دلیل کی جدت پر فریفتہ نہ ہوجاتا تھا۔ بلکہ ثبوتوں سے حق و باطل کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر اسے تجربہ ہونے لگا۔ کہ بیشتر تقریریں محض رنگین الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ ان میں حقیقی جوہر یا تو ہوتے ہی نہیں۔ یا وہ پُرانی باتیں نئی نئی صورتوں میں پیش کی جاتی ہیں اس میں مبصرانہ نگاہ پیدا ہوئی وہ اپنے چچا کا ہم خیال ہوگیا۔

لیکن تقاضائے عمر سے اس کی تنقیدیں نہایت تعصب آمیز اور سخت ہوتی تھیں۔ اس

میں اتنی سیر چشمی نہ تھی۔ کہ وہ مخالفین کی نیک نیتی کا قائل ہوتا۔ اسے یقین تھا۔ کہ جو حضرات اس تجویز کی مخالفت کررہے ہیں۔ وہ سبھی عیش و نشاط کے غلام ہیں۔ ان خیالوں کا اس پر اتنا اثر پڑا۔ کہ اس نے دال منڈی کی طرف جانا چھوڑدیا۔ اب وہ کسی طوائف کو پارک میں فٹن پر سیر کرتے یا ٹہلتے دیکھ لیتا۔ تو اسے ایسا غصہ آتاتھا۔ کہ جاکر اسے بھگادے۔ اس کا بس چلتا۔ تو اس وقت وہ دال منڈی کی اینٹ سے اینٹ بجادیتا۔ اس وقت ناچ کرانے اور دیکھنے والے دونوں ہی اس کی نظر میں دنیا کی ذلیل ترین مخلوق تھے۔ وہ انھیں اکیلا پاجاتا۔ تو شاید ان کے ساتھ بدتہذیبی سے پیش آتا۔ اگرچہ ابھی تک اس کے دل میں شکوک تھے۔ لیکن اس تجویز کے مفید ہونے میں اسے مطلق شبہ نہ تھا۔ اس لیے وہ ان شکوک کو مخفی رکھنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ کہ کہیں ان کو ظاہر کرنے سے اس کا پہلو کمزور نہ ہوجائے۔ سمن اب بھی اس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے دیدار کی تمنا اب بھی اسے بیتاب کرتی رہتی تھی۔ سمن کا حسن ملیح اس کی نظروں سے کبھی نہ اترتاتھا۔ ان خیالات سے بچنے کے لیے اس نے اکیلے بیٹھنا ترک کردیا۔ علی الصباح گنگا نہانے چلاجاتا۔ رات کو دس بجے تک اخبار اور کتابیں پڑھا کرتا۔ لیکن اتنی بندشوں پر بھی سمن اس کی یاد سے نہ اترتی تھی۔ وہ طرح طرح کے بھیس بدل کر اس کی نگاہِ باطن کے سامنے آتی۔ اور کبھی اسے مناتی۔ کبھی شوق سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی۔ پریم سے مسکراتی۔ دفعتاً سدن ہوشیار ہوجاتا۔ جیسے کوئی نیند سے چونکے اور ان شورش انگیز تخیلات کو ہٹاکر سوچنے لگتا۔ آج کل چچا صاحب اتنے اداس کیوں ہیں؟ کبھی ہنستے نظر نہیں آتے۔ جیتن ان کے واسطے روز دوائیں کیوں لاتا ہے۔ آخر انھیں کیا ہوگیا ہے اتنے میں سمن پھر اس کے خانۂ دل میں آجاتی اور باچشم پُر آب کہتی:"سدن تم سے ایسی امید نہ تھی۔ تم سمجھتے ہو۔ کہ یہ ایک بازاری عورت ہے۔ لیکن میں نے تمھارے ساتھ کوئی دغا نہیں کی۔ اپنا سرمایۂ الفت تمھیں سونپ دیا۔ کیا تمھاری نگاہ میں اس کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے؟ سدن پھر چونک پڑتا۔ اور پھر خیال کو ہٹانے کی کوشش کرتا۔ اس نے ایک تقریر میں سنا تھا۔ کہ انسان خود اپنی زندگی کا معمار ہے۔ وہ اپنے تئیں جیسا چاہے ویسا بناسکتا ہے۔ اس کا راز یہ ہی ہے۔ کہ گندے اور مخرب اخلاق خیالات دل میں نہ آنے پائیں۔ وہ بزور ان خیالات کو دباتا رہے۔ اور پاکیزہ خیالات سے دل کو معمور رکھے سدن اس اصول کو ایک دم کے لیے بھی فراموش

نہ کرتا تھا۔ اسی تقریر میں اس نے یہ بھی سنا تھا۔ کہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں۔ صرف پاکیزہ خیالات اور محسوسات کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ تزکیہ نفس کی سعی میں مصروف رہتا تھا۔ ہزاروں آدمیوں نے اس تقریر میں سنا تھا۔ کہ ہرایک مکروہ خیال ہماری اس زندگی ہی کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو بھی خراب کردیتا ہے۔ لیکن جو زیادہ عقیل تھے۔ وہ سن کر بھول گئے۔ سادہ دل سدن نے سنا۔ اور اسے گانٹھ میں باندھ لیا۔ جیسے کوئی غریب آدمی ایک اشرفی پاجائے۔ اور اسے جان سے زیادہ عزیز رکھے۔ آج کل سدن تہذیب نفس کی دُھن میں لگا رہتا تھا۔ راستہ میں اگر اس کی نگاہ کسی عورت پر پڑجاتی۔ تو وہ فوراً اپنے تیئں ملامت کرتا۔ اور دل کو سمجھاتا۔ کہ تو ایک لمحہ کی لطفِ دید کے لیے اپنی مستقبل کی زندگی کو خاک میں ملادیتا ہے۔ اس تنبیہ سے اس کے دل کو ایک خاص تقویت ہوتی تھی۔

ایک دن گنگا اشنان کو جاتے ہوئے سدن کو چوک میں طوائفوں کا ایک جلوس دکھائی دیا۔ شہر کی سب سے ممتاز طوائف نے عرس کیا تھا۔ یہ جلوس وہاں سے واپس آرہا تھا۔ سدن نے حسن اور آرائش اور بانکپن کی ایسی بہار کبھی نہ دیکھی تھی۔ ریشم، رنگ، اور رونق کا ایسا دلآویز نظارہ، نکھار، اور نفاست، طنازی اور رعنائی کا ایسا سرورانگیز ہنگامہ اس کے لیے بالکل انوکھا تھا۔ اس نے اپنے اوپر بہت ضبط کیا، پر بے سود۔ اس نے حسن کے ان نورانی پیکروں کو ایک بار آنکھ بھرکر دیکھا۔ جیسے کوئی طالب علم مہینوں کی ریاضت شاقہ کے بعد امتحان سے فارغ ہوکر سیر مناظر میں محو ہوجائے۔ ایک نگاہ سے اسے تسکین نہ ہوئی۔ اس نے پھر نظر ڈالی۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہیں پھر اسی طرف جم گئیں۔ گویا کسی نے انھیں زنجیر سے باندھ دیا ہو۔ وہ راستہ چلنا بھول گیا اور مدہوشی کے عالم خاموش میں نقشِ دیوار سا کھڑا رہا۔ جب جلوس گزرگیا۔ تو اسے ہوش آیا۔ چونکا۔ اور اپنے اوپر نفرین کرنے لگا۔ میں نے مہینوں کی کمائی ایک لمحہ میں گنوادی۔ اپنے نفس کو کتنا پامال کردیا۔ میں کتنا ضعیف ہوں۔ لیکن پھر اس نے اپنے تیئں سمجھایا۔ کہ محض نظارۂ حسن سے میں گناہ کا مرتکب تھوڑے ہی ہوسکتا ہوں۔ میں نے انھیں نگاہِ بد سے نہیں دیکھا۔ میرا دل فسق سے پاک تھا۔ باغبانِ قدرت کی گلکاریوں سے پاک لطف اٹھانا بھی ایک ذریعہ عبادت ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ آگے چلا۔ لیکن اس کی روح کو تسکین نہ ہوئی۔ میں اپنے ہی کو

دھوکا دینا چاہتا ہوں! یہ تسلیم کرلینے میں کیا قباحت ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہاں ہوئی اور ضرور ہوئی۔ لیکن میں اپنے دل کی موجودہ حالت کے اعتبار سے اسے معافی کے قابل سمجھتا ہوں۔ میں ولی نہیں، زاہد نہیں، سنیاسی نہیں، ایک ضعیف العقل آدمی ہوں۔ اتنا اونچا معیار پیش نگاہ رکھ کر میں اس پر عمل نہیں کرسکتا۔ آہ! حسن بھی کیا چیز ہے۔ لوگ کہتے ہیں، نفس پرستی سے چہرہ کی رونق غائب ہوجاتی ہے لیکن ان حسینوں کی نفس پرستی ان کے حسن کو اور بھی دوبالا کرتی ہے۔ چہرہ کو دل کا آئینہ کہتے ہیں، یہ بھی لغو ہے۔

سدن نے پھر دل کو سنبھالا۔ اور اسے اس طرف سے منحرف کرنے کے لیے اس معاملہ کے دوسرے پہلو پر غور کرنے لگا۔ ہاں یہ عورتیں بہت ہی حسین ہیں۔ بہت ہی نازک بدن۔ لیکن انھوں نے ان پاک نعمتوں کا کتنا بے جا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی روح کو کتنا نیچے گرادیا ہے۔ محض ان ریشمی کپڑوں کے لیے ان جگمگاتے ہوئے زیوروں کے لیے انھوں نے اپنی عصمت جیسی بے بہا جنس بیچ ڈالی ہے۔ وہ آنکھیں جن سے خلوص الفت کی شعاعیں نکلنی چاہیے تھیں۔ شوخی، شرارت، اور نفسانیت سے پُر ہورہی ہیں وہ دل جن میں خالص پاک محبت کا سرچشمہ رواں ہونا چاہیے تھا۔ کتنے متعفن اور زہریلی غلاظت سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کتنا افسوسناک نظارہ ہے!

ان نفرت انگیز خیالوں سے سدن کو کچھ تسکین ہوئی۔ وہ ٹہلتا ہوا گنگا کے کنارے پہنچا۔ اس ادھیڑبُن میں آج اسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ اس گھاٹ پر نہ گیا۔ جہاں وہ معمولاً نہایا کرتا تھا۔ وہاں بھیڑ ہوگئی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس گھاٹ پر گیا۔ جو بدھوا آشرم سے ملحق تھا۔ وہاں سناٹا رہتا تھا۔ دور ہونے کے باعث شہر کے لوگ وہاں کم جاتے تھے۔

گھاٹ کے قریب پہنچا۔ تو سدن کو گھاٹ کی طرف سے ایک عورت آتی دکھائی دی۔ فوراً پہچان گیا یہ سمن تھی۔ پر اس کی صورت کتنی متغیر ہوگئی تھی، نہ وہ لمبے لمبے سیاہ گیسو تھے، نہ وہ تن نازک، نہ وہ ہنستے ہوئے گلاب کے سے ہونٹ، نہ وہ رقیق اور مست آنکھیں، نہ وہ آرائش اور سنگار، نہ وہ مرصع زیوروں کی بہار، وہ محض ایک سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کی رفتار میں متانت تھی۔ اور بشرہ سے مایوسی اور حسرت جھلک رہی تھی۔ داستان وہی تھی۔ لیکن استعارات سے پاک ۔ اور اس لیے زیادہ سلیس اور پُرتاثیر اسے

دیکھتے ہی سدن وفورِ شوق سے کئی قدم خوب تیز چلا۔ پر اس کی یہ کایا پلٹ دیکھی۔ تو ٹھٹک گیا۔ گویا اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ گویا یہ سمن نہیں کوئی دوسری عورت ہے۔ اس کا جوشِ محبت دھیما پڑگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ یہ تغیر کیوں ہوگیا۔ اس نے پھر سمن کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف تاک رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہ میں جذبۂ شوق کے بجائے ایک بیدلی تھی۔ گویا وہ پچھلی باتوں کو یا تو بھول گئی ہے۔ یا بھولنا چاہتی ہے۔ گویا وہ دبی ہوئی آگ کو ابھارنا نہیں چاہتی۔ سدن کو ایسا گمان ہوا۔ کہ وہ مجھے خودغرض، مکار، اور بے وفا سمجھ رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ میرا گمان غلط تو نہیں ہے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پر ملتے ہی ہٹ گئیں۔ سدن کو اپنے گمان کا یقین ہوگیا۔ اور اس یقین کے ساتھ ہی اس کے دل میں غرور کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے تئیں دھتکارا ابھی ابھی میں نے اپنے دل کو اتنا سمجھایا ہے۔ اور اتنی ہی دیر میں پھر انھیں بیہودہ خیالات میں پڑگیا۔ اس نے پھر سمن کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ سر جھکائے اس کے سامنے سے نکل گئی۔ سدن نے دیکھا کہ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ لیکن وہ جگہ سے نہ ہلا۔ کسی قسم کا اشارہ نہ کیا اپنے خیال میں اس نے سمن پر ثابت کردیا کہ اگر تم مجھ سے ایک کوس بھاگوگی، تو میں تم سے سوکوس بھاگنے پر تیار ہوں۔ پر اسے یہ دھیان نہ رہا۔ کہ میں اپنی جگہ پر صورت تصویر کھڑا ہوں۔ جن جذبات کو اس نے پوشیدہ رکھنا چاہا۔ خود انھیں جذبات کی تصویر بن گیا، جب سمن کچھ دور نکل گئی۔ تو وہ لوٹ پڑا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے اپنے تئیں چھپاتا ہوا چلا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ سمن کہاں جاتی ہے عزم نے خواہشات کے سامنے سر جھکا لیا تھا۔

(۱۵)

جس دِن سے بارات لوٹ گئی۔ اسی دن سے پنڈت کرشن چندر پھر گھر سے باہر نہیں نکلے۔ افسردہ خاطر اپنے کمرہ میں بیٹھے رہتے۔ انھیں اب کسی کو اپنا منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ سمن نے انھیں دنیا کی نظروں میں چاہے کم گرایا ہو، لیکن اپنی ہی نظر میں وہ کہیں کے نہ رہے تھے۔ وہ اس رسوائی کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ وہ تین سال قید میں رہے۔ لیکن اپنی نگاہ میں اس قدر نیچے نہ گرے تھے۔ وہاں انھیں اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ یہ میری بداعمالیوں کی سزا ہے۔ لیکن اس داغِ سیاہ نے ان کے غرور کو پامال کردیا۔ وہ اب

ان رذیل آدمیوں کے پاس بھی نہ جاتے تھے۔ جن کے ساتھ بیٹھ کر گانجہ اور چرس کے دم لگایا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ میں اب ان سے بھی نیچے گرگیاہوں۔ انھیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ ساری دنیا میں میری بدنامی ہورہی ہے لوگ کہتے ہوں گے۔ کہ اس شخص کی لڑکی ...... یہ خیال آتے ہی وہ غیرت اور رنج کی اتھاہ ندی میں ڈوبنے لگتے تھے۔ ہائے اگر میں جانتا کہ سمن یوں خاندان میں داغ لگائے گی۔ تو میں نے اس کا گلا گھونٹ دیاہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ عورت تھی۔ کسی بڑے گھر میں رہنے کے قابل تھی۔ سامانِ عیش اور نمود پر جان دیتی تھی۔ لیکن میں نہ جانتا تھا کہ اس کا ضمیر اتنا کمزور ہے۔ دنیا میں ایسا کون خوش نصیب ہے۔ جس کے سب دن برابر ہوتے ہوں؟ مصیبت سبھی پر آتی ہے۔ بڑے بڑے متمول گھرانوں کی عورتیں روٹی کپڑے کو محتاج ہوجاتی ہیں۔ پر کوئی ان کے چہرہ پر شکن تک نہیں دیکھ سکتا۔ وہ رورو کر دن کاٹتی ہیں۔ یہ کیا مجال کہ کوئی ان کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ لے۔ وہ مرجاتی ہیں۔ لیکن کسی کا احسان سر پر نہیں لیتیں۔ کسی کے سامنے اپنا دکھڑا نہیں روتیں۔ وہ دیویاں ہیں۔ خاندان کے نام پر جیتی ہیں۔ اور اسی کے نام پر مرجاتی ہیں۔ پر یہ بدنصیب یہ بے غیرت...... اور اس کا شوہر کیا نالائق ہے۔ کہ اس کا سر نہیں کاٹ لیا۔ جس وقت اس نے گھر سے باہر پاؤں نکالے۔ اس نے کیوں اس کا گلا نہیں دبا دیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی بے حیا، بدکردار، نامرد آدمی ہے۔ اس میں اپنے خاندانی وقار کا لحاظ ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی۔ اسے اپنی رسوائی کی شرم نہ ہوگی پر مجھے ہے۔ اور اس کی سزا سمن کو ملے گی۔ جن ہاتھوں سے اُسے پالا، کھلایا۔انھیں ہاتھوں سے اس کی گردن پر تلوار چلاؤں گا۔ یہی آنکھیں کبھی اس کی خوش فعلیوں پر خوش ہوتی تھیں۔ اب وہ اُسے خون میں تڑپتے دیکھ کر شاد ہوں گی۔ مٹی ہوئی آبرو کو بحال کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے۔ دنیا کو معلوم ہوجائے گا۔ کہ خاندانی ننگ و ناموس پر مرنے والے بے حیائیوں کی کیا سزا دیتے ہیں!

یہ فیصلہ کرکے کرشن چندر اس مہلک ارادہ کو پورا کرنے کے وسائل پر غور کرنے لگے۔ جیل خانہ میں انھوں نے مجرموں سے قتل اور خون کے کتنے ہی منتر سیکھے تھے۔ شب و روز انھیں باتوں کے چرچے رہتے تھے۔ انھیں سب سے بہتر یہی صورت معلوم ہوئی۔ کہ چل کر اسے تلوار سے ماروں۔ اور تب خود پولیس کو اس کی اطلاع کردوں۔ مجسٹریٹ کے

روبرو میرا جو بیان ہوگا۔ اُسے سن کر لوگوں کی آنکھیں کُھل جائیں گی!

دل میں اس نشۂ خون سے مست ہوکر وہ اپنا بیان مرتب کرنے لگے۔ پہلے مہذب جماعت کی ہوس پروری کا ذکر کروں گا۔ تب پولیس کے ہتھکنڈوں کی قلعی کھولوں گا۔ اس کے بعد رسم قرارداد اور جہیز پر ایسی چوٹیں کروں گا۔ کہ سننے والے دنگ رہ جائیں گے۔ لیکن سب سے معرکۃ الآرا اظہار کا وہ حصہ ہوگا۔ جس میں ثابت کروں گا۔ کہ اپنی بے حرمتی کے حقیقی باعث ہم خود ہیں۔ ہم اپنی کم ہمتی سے جان کے ڈر سے رسوائی کے خوف سے، اولاد کی جھوٹی محبت سے، اپنی بے شرمی سے، اپنے حفظ وقار کی نااہلیت سے ایسی ناشائستگیوں کو چھپاتے ہیں۔ ان پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ سفلہ طبیعتیں اس قدر بیباک ہوگئی ہیں۔

کرشن چندر نے یہ عزم تو کرلیا۔ لیکن ابھی تک یہ نہ سوچا تھا۔ کہ شانتا کی کیا گت ہوگی۔ غیرت نے ان کے دل میں اور کسی کی فکر کے لیے جگہ ہی نہ باقی رکھی تھی۔ ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو اپنے لختِ جگر کو بسترِ مرگ پر چھوڑکر اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لیے آمادہ ہوجائے۔ جو ڈونگی پر بیٹھاہوا پانی میں ایک سانپ دیکھ اس کی طرف جھپٹے۔ اور اُسے یہ خیال نہ رہے کہ اس جھونکے سے ڈونگی ڈوب جائے گی۔

شام کا وقت تھا۔ کرشن چندر نے آج قصد خون کرلیا تھا۔ اس وقت ان کی طبیعت کچھ مضمحل تھی۔ یہ وہ افسردگی تھی۔ جو کسی خوفناک کام کرنے کے قبل دل پر مستولی ہوجاتی ہے۔ کئی دنوں تک غصہ و غم کے جنون میں رہنے کے بعد اس وقت ان کے دل پر جمود کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ جیسے ہوا کچھ دیر تک تیزی سے چلنے کے بعد دھیمی پڑجاتی ہے۔ کرشن چندر کو وہ دن یاد آرہے تھے۔ جب ان کی زندگی کلفت و کاوش سے آزاد تھی۔ جب وہ روز شام کے وقت اپنی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر سیر کو نکلتے تھے۔ کبھی سمن کو گود میں لیتے، کبھی شانتا کو۔ جب وہ گھر لوٹتے۔ تو گنگاجلی کس طرح شوقِ محبت سے مسرور ہوکر دونوں لڑکیوں کو پیار کرنے لگتی تھی۔ یاد مسرت لطف مسرت سے زیادہ دل پذیر ہوتی ہے۔ وہی جنگل اور پہاڑ جو کبھی آپ کو سنسان اور بیہڑ معلوم ہوتے تھے۔ وہی ندیاں اور جھیلیں جن کے کنارے سے آپ آنکھیں بند کیے نکل جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد نہایت دل کش اور خوش آئند صورتیں اختیار کرکے آپ کی نگاہ یاد کے سامنے آتے ہیں۔

اور پھر انھی مناظر کی سیر کی تمنا آپ کے دل میں موج زن ہوجاتی ہے۔ کرشن چندر پر ایام گزشتہ کی یاد کرتے کرتے رقت طاری ہوگئی۔ آنکھوں سے اشک جاری ہوگئے۔ افسوس! اس پُر مسرت زندگی کا ایسا غمناک انجام ہورہاہے! میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی گود کی کھیلی ہوئی لڑکی کا خون کرنے پر آمادہ ہورہا ہوں۔ دفعتاً کرشن چندر کو سمن پر رحم آیا وہ غریب نادانی سے کنوئیں میں گر پڑی ہے۔ کیا میں ایسا بے رحم ہوجاؤں کہ اوپر سے اس پر پتھر پھینکوں؟ لیکن یہ رحم ان کے دل میں دیر تک نہ قائم رہا۔ جونہی انھیں خیال آیا۔ کہ اس کا دروازہ آج سبھی کے لیے کھلا ہے۔ ہندو مسلمان آج وہاں بے تکلف داخل ہوسکتے ہیں۔ ان کا احساسِ شرم پھر تازہ ہوگیا۔ آتش غضب پھر دہک اُٹھی۔

اسی اثنا میں پنڈت اما ناتھ ان کے پاس آکر بیٹھ گئے اور بولے،''میں وکیلوں کے پاس گیا تھا۔ ان کی صلاح ہے کہ مقدمہ دائر کرنا چاہیے۔''

کرشن چندر نے چونک کر پوچھا:''کیسا مقدمہ؟''

اما ناتھ۔ انھیں لوگوں پر جو دروازہ سے بارات لوٹا لے گئے۔

کرشن چندر۔ اس سے کیا حاصل؟

اما ناتھ۔ اس سے یہ ہوگا۔ کہ یا تو وہ پھر لڑکی سے شادی کریں گے۔ یا ہرجانہ دیں گے۔

کرشن چندر۔ لیکن کیا بدنامی اور زیادہ نہ ہوگی؟

اما ناتھ۔ بدنامی جو کچھ ہونی تھی ہوچکی۔ اب کس بات کا ڈر۔ میں نے ایک ہزار روپے تلک میں دیے۔ چار پانچ سو روپے تواضع و تکریم میں خرچ کیے۔ یہ سب کیوں چھوڑدوں؟ یہی روپے کسی اچھے کُل کے آدمی کو دے دوں گا۔ تو وہ خوشی سے شادی کرنے پر تیار ہوجائے گا۔ ذرا ان روشن خیال حضرات کی قلعی تو کھلے۔

کرشن چندر نے لمبی سانس بھر کر کہا، ''پہلے مجھے زہر دے دو۔ تب یہ مقدمہ دائر کرو۔''

اما ناتھ نے چڑ کر کہا،''آپ کیوں اتنا ڈرتے ہیں؟''

کرشن چندر۔ تم نے مقدمہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیاہے؟

اما ناتھ۔ ہاں میں نے پورا ارادہ کرلیا ہے۔ کل سارے شہر کے بڑے بڑے وکیل بیرسٹر جمع تھے۔ یہ مقدمہ اپنے ڈھنگ کا نرالا ہے۔ ان لوگوں نے بہت کچھ دیکھ بھال کر یہ مشورہ دیاہے۔ دو وکیلوں کو بیعانہ تک دے آیاہوں۔

کرشن چندر نے مایوسانہ انداز سے کہا، "اچھی بات ہے۔ دائر کردو"۔

اما ناتھ۔ آپ کو اس کا اس قدر ملال کیوں ہے؟

کرشن چندر۔ جب تم خود ہی نہیں سمجھتے۔ تو میں کیا بتاؤں۔ جو بات ابھی تک صرف قرب و جوار کے موضعوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ سارے شہر میں پھیل جائے گی۔ سمن ضرور ہی اجلاس پر بلائی جائے گی۔ میرا نام گلی گلی بکے گا۔

اما ناتھ۔ اب اس سے کہاں تک ڈروں؟ مجھے بھی تو اپنی دونوں لڑکیوں کی شادیاں کرنی ہیں یہ کلنک اپنے ماتھے پر لگارہنے دوں تو ان کی شادی میں رخنہ نہ پیدا ہوگا؟

کرشن چندر۔ تو یہ مقدمہ تم اس لیے دائر کررہے ہو۔ جس میں تمھارے نام پر کوئی داغ نہ رہے؟

اما ناتھ نے پُرغرور لہجہ میں کہا، "ہاں! اگر آپ اس کے یہ معنے نکالتے ہیں۔ تو یہی سہی۔ بارات میرے ہی دروازہ سے لوٹی ہے۔ لوگوں کو یہ گمان ہورہاہے۔ کہ سمن میری ہی لڑکی ہے۔ سارے شہر میں مجھی پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ میرا دعویٰ دس ہزار کا ہوگا۔ اگر پانچ ہزار کی بھی ڈگری ہوگئی۔ تو شانتا کی شادی کسی اچھے خاندان میں ہوجائے گی۔ آپ جانتے ہیں۔ جھوٹی چیز کھانے کے لیے مٹھاس کی ضرورت ہے جب تک روپیوں کی گٹھری نہ دی جائے گی۔ شانتا کی شادی کیوں کر ہوگی! ایک طرح میرے خاندان میں داغ لگ گیا۔ پہلے جو لوگ مجھ سے ناتا کرنے میں اپنا فخر سمجھتے تھے۔ وہ اب لمبی تھیلی کے بغیر سیدھے منہ بات بھی نہ کریں گے۔ معاملہ کی یہ صورت ہے۔ مجھے روپیوں کی بے حد ضرورت ہے اور اتنے روپیوں کے ہاتھ آنے کی دوسری کوئی تدبیر نہیں ہے۔

کرشن چندر۔ اچھی بات ہے۔ مقدمہ دائر کردو۔

اما ناتھ چلے گئے۔ تو کرشن چندر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، یا ایشور! اب مجھے اٹھا لو، یہ ذلت نہیں سہی جاتی۔ آج انھیں اپنی بے ناموسی کا حقیقی احساس ہوا۔ انھیں معلوم ہوا۔ کہ سمن کے خون سے یہ داغ نہیں مٹ سکتا۔ اسی طرح جیسے سانپ کو مارنے سے اس کا زہر نہیں اترتا۔ اس کا خون کرنے میں رسوائی کے سوا اور کیا ہوگا؟ پولیس گرفتار کرے گی۔ مہینوں ادھر اُدھر مارامارا پھروں گا۔ اور اتنی ذلت و خواری کے بعد پھانسی پر چڑھادیا جاؤں گا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ڈوب مروں۔ اس چراغ کو گل کردوں جس

کی روشنی میں یہ خوفناک مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ہائے بدنصیب سمن، بے چاری شانتا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبی۔ اس کی زندگی تباہ کردی۔ ایشور اب تمھیں اس کا نباہ کرسکتے ہو۔ اب اس غریب لڑکی کا تمھارے سوا اور کوئی دستگیر نہیں۔ صرف مجھے یہاں سے اُٹھالے چلو کہ ان آنکھوں سے اس کی مصیبت نہ دیکھوں!

تھوڑی دیر میں شانتا کرشن چندر کو کھانا کھانے کے لیے بلانے آئی۔ شادی کے دن سے آج تک کرشن چندر نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت انھوں نے اسے دردناک نظروں سے دیکھا۔ دھندلے چراغ کی طرح روشنی میں انھیں اس کے چہرہ پر ایک غیرفطری شگفتگی نظر آئی۔ اس کی آنکھیں پاکیزہ روحانیت سے لبریز تھیں۔ رنج و غم کی جھلک تک نہ تھی۔ جب سے اس نے سدن کو دیکھا تھا، اسے اپنے دل میں ایک مسرت انگیز تقویت کا احساس ہوتا تھا۔ اس میں خودداری کی ایک شان پیدا ہوگئی تھی۔ اپنی ممانی سے پہلے وہ سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی۔ پر آج کل گھنٹوں بیٹھے اس کے پیر دبایا کرتی۔ اپنی ممیری بہنوں سے اب اسے ذرا بھی حسد یا رشک نہ تھا۔ وہ اب ہنس ہنس کر کنوئیں سے پانی نکالتی۔ چکی پینے میں اُسے سچی خوشی ہوتی تھی۔ اس کی زندگی میں محبت کی گلکاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ سدن اسے نہ ملا۔ پر سدن سے بدرجہا بہتر چیز مل گئی یہ سدن کی محبت تھی۔

کرشن چندر شانتا کی بشاشت پر متحیر ہی نہیں خائف ہوگئے۔ انھیں گمان ہوا۔ کہ اس درد جاں گداز نے خوفناک صورت اختیار کی ہے اس کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھ کر بولے،: ''شانتا''؟

شانتا نے اُن کی طرف پُرسوال آنکھوں سے دیکھا۔

کرشن چندر کا گلا بھرآیا۔ بولے،''آج چار سال سے میری زندگی کی کشتی بھنور میں پڑی ہوئی ہے۔ اس حالت میں بھی مجھے امید تھی کہ شاید کبھی کنارے پر پہنچ جاؤں۔ لیکن اب اپنی اولاد کی مصیبتیں نہیں دیکھی جاتیں۔ میں اس کشتی سے اب لہروں میں کودتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب میری ہی ناعاقبت اندیشیوں کے نتیجے ہیں۔ اگر میں پہلے سے ہوشیار ہوجاتا تو آج تم لوگوں کی یہ حالت نہ ہوتی۔ پر اب پچھتانے سے کیا فائدہ! اگر کبھی ابھاگنی سمن سے تمھاری ملاقات ہوجائے تو کہہ دینا کہ میں نے اسے معاف کیا۔ اس نے جو

کچھ کیا اس کا الزام میری گردن پر ہے۔ آج سے دو دن قبل تک میں اسے قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ پر ایشور نے مجھے اس گناہ سے بچالیا۔ اس سے کہہ دینا کہ وہ اپنے کوتہ نصیب باپ اور ماں پر رحم کرے۔“

یہ کہتے کہتے کرشن چندر رک گئے۔ شانتا خاموش کھڑی تھی۔ اسے اپنے باپ کی حالت پر درد آتا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد کرشن چندر پھر بولے،”بیٹی میں تم سے ایک التجا کرتا ہوں۔“

شانتا۔ کہیے کیا حکم ہے؟

کرشن چندر۔ یہی کہ صبر کو مت چھوڑو۔ یہ منتر بُرے سے بُرے وقت پر بھی تمھیں سنبھالتا رہے گا۔

شانتا تاڑ گئی کہ یہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ مگر لحاظ کے باعث نہ کہہ سکے۔ نہ ان کے دل کی بات اس سے چھپی نہ رہی۔ اس نے متکبرانہ انداز سے سر اُٹھا لیا۔ اور پُرغرور نظروں سے کرشن چندر کی طرف دیکھا۔ اس کی اس اعتقاد انگیز نگاہ نے وہ سب کچھ اور اس سے بہت زیادہ کہہ دیا جو وہ اپنی زبان سے کہہ سکتی۔

(۱۶)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ کرشن چندر گھر سے باہر نکلے۔ ناظورۂ قدرت کسی ضعیفہ کی طرح کہرے کی موٹی چادر اوڑھے چپ چاپ پڑی تھی۔ آسمان میں چاند منہ چھپائے ہوئے تیزی سے دوڑا چلا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہاں!

کرشن چندر کے دل میں ایک بیتابانہ اشتیاق پیدا ہوا شانتا کو کیوں کر دیکھوں! دنیا میں یہی ایک چیز ان کے اچھے دنوں کی یادگار باقی رہ گئی تھی۔ مایوسی کی گہری تاریکی میں بھی ایک روشنی کی جھلک انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک دروازہ پر خاموش کھڑے رہے۔ اور تب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آگے بڑھے انھیں ایسا معلوم ہوا گویا گنگا جلی آسمان پر بیٹھی ہوئی مجھے بلا رہی ہے۔

کرشن چندر کے دل میں اس وقت کوئی خواہش، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ دنیا سے ان کی طبیعت بیزار ہوگئی تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح جلد گنگا کے کنارے پہنچوں۔ اور اس کی لہروں میں روپوش ہوجاؤں۔ انھیں خوف ہوتا تھا۔ کہ کہیں دیر ہونے

سے میری ہمت ٹوٹ نہ جائے۔ انھوں نے اپنے عزم کو مشتعل کرنے کے لیے دوڑنا شروع کیا۔

لیکن تھوڑی ہی دور چل کر وہ پھر ٹھٹک گئے۔ اور سوچنے لگے۔ پانی میں کودپڑنا کچھ بہت مشکل تو نہیں۔ جہاں زمین سے پیر اکھڑے کام تمام ہوا۔ اس خیال سے ان کا دل کانپ اٹھا۔ دفعتاً ان کے دھیان میں آیا کہ کہیں بھاگ کیوں نہ جاؤں؟ جب یہاں رہوں گا ہی نہیں تو زبان خلق سے مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ لیکن اس خیال کو انھوں نے اپنے دل میں ٹھہرنے نہ دیا۔ ہوس دنیا کی یہ دام افگنی انھیں دھوکا نہ دے سکی۔

اگرچہ کرشن چندر کا میلان مذہبی عقائد کی جانب نہ تھا۔ اور نادیدہ کے ایک موہوم خوف سے ان کا دل کانپ رہاتھا۔ لیکن اپنے ارادہ کو مستقل رکھنے کے لیے وہ اپنے تئیں یقین دلا رہے تھے کہ پرماتما بڑا رحیم اور غفور ہے۔ ان کے باطن پر پردہ سا پڑگیا تھا۔ ان کے نفس کی حالت اس لڑکے کی سی تھی۔ جو اپنے کسی ہمجولی کے کھلونے توڑ ڈالنے کے بعد اپنے ہی گھر میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔

کرشن چندر اسی طرح قدم بڑھاتے ہوئے چار میل تک چلے گئے۔ جوں جوں گنگا قریب آتی تھی۔ ان کے دل کی حرکت بڑھتی جاتی تھی۔ خوف سے حواس پریشان ہوئے جاتے تھے۔ لیکن وہ اس ضعف قلب کو کچھ تو اپنی سرعتِ گام اور کچھ ملامت اور تحقیر سے دور کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ آہ! میں کتنا بے شرم، بے غیرت ہوں؟ دردشا ہونے پر بھی موت سے ڈرتا ہوں۔ دفعتاً ان کے کانوں میں گانے کی آواز آئی۔جوں جوں وہ آگے بڑھتے تھے۔ وہ آواز قریب ہوتی جاتی تھی۔ گانے والا انھیں کی طرف چلا آتاتھا۔ اس خاموشی میں کرشن چندر کو وہ صدا بہت سریلی معلوم ہوئی کان لگا کر سننے لگے۔ اگرچہ نغمہ دلکش نہ تھا۔ لیکن اصولِ فن کے مطابق تھا۔ اس لیے کرشن چندر کو بہت لطف حاصل ہوا۔ اس فن میں انھیں اچھا ذوق تھا۔ اس نغمہ سے ان کے قلب مضطر کو گونہ تسکین ہوئی۔

گانا بند ہوگیا۔ اور ایک لمحہ کے بعد کرشن چندر نے ایک دراز قد، جٹا دھاری سادھو کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ سادھو ۔نے ان کا نام اور مقام پوچھا۔ اور تب مؤدبانہ انداز سے بولا،"اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں۔"

کرشن چندر۔ کچھ ایسا ہی کام آپڑا ہے۔
سادھو۔ آدھی رات کو، آپ کا گنگا کنارے کیا کام ہو سکتا ہے؟

کرشن چندر نے ترشی سے جواب دیا، ”آپ تو روشن ضمیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

سادھو ۔ میں روشن ضمیر نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے سادھو ہونے کا دعویٰ ہے۔ میں محض ایک بھکاری برہمن ہوں۔ لیکن اس وقت میں آپ کو اس طرف نہ جانے دوں گا۔

کرشن چندر۔ تم اپنی راہ جاؤ۔ میرا راستہ روکنے کا تمھیں کوئی حق نہیں ہے۔

سادھو ۔ حق نہ ہوتا۔ تو میں آپ کو روکتا کیوں کر۔ آپ مجھے جانتے نہیں ہیں۔ لیکن میں آپ کا دھرم پُتر ہوں۔ میرا نام گجادھرپانڈے ہے۔

کرشن چندر۔ اچھا آپ پنڈت گجادھر پرشاد ہیں۔ آپ نے یہ بھیس کب سے اختیار کیا۔ آپ سے ملنے کی مجھے بہت خواہش تھی۔ مجھے آپ سے بہت باتیں پوچھنی ہیں۔

سادھو۔ میرا ڈیرا اس وقت گنگا کے کنارے ایک درخت کے نیچے ہے۔ چلیے وہاں تھوڑی دیر آرام کیجیے۔ میں سارا واقعہ آپ سے بیان کروں گا۔

راستہ میں دونوں آدمیوں میں کچھ گفتگو نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر میں وہ لوگ اس درخت کے نیچے آپہنچے ۔ وہاں ایک موٹا سا کنڈا جل رہا تھا۔ زمین پر پیال بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر ایک مرگ چھالا۔ ایک کمنڈل اور کتابوں کا ایک بستہ رکھا ہوا تھا۔

کرشن چندر نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے پوچھا، ”آپ اب سادھو ہوگئے ہیں۔ سچ کہیے گا۔ سمن کی یہ حالت کیوں ہوگئی؟“

گجانند آگ کی روشنی میں کرشن چندر کے چہرہ کو مبصرانہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں ان کے چہرہ پر ان کے دل کی ساری کیفیت جلی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ اب گجادھر پنڈت نہ تھے۔ فقیروں کی صحبت اور مشق و ریاضت نے ان کے باطن کو روشن کردیا تھا۔ اب وہ اس واقعہ پر جتنا ہی غور کرتے تھے اتنا ہی افسوس ہوتا تھا۔ سمن سے اب انھیں ہمدردی ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی ان کا جی چاہتا تھا کہ چل کر سمن سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں۔ کرشن چندر سے بولے،”اس کا سبب میری حماقت تھی۔ یہ میری ہی بے رحمی اور وحشیانہ برتاؤ کا نتیجہ تھا۔ وہ عورت دل کی رانی تھی۔ وہ اس قابل تھی، کہ کسی

بڑے گھر کی مالکن بنتی۔ مجھ جیسا کمینہ، پست ہمت اور ناشناس آدمی اس کے قابل نہ تھا۔اس وقت میری موٹی نگاہیں اس کی ذاتی خوبیوں کو نہ دیکھ سکتی تھیں ایسی کوئی تکلیف نہ تھی جو اس غریب کو میرے ساتھ نہ اٹھانی پڑی ہو۔ پروہ کبھی آزردہ خاطر نہیں ہوئی۔ وہ میری عزت کرتی تھی۔ لیکن اس کا یہ برتاؤ دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ساتھ دغا کررہی ہے۔ اس کی قناعت، اس کی متانت، اس کی وفاداری میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا وہ مجھ سے کوئی چال چل رہی ہے۔ اگر وہ ذرا ذراسی باتوں کے لیے مجھ سے جھگڑے کرتی، روتی، کوستی، طعنے دیتی۔ تو شاید مجھے اس پر زیادہ اعتبار ہوتا۔ اس کی بلند نظری ہی میری بدگمانی کا سبب تھی۔ میں اس کی عصمت پر شبہ کرنے لگا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن صرف رات کو ایک سہیلی کے گھر پردیر ہوجانے کے باعث میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔"

کرشن چندر نے قطع کلام کیا۔"تمھاری عقل اس وقت کہاں گئی تھی؟ تمھیں ذرا بھی خیال نہ رہا کہ تم ان سخت گیریوں سے کتنے بڑے خاندان کی تباہی کے سامان کررہے ہو؟

گجانند۔ مہاراج اب کیاعرض کروں کہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں نے پھر اس کی خبر نہ لی۔ پرمیں قسم کھاسکتا ہوں۔ اس کا دل صاف تھا۔ اب وہ بدھوا آشرم میں رہتی ہے اور وہاں سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ سب اس کی نیکی اور شرافت کے مداح ہیں۔

گجانند کی باتیں سُن کر کرشن چندر کا دل سمن کی طرف سے نرم پڑگیا۔ لیکن جیسے پانی کی دھار ایک طرف رک کر دوسری طرف بہنے لگتی ہے۔ اسی طرح ان کا غصہ سمن کی جانب سے پھرکر گجانند کی جانب مائل ہوا۔ وہ انھیں غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر بولے،"گجادھر تم نے میرے خاندان کو ڈبودیا تم نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا۔ تم نے میری لڑکی کی جان لی۔ اسے تباہ کردیا۔ اِس پر بھی تم میرے سامنے اس طرح شان سے بیٹھے ہو۔ گویا کوئی مہاتما ہو۔ تمھیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔"

گجانند زمین کی مٹی کُھرچ رہے تھے۔ سر نہ اُٹھایا۔ کرشن چندر نے پھر کہا،"تم غریب تھے۔ اس میں تمھاری کوئی خطا نہ تھی۔ تم اگر اپنی بیوی کی مناسب طریق سے داشت نہ کرسکتے تھے۔ تو اس کا الزام تمھارے سر پر نہیں۔ تم اس کے دل کی کیفیتوں کو نہ جان سکے۔ اس کے حسن سلوک کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس کے لیے میں تمھیں خطاوار نہیں

ٹھہراتا۔ تمھاری خطا یہ ہے کہ تم نے اسے گھر سے نکال کیوں دیا؟ تم نے اسے مار کیوں نہیں ڈالا؟ اگر تمھیں اس کی عصمت پر شبہ تھا۔ تو تم نے اس کا سر کیوں نہیں کاٹ لیا؟ اور اگر اتنی جرأت نہ تھی تو خودکشی کیوں نہ کرلی؟ زہر کیوں نہ کھالیا؟ اگر تم نے اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا ہوتا۔ تو اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی۔ میرے خاندان میں وہ داغ نہ لگتا جو لگا۔ تم بھی کہو گے کہ میں مرد ہوں! تمھاری اس کم ہمتی پر۔ اس بے شرمی پر تف ہے۔ جو انسان اتنا بے غیرت ہے۔ کہ اپنی بیوی کی بے عصمتی پر اس کے خون میں جوش نہیں آجاتا، وہ حیوانوں سے بھی گیا گزرا ہے۔

گجانند کو اب معلوم ہوا کہ سمن کو بے خطا ثابت کرنے کی دھن میں، خود ایک دلدل میں آپھنسا۔ وہ پچھتانے لگے کہ فیاضی کے جوش میں، میں اتنا بہک کیوں گیا، وہ اپنے خیال میں اس سخت طعن اور تشنیع کے سزاوار نہ تھے۔ چوٹ کھایا ہوا دل ایسی ملامت چاہتا ہے جس میں ہمدردی اور غم گساری ہو۔ وہ نہیں جس میں ذلت اور خشونت ہو۔ پکا ہوا پھوڑا نشتر کا زخم چاہتا ہے۔ پتھر کی چوٹ نہیں۔ گجانند اپنی ندامت پر پچھتائے۔ ان کا دل پھر سمن کو خطاوار ثابت کرنے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔

دفعتاً کرشن چندر نے گرج کر کہا، "کیوں تم نے اسے مار کیوں نہیں ڈالا؟"

گجانند نے تحمل سے جواب دیا۔ "میرا دل اتنا سخت نہیں تھا۔"

کرشن چندر۔ تو اسے گھر سے کیوں نکال دیا؟

گجانند۔ محض اس لیے کہ اس وقت مجھے اس سے اپنا گلا چھڑانے کی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔

کرشن چندر نے منہ چڑھاکر کہا، "کیوں زہر تو کھا سکتے تھے۔"

گجانند اس زخم سے تڑپ گئے بولے، "جان دینا بے سود تھا؟"

کرشن چندر۔ بے سود زندگی سے بے سود موت بہتر ہوتی ہے۔

گجانند۔ آپ میری زندگی کو بے سود نہیں کہہ سکتے۔

کرشن چندر۔ کیا اسی لیے کہ تم یہ سوانگ بنائے پھرتے ہو؟

گجانند۔ جی نہیں۔ اس لیے کہ میری زندگی سے دوسروں کو کچھ نہ کچھ نفع ضرور پہنچا ہے۔ آپ سے پنڈت اما ناتھ نے کہا نہ ہوگا۔ کہ میں نے اسی طرح بھیک مانگ کر شانتا کی شادی کے لیے پندرہ سو روپیہ دیے تھے۔ اور اس وقت بھی انھیں کے پاس ایک

ہزار روپیہ لیے جارہا تھا۔

یہ کہتے کہتے گجانند خاموش ہوگئے۔ انھیں خیال آگیا۔ کہ اس امر کا ذکر کرنا میری کم ظرفی ہے۔ شرم سے سر جھکا لیا۔

کرشن چندر نے مشتبہ انداز سے کہا، ''انھوں نے اس کے متعلق مجھ سے کچھ نہیں کہا۔''

گجانند۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو وہ آپ سے کہتے۔ میری زبان سے بھی یہ بات سہواً نکل گئی معاف کیجیے میری منشا صرف یہ ہے کہ اپنی جان دے کر میں دنیا کو کوئی فائدہ نہ پہنچاسکتا تھا۔ اس داغ نے مجھے اپنی زندگی کی اصلاح پر مائل کیا ہے۔ ضمیر خفتہ کو بیدار کرنے کے لیے ہماری غلطیاں ایک قسم کی نداء غیب ہیں۔ جو ہمیں ہمیشہ کے لیے ہوشیار کردیتی ہیں۔ تعلیم، صحبت، تلقین، کسی کا بھی ہمارے اوپر وہ نیک اثر نہیں پڑتا۔ جو اپنی غلطیوں کے بُرے نتائج سے پڑتا ہے۔ ممکن ہے۔ آپ اسے میری بے غیرتی سمجھ رہے ہوں لیکن وہی بے غیرتی میرے سکونِ قلب اور عمل خیر کی تحریک کا ایک وسیلہ بن گئی ہے۔ ایک عورت کی زندگی تباہ کرکے آج میں صدہا بدنصیب کنواری لڑکیوں کی ناؤ پار لگانے کے قابل ہوگیا ہوں اور مجھے دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ کہ یہی تحریک نیک سمن پر بھی اثر ڈال رہی ہے۔ میں نے اپنی کٹی میں بیٹھے ہوئے۔ اسے گنگا اشنان کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اس کے خلوص ارادت پر متحیر ہوگیا ہوں۔ اس کے چہرہ پر صفائی باطن کی روشنی نظر آتی ہے۔ وہ اگر پہلے خانہ داری میں ہوشیار تھی۔ تو اب وہ حسن باطن سے آراستہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دن طبقۂ اناث کا زیور بنے گی۔

کرشن چندر نے پہلے تو ان باتوں کو اس طرح سنا جیسے ہشیار گاہک کسی سوداگر کی پُراصرار خوش کلامیوں کو سنتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں بھولتا کہ سوداگر مجھ سے اپنے مطلب کی باتیں کررہا ہے لیکن رفتہ رفتہ کرشن چندر پر اس تقریر کا اثر پڑنے لگا۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ میں نے اپنی درشت کلامیوں سے اس شخص کا دل دکھایا ہے۔ جو اپنی حرکت پر نادم ہے اور جس کے احسانوں کے بوجھ سے میں دبا ہوا ہوں۔ میں کیسا احسان فراموش ہوں! یہ یاد کرکے ان کی آنکھیں بھر آئیں صاف دل آدمی موم بتی کی طرح جتنی جلد سخت ہوجاتا ہے اتنی ہی جلدی پگھل بھی جاتا ہے۔

گجانند نے ان کے چہرہ کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا، "اس وقت آپ اگر ایک فقیر کے مہمان بن جائیں تو کیسا ہو؟ صبح آپ جہاں کہیں گے میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اس کمبل میں آپ کو جاڑا نہ لگے گا۔"

کرشن چندر نے ملائمت سے کہا۔ "کمبل کی ضرورت نہیں، لیٹ رہوں گا۔"

گجانند۔ آپ سمجھتے ہیں کمبل اوڑھنے سے آپ گنہگار ہوجائیں گے۔ لیکن یہ کمبل میرا نہیں ہے میں نے اسے مہمانوں ہی کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔

کرشن چندر نے زیادہ انکار نہ کیا۔ انھیں سردی لگ رہی تھی۔ کمبل اوڑھ کر لیٹے اور فوراً نیند آگئی۔ لیکن سکون انگیز نیند نہیں۔ ان کے دردِ دل کا محض ایک مرقع تھی۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ میں جیل خانہ میں بسترِ مرگ پر پڑا ہواہوں۔ اور جیل کا داروغہ میری طرف نگاہِ نفرت سے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔ تمھاری رہائی ابھی نہیں ہوسکتی ۔ اتنے میں گنگاجلی اور میرے والد دونوں آکر چارپائی کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہرہ مسخ اور سیاہ تھے۔ گنگاجلی نے رو کر کہا، تمھارے ہی باعث میری یہ حالت ہورہی ہے۔ والد نے غضبناک لہجہ میں کہا، کیا تمھاری روسیاہی ہماری زندگی کا انعام ہوگی؟ اسی لیے ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا؟ اب یہ سیاہی کبھی ہمارے چہرہ سے دور نہ ہوگی ہم ہمیشہ یہ عذاب جھیلتے رہیں گے۔ تو نے محض چار دن کی زندگی کے لیے ہمیں اس عذاب میں مبتلا کرر کھا ہے۔ پر ہم ابھی تیری زندگی کا خاتمہ کیے دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک کلہاڑا لیے ہوئے میری طرف جھپٹے۔

کرشن چندر کی آنکھیں کُھل گئیں۔ ان کی چھاتی دھڑک رہی تھی۔ سوتے وقت وہ بھول گئے تھے کہ میں گھر سے کس کام کو چلا تھا۔ اس خواب نے اس کی یاد دلادی۔ انھوں نے اپنے تیئں نفریں کی۔ انھیں یقین ہوا۔ کہ یہ محض خواب نہیں صدائے غیب ہے۔ گجانند کی تالیف کا اثر رفتہ رفتہ ان کے دل سے مٹنے لگا۔ سمن اب چاہے عصمت کی دیوی ہوجائے۔ پراس سے وہ داغ سیاہ تو نہ مٹے گا جو اس نے ہمارے چہرہ پر لگا دیا ہے۔ یہ مہاتما کہتے ہیں۔ گناہ سے انسان کی اصلاح ہوجاتی ہے مجھے تو یہ بالکل انوکھی بات معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بھی تو گناہ کیے ہیں۔ پر مجھے گناہ کے اس مصلحانہ اثر کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ کچھ نہیں۔ یہ سب ان کی لسانی ہے۔ انھوں نے اپنی بے غیرتی کو چھپانے کے لیے یہ لفاظی کی

ہے۔ یہ بالکل لغو خیال ہے گناہ سے گناہ ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر گناہ سے ثواب ہوتا تو آج دنیا میں کوئی گنہگار باقی نہ رہتا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھے۔ گجانند بھی الاؤ کے قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ کرشن چندر چپکے سے اٹھے اور گنگا کنارے چلے۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اس درد کا خاتمہ ہی کر کے چھوڑوں گا۔

چاند غروب ہوچکا تھا۔ کہرا اور بھی گھنا ہوگیا تھا۔ تاریکی نے کوہ و شجر اور ساحل ودریا میں کوئی تمیز نہ رکھی تھی۔ کرشن چندر ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ لیکن نگاہ کی بہ نسبت قیاس سے زیادہ کام لینا پڑتا تھا۔ سنگ ریزوں اور جھاڑیوں سے بچنے میں وہ ایسے محو تھے کہ اپنی حالت کا دھیان نہ تھا۔

کرار کے کنارے پر پہنچ کر انھیں کچھ روشنی نظر آئی۔ وہ نیچے اترے گنگا کسی مریض کی طرح کہرے کی چادر اوڑھے کراہ رہی تھی۔ آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا۔ یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی اداسی چھائی ہوئی تھی جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھاجاتی ہے۔

کرشن چندر ندی کے کنارے کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے سوچا۔ ہائے! اب میری موت کتنی قریب ہے۔ ایک لمحہ میں یہ جان نہ جانے کہاں چلی جائے گی! وہاں نہ جانے اس کی کیا گت ہوگی! آج دنیا سے ناتا ٹوٹتا ہے! ایشور! اب مجھ پر رحم کرو۔ مجھے سنبھالو!

اس کے بعد ایک لمحہ تک انھوں نے اپنے دل کو خوب مستحکم کیا۔ انھیں یقین ہوگیا کہ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ وہ پانی میں گھسے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ کرشن چندر کا ایک ایک عضو شل ہوگیا وہ اس کی پرواہ نہ کرکے آگے بڑھتے چلے گئے۔ گردن تک پانی میں پہنچ کر انھوں نے ایک بار پھر مسلط تاریکی پر نگاہ ڈالی۔ یہ رشتہ دنیا کی آخری لڑی تھی۔ یہ استقلال، خلوص و غیرت کی آخری آزمائش تھی۔ اب تک انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ محض اسی امتحان کی تیاری تھی۔ ارادہ اور ہوس کا یہ آخری معرکہ تھا۔ ہوس نے پوری طاقت سے انھیں اپنی طرف کھینچا۔ سمن سنیاسی بنی ہوئی سامنے آئی۔ شانتا حسرت و غم میں ڈوبی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی ابھی کیا بگڑا ہے؟ کیوں نہ سادھوں ہوجاؤں میں ایسا کون نامور آدمی ہوں کہ دنیا میرے نام اور ناموس کا چرچا کرے گی؟ ایسی نہ جانے کتنی لڑکیاں روز نفس کے پنجہ میں پھنسا کرتی ہیں۔ دنیا کس کی پروا کرتی ہے۔ میں نادان ہوں۔ جو یہ

سوچتا ہوں کہ دنیا میری ہنسی اڑائے گی۔ ارادہ نے کتنا ہی زور لگایا کہ اس دلیل کی تردید کرے۔ پر کامیاب نہ ہوئی۔ صرف ایک ڈبکی کی کسر تھی۔ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا! پیچھے کا قدم کتنا زود عمل آگے کا قدم کتنا مشکل تھا! کتنا خوفناک!

کرشن چندر نے پیچھے لوٹنے کو پیر اٹھائے۔ ہوس نے اپنی قوت کا اعجاز دکھادیا۔ مگر فی الواقع یہ محبت دنیا نہیں تھی۔ یہ خوف غائب تھا!

اس وقت کرشن چندر کو معلوم ہوا کہ اب پیچھے نہیں پھر سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ خود بخود آگے کھسکتے جاتے تھے۔ وہ زور سے چیخ اٹھے۔ اپنے ٹھٹھرے ہوئے پیروں کو پیچھے ہٹانے کی انتہائی کوشش کی مگر نوشتۂ تقدیر! وہ آگے ہی کھسکتے گئے۔

دفعتاً ان کے کانوں میں گجانند کے پکارنے کی آواز آئی۔ کرشن چندر نے چلاکر جواب دیا،"لیکن منہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی۔ کہ ہوا سے بجھ کر تاریکی میں ڈوب جانے والے چراغ کی طرح لہروں میں غرق ہوگئے۔ غیرت، غم اور درد سے جلتے ہوئے دل کی آگ ٹھنڈے پانی میں بجھ گئی۔

گجانند دیر تک کنارے کھڑے رہے۔ وہی الفاظ چاروں طرف سے ان کے کانوں میں آتے تھے پاس کی پہاڑیوں اور سامنے کی لہروں اور چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی سے انھیں الفاظ کی بازگشت صدائیں آرہی تھیں۔

(۱۷)

علی الصباح امولا میں اس سانحہ کی خبر پھیل گئی۔ لیکن چند اِنے گِنے آدمیوں کے سوا کوئی بھی اما ناتھ سے تعزیت کرنے نہ آیا۔ اگر قدرتی موت ہوتی تو غالباً ان کے دشمن بھی آکر چار آنسو بہا جاتے لیکن خودکشی ایک خوفناک شے ہے اس موقع پر دوست بھی دشمن ہوگئے۔

گجانند نے اما ناتھ سے جس وقت یہ حال کہا وہ کنوئیں پر نہارہے تھے۔ انھیں ذرا بھی رنج یا حیرت نہ ہوئی۔ اس کے برعکس انھیں کرشن چندر پر غصہ آیا۔ پولیس کی مداخلت کے خوف نے غم کو پسِ پشت ڈال دیا۔ انھیں اس دن اشنان دھیان میں بہت دیر لگی۔ طبع فکر مند کو اپنے ماحول پر غور کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ اسے احساس وقت نہیں رہتا۔

جانھوی نے کہرام مچانا شروع کیا۔ اسے روتے دیکھ کر اس کی دونوں بیٹیاں بھی

رونے لگیں۔ ہمسایہ کی مستورات فرض تشفی ادا کرنے کے لیے جمع ہوگئیں۔ انھیں پولیس کا خوف نہ تھا۔ لیکن یہ شور ماتم جلد ہی بند ہوگیا۔ کرشن چندر کے عیب و ہنر کی تنقید ہونے لگی۔ اتفاق رائے نے فیصلہ کیا کہ ان کی خوبیوں کا پہلو نقائص پر غالب تھا۔ دوپہر کو جب اما ناتھ گھر میں شربت پینے آئے اور کرشن چندر کے متعلق چند ناسزاوار باتیں کیں۔ تو جانھوی نے ان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا، ”کیسی چھوٹی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔“ اما ناتھ شرمندہ ہوگئے۔

جانھوی اپنے سرورِ قلب کا لُطف تنہا اُٹھا رہی تھی۔ اس کیفیت کو وہ اتنا رکیک اور شرمناک سمجھتی تھی کہ اما ناتھ سے بھی اسے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ سچا غم شانتا کے سوا اور کسی کو نہ ہوا۔ اگرچہ اپنے باپ کو وہ دوسرے کا دست نگر سمجھتی تھی۔ تاہم دنیا میں اس کی زندگی کا ایک سہارا موجود تھا۔ اپنے باپ کی خستہ حالی ہی اس کی پدرپرستی کا باعث تھی۔ اب وہ دنیا میں یکہ و تنہا رہ گئی۔ لیکن اس صدمۂ یاس نے اس کے نیک ارادوں کو مغلوب نہ کیا۔ اس کا دل اور بھی دردمند ہوگیا۔ آج سے شانتا تحمل اور ضبط کا مجسمہ بن گئی۔ برسات کی آخری بوندوں کی طرح انسان کی آخری نصیحتیں بیکار نہیں جاتیں۔ شانتا اب منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالتی جس سے اس کے باپ کی روح کو تکلیف ہو۔ ان کی زندگی میں وہ کبھی کبھی ان سے بے ادبی کر بیٹھتی تھی۔ لیکن اب وہ ان کی شان میں کسی خود غرضانہ خیال کو دل میں بھی نہ آنے دیتی۔ اُسے یقین تھا۔ کہ قیدِ عناصر سے آزاد ہوکر روح کو ظاہروباطن کا یکساں علم ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اب وہ جانھوی کو خوش رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتی تھی۔ لیکن جانھوی دن میں دوچار مرتبہ ضرور ہی اس کے زخم کو تازہ کردیا کرتی تھی۔ شانتا کو غصہ آتا۔ پر وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ تنہائی میں بھی نہ روتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ والد مرحوم کو میرے گریہ وزاری سے ملال ہوگا۔ ہولی کے دن اما ناتھ اپنی دونوں لڑکیوں کے لیے اچھی اچھی ساڑیاں لائے۔ جانھوی نے بھی اپنی ریشمی ساڑی نکالی۔ لیکن شانتا کو اپنی پرانی دھوتی ہی پہننی پڑی۔ اس کا دل غم سے پارہ پارہ ہوگیا۔ اس کے چہرہ پر ذرا بھی شکن نہ آئی۔ دونوں بہنیں منہ پھلائے بیٹھی تھیں کہ ساڑیوں میں فیتے نہیں لگوائے گئے۔ اور شانتا خوش خوش گھر کے کام دھندے کررہی تھی۔ یہاں تک کہ جانھوی کو بھی اس پر رحم آگیا۔ اس نے اپنی پرانی لیکن ریشمی ساڑی نکال کر شانتا کو دے

دی۔ شانتا نے ذرا بھی انکار نہ کیا! اُسے پہن کر پھر پکوان بنانے میں مصروف ہوگئی۔

ایک دن شانتا اما ناتھ کی دھوتی دھونا بھول گئی۔ دوسرے دن علی الصبّاح اما ناتھ نہانے چلے تو دھوتی گیلی پڑی تھی۔ وہ تو کچھ نہ بولے لیکن جانھوی نے شانتا کو اتنا کوسا کہ وہ رو پڑی۔ روتی تھی اور دھوتی چھانٹتی جاتی تھی۔ اما ناتھ کو یہ دیکھ کر رنج ہوا۔ انھوں نے دل میں سوچا ہم محض پیٹ کی روٹیوں کے لیے ایک یتیم کو اس قدر ستارہے ہیں۔ ایشور کے یہاں کیا جواب دیں گے۔ جانھوی سے تو انھوں نے کچھ نہ کہا۔ پردل میں فیصلہ کیا کہ بہت جلد ان یتیم آزاریوں کا خاتمہ کرنا چاہیے۔ مراسم وفات سے فارغ ہوکر آج کل اما ناتھ پنڈت مدن سنگھ پر قانونی چارہ جوئی کرنے کی فکر میں منہمک تھے۔ وکیلوں نے انھیں یقین دلایا تھا۔ کہ ضروری تمھاری فتح ہوگی۔ پانچ ہزار روپے ہاتھ آجانے کی امید نے اما ناتھ کے دل میں بڑے بڑے منصوبے پیدا کردیے تھے۔ وہ اس سرور میں مست ہوجایا کرتے تھے۔ نئے مکان کا خاکہ تیار ہوگیا تھا۔ اس کے لیے موقعہ کی زمین کی تلاش بھی شروع ہوگئی تھی۔ ان مسرت ناک ارادوں میں انھیں شانتا کی فکر بھی نہ رہی تھی۔ آج جانھوی کی سخت کلامیوں نے انھیں شانتا کی درد رسی کی جانب مائل کیا۔ گجانند کے دیے ہوئے ایک ہزار روپے جو انھوں نے مقدمہ کے مصارف کے لیے الگ رکھ دیے تھے گھر میں موجود تھے۔ ایک دن انھوں نے جانھوی سے شانتا کی شادی کے متعلق کچھ گفتگو کی۔ شانتا نے یہ باتیں سن لیں۔ استغاثہ کے چرچے سن کر بھی اسے رنج ہوتا تھا۔ پر وہ اس میں دخل دینا حد درجہ نامناسب سمجھتی تھی۔ لیکن شادی کا ذکر سن کر وہ خاموش نہ رہ سکی۔ ایک پُرزور تحریکِ باطن نے اس کے شرم اور حجاب کو دور کردیا جونہی اما ناتھ باہر چلے گئے۔ وہ جانھوی کے پاس جاکر بولی۔ ''ابھی ماموں تم سے کیا کہہ رہے تھے؟''

جانھوی نے بے دلی سے کہا، ''کہہ کیا رہے تھے اپنا دُکھ رورہے تھے۔ ابھاگنی سمن نے یہ سب کچھ کیا۔ ورنہ کیے ہوئے کو پھر کیوں کرنا پڑتا۔ اب نہ اچھا خاندان ہی ملتا ہے اور نہ اتنا اچھا بَر۔ تھوڑی دور پر ایک گاؤں ہے۔ وہیں ایک بَر دیکھنے گئے تھے۔''

شانتا نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا: ''کیا میں تم لوگوں کو اتنی بھاری ہوگئی ہوں کہ مجھے پھینکنے کی پڑی ہوئی ہے؟ آپ ماموں سے کہہ دیجیے کہ وہ میرے لیے کوئی تردّد نہ کریں۔''

جانھوی ۔تم ان کی پیاری بھانجی ہو۔ ان سے تمھاری مصیبت سہی نہیں جاتی۔ میں نے بھی تو یہی کہا تھا کہ ابھی رہنے دو۔ جب مقدمہ کے روپے ہاتھ آجائیں۔ تو اطمینان سے شادی کرنا۔ وہ میری مانیں تب تو!

شانتا۔ مجھے وہیں کیوں نہیں پہنچادیتے؟

جانھوی نے استعجاب سے پوچھا۔"کہاں؟"

شانتا نے سادگی سے جواب دیا۔ "چاہے چنار، چاہے کاشی۔"

جانھوی ۔کیسی پگلوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوسکتا۔ تو رونا کاہے کا تھا۔ ان لوگوں کو تجھے گھر میں رکھنا ہوتا تو یہ اندھیر کیوں مچاتے؟

شانتا۔ بہو بناکر نہ رکھیں گے۔ لونڈی بناکر تو رکھیں گے۔

جانھوی نے بیدردی سے کہا۔"تو چلی جاؤ روکتا کون ہے؟ تمھارے ماموں سے یہ کبھی نہ ہوگا۔ کہ وہ تمھیں سرچڑھاکر لے جائیں۔ اور پھر اپنی بدنامی کراکے واپس لائیں۔ وہ تو ان لوگوں کا سر کچل کر ان سے اپنے تاوان کے روپیے وصول کریں گے۔

شانتا۔ مامی وہ لوگ چاہے کیسے مغرور ہوں۔ لیکن میں ان کے دروازہ پر جاکر کھڑی ہوجاؤں گی۔ تو انھیں رحم آہی جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ وہ مجھے اپنے دروازے سے دتکار نہ دیں گے۔ اپنا دشمن بھی دروازہ پر آجائے تو اسے بھگاتے لحاظ ہوتا ہے۔ میں تو پھر بھی ...... ۔"

جانھوی کو اب صبر کی تاب نہ رہی۔ یہ بے شرمی اس سے برداشت نہ ہوئی۔ بات کاٹ کربولی۔"چپ بھی رہ، شرم وحیا تو تجھے جیسے چھو نہیں گئی۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ جو اپنی بات نہ پوچھے وہ چاہے دھنا سیٹھ ہی ہو۔ اس کی طرف آنکھ اٹھاکر نہ دیکھوں۔ اب تو وہ لوگ یہاں آکر ناک بھی گھسیں تو میں انھیں دور سے ہی بھگا دوں۔"

شانتا خاموش ہوگئی۔ دنیا چاہے جو کچھ سمجھتی ہو۔ لیکن وہ اپنے کو بیاہتا ہی سمجھتی تھی ایک منسوبہ لڑکی کا دوسرے گھر بیاہ ہو یہ اُسے انتہا درجہ شرمناک اور نفرت انگیز معلوم ہوتاتھا۔ بارات آنے کے ایک ماہ قبل ہی سے وہ سدن کے اوصاف سن سن کر اس کے ہاتھوں بک چکی تھی۔ اس نے اپنے دروازہ پر دواربوجا کے وقت سدن کو اسی نگاہ سے دیکھا تھا جیسے کوئی عورت اپنے شوہر کو دیکھتی ہے۔ اس طرح نہیں گویا وہ کوئی بیگانہ آدمی ہے۔

اب کسی دوسرے مرد کا خیال اس کے شیشۂ عصمت پر پتھر کی طرح لگتا تھا۔ وہ اتنے دنوں تک سدن کو اپنا شوہر سمجھنے کے بعد اب اُسے دل سے نکال نہ سکتی تھی۔ دھرم کی زنجیر کو توڑ نہ سکتی تھی۔ سدن اب اس کا شوہر تھا۔ چاہے اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ چاہے اس کی بات پوچھے یا نہ پوچھے۔ اگر دوارپوجا کے بعد ہی سدن اس کے سامنے آتا تو وہ اس سے اس طرح ملاقات کرتی گویا وہ اس کا شوہر ہے۔ شادی رسوم کا طومار نہیں۔ محض دل کی کیفیت ہے۔

شانتا کو ابھی تک یہ امید تھی کہ کبھی نہ کبھی میں ضرور اپنی سسرال جاؤں گی۔ لیکن آج اپنی شادی یا ازدواج ثانی کا ذکر سن کر اس کا دلِ پُردرد کانپ اُٹھا۔ اس نے شرم وحیا چھوڑدی۔ اور جانھوی سے منت کی کہ مجھے سسرال بھیجوا دو۔ اتناہی اس کے امکان میں تھا۔ اس کے سوا وہ اور کیا کرتی۔ لیکن جانھوی کی بے رحمانہ گفتگو سن کر اس کا صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ دل کا اضطراب بڑھنے لگا۔ رات کو جب سب لوگ سوگئے۔ تو اس نے پنڈت پدم سنگھ کے نام ایک خط لکھنا شروع کیا۔ یہ اس کی آخری تدبیر تھی۔ اس کے ناکام ہونے پر اس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرلیاتھا۔ خط جلد تمام ہوگیا۔ مضمون پہلے ہی سے ذہن میں موجود تھا۔ صرف لکھنے کی دیر تھی۔

"میرے قابلِ تعظیم دھرم پتا۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ مجھ پر رحم کیجیے۔ یہاں کی حالت کیا لکھوں۔ پتاجی گنگا میں ڈوب گئے۔ آپ لوگوں پر مقدمہ چلانے کی صلاح ہورہی ہے۔ میری دوبارہ شادی ہونی قرار پائی ہے جلد خبر لیجیے۔ ایک ہفتہ تک آپ کی راہ دیکھوں گی۔ اس کے بعد اس بیکس یتیم کی فریاد آپ کے کانوں تک نہ پہنچے گی۔"

(۱۸)

پدم سنگھ کا پہلا بیاہ اس وقت ہوا تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اور ایف ۔ اے پاس ہوئے تو وہ ایک بیٹے کے باپ تھے۔ پر بیوی ناتجربہ کار تھی۔ بچے کی پرورش کرنا نہ جانتی تھی۔ پیدائش کے وقت تو لڑکا توانا و تندرست تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ دبلا ہونے لگا۔ اور چھٹے مہینے میں ماں اور بیٹا دونوں سے رخصت ہوگئے۔ پدم سنگھ نے ارادہ کیا کہ اب شادی

نہ کروں گا۔ مگر وکالت پاس کر چکنے پر انھیں پھر مجبوراً شادی کرنی پڑی۔ سھدرا بہو بن کر آئی اسے آج سات برس ہوگئے۔

پہلے دو تین سال تک تو پدم سنگھ کو اولاد کی کوئی فکر ہی نہ ہوئی۔ اگر بھاما کبھی اس کا ذکر کرتی تو وہ ٹال جاتے تھے۔ کہتے مجھے اولاد کی ہوس نہیں۔ مجھ سے یہ بوجھ نہ سنبھلے گا۔ ابھی تک انھیں اولاد کی امید تھی۔ اس لیے بے صبر نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب چوتھا سال بھی یونہی کٹ گیا۔ تو انھیں کچھ مایوسی ہونے لگی۔ فکر ہوئی۔ کیا فی الواقع میں لاولد ہی رہوں گا؟ جوں جوں دن گزرتے گئے یہ فکر بڑھتی جاتی تھی۔ اب انھیں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ سھدرا سے وہ محبت نہ رہی۔ سھدرا تاڑ گئی۔ اسے صدمہ تو ہوا۔ پر اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کیا۔

پدم سنگھ اپنے تئیں بہت سمجھاتے کہ تمھیں اولاد لے کر کیا کرنا ہے، روزِ ولادت سے پچیس سال تک اسے جلاؤ، کھلاؤ، پڑھاؤ، لکھاؤ۔ اس پر بھی یہ اندیشہ لگاہی رہتا ہے کہ یہ کسی ڈھنگ کا ہوگا بھی یا نہیں۔ کہیں لڑکا مر گیا۔ تو اس کے نام کو بیٹھ کر روؤ۔ اور جو کہیں خود ہی مر گئے۔ تب تو غریب لڑکے کی زندگی ہی تباہ ہوگئی۔ ہمیں ایسی نعمت کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان خیالات سے دل کو تشفی نہ ہوتی تھی۔ وہ سھدرا سے اپنا دردِ دل چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اسے معذور سمجھ کر حسب سابق اس کے ساتھ محبت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب دل پر یاس کی تاریکی چھائی ہوئی ہو۔ تو چہرہ پر مسرت کی روشنی کہاں سے آئے۔ موٹی نگاہ کا آدمی بھی کہہ سکتا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کشیدگی ضرور ہے۔ خیرت یہی تھی کہ سھدرا اپنے ․ہر کی محبت اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑتی تھی۔ وہ اپنی دلجوئیوں سے اولاد کی تمنا کو مٹانا چاہتی تھی۔ مگر اس امر دشوار میں وہ اس شخص سے زیادہ کامیاب نہ ہوتی تھی جو مریض کو گیتوں سے اچھا کرنا چاہتا ہو۔ خانہ داری کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اسے ہمیشہ دبنا پڑتا تھا۔ اور جب سے سدن یہاں رہنے لگا تھا۔ کتنی ہی بار سدن کے پیچھے اسے جھڑکیاں سننی پڑی تھیں۔ عورت اپنے شوہر کے ہاتھ سے بھالے کا زخم بھی برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن کسی دوسرے شخص کے پیچھے اگر شوہر اسے تیز نگاہ سے دیکھے بھی۔ تو اسے برداشت نہیں ہوتی۔ سدن سھدرا کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ آخر کار وہ ابل ہی پڑی۔ گرمی کی شدت تھی۔ مہرن کسی وجہ سے نہ آئی تھی۔ سھدرا

کو رسوئیں بنانا پڑی اس نے پدم سنگھ کے لیے باریک پھلکیاں بنائیں۔ لیکن گرمی سے بیتاب تھی۔ چولہے کے سامنے بیٹھا نہ جاتا تھا۔ سدن کے لیے موٹی موٹی روٹیاں پکادیں۔ پدم سنگھ کھانا کھانے بیٹھے، تو سدن کی تھال میں موٹی روٹیاں نظر آئیں۔ غصہ کے مارے انھوں نے اپنی پھلکیاں اس کی تھالی میں رکھ دیں اور اس کی روٹیاں اپنی تھالی میں ڈال لیں۔ سبھدرا نے جل کر کچھ طنز آمیز باتیں کیں۔ پدم سنگھ نے ان کا ویسا ہی جواب دیا۔ پھر جواب الجواب کی نوبت آئی۔ یہاں تک کہ وہ جھلا کر اُٹھ آئے۔ کھانا نہیں کھایا۔ سبھدرا نے بھی مناون نہیں کیا۔ اس نے رسوئیں اٹھادی۔ اور جاکر لیٹ رہی۔ تب سے پورا ایک دن گزرگیا۔ مگر دو میں سے ایک کا بھی غصہ فرو نہیں ہوا۔ مہرن نے آج کھانا پکایا۔ پر نہ پدم سنگھ نے کھایا نہ سبھدرا نے۔ سدن باری باری سے دونوں کی خوشامد کررہاتھا۔ ایک طرف سے جواب آتا ”ابھی بھوک نہیں ہے۔“ اور دوسرے طرف سے جواب ملتا۔”کھالوں گی۔“ یہ تھوڑے ہی چھوٹے گا۔ یہی چھوٹ جاتا۔ تو کیوں کسی کی دھونس سہنی پڑتی ۔ تعجب یہ تھا۔ کہ سبھدرا سدن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی۔ حالانکہ وہی کل کی بدمزگیوں کا خاص باعث تھا۔ ہرن خوب جانتا ہے کہ ٹٹی کی آڑ سے آنے والا تیر دراصل صیاد کا شوقِ شکار یا تمنائے گوشت ہے۔

تیسرا پہر ہوگیا تھا۔ پدم سنگھ سوکر اُٹھے تھے۔ اور جمائیاں لے رہے تھے۔ ان کے دل میں سبھدرا کی جانب سے ایک غبار بھرا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکیے نے ایک بیرنگ خط لاکر انھیں دیا۔ انھوں نے ڈاکیہ کی طرف ترش نگاہوں سے دیکھا۔ گویا بیرنگ چٹھی لاکر اس نے کوئی خطا کی ہے۔ پہلے تو ان کے جی میں آیا کہ اسے واپس کردیں۔ کسی مفلس مؤکل نے اس میں اپنی مصیبت کی کتھا گائی ہوگی، لیکن پھر کچھ سوچ کر چٹھی لے لی۔ اور اِسے پڑھنے لگے۔ یہ شانتا کا خط تھا۔ اسے ایک بار پڑھ کر میز پر رکھ دیا۔ ایک لمحہ کے بعد اسے پھر پڑھا۔ اور تب کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ اس وقت اگر مدن سنگھ وہاں موجود ہوتے تو انھیں یہ خط دکھاتے اور کہتے۔ یہ آپ کے خوفِ رسوائی کا، آپ کے خاندانی وجاہت کے غرور کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ایک انسان کا خون کیاہے۔ اور وہ خون آپ کی گردن پر ہے۔ اما ناتھ کے استغاثہ کا ذکر پڑھ کر پدم سنگھ کو گو نہ مسرت ہوئی۔ بہت اچھا ہو۔ کہ یہ استغاثہ دائر ہوجائے۔ اور ان حضرت کا غرور نیچا ہوکر خاک میں مل جائے۔ اما ناتھ کی ڈگری ضروری

ہوگی۔ تب بھائی صاحب کو معلوم ہوگا، کہ یہ تماشا کتنا مہنگا پڑا۔ افسوس! اس غریب لڑکی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پدم سنگھ نے پھر خط پڑھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حُسن عقیدت ٹپکا پڑتا تھا۔ شانتا نے انھیں "دھرم پتا" لکھا تھا۔ یہ ایک لفظ ان کے دل پر جادو کا سا عمل کررہا تھا۔ اس نے ان کے جذبۂ انصاف کو متحرک اور ان کے دل میں کے تار حمایت کو مرتعش کردیا۔ فوراً کپڑے پہنے اور بٹھل داس کے مکان پر جا پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ وہ کنور انردھ سنگھ کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ فوراً بائسکل ادھر پھیردی۔ وہ شانتا کے متعلق اسی وقت کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا چاہتے تھے انھیں خوف تھا، کہ کہیں تاخیر اس جوش کو ٹھنڈا نہ کردے۔

کنورصاحب کے یہاں آج گوالیر کا جل ترنگیا آیا ہوا تھا۔ اس کا گانا سننے اور اس کا کمال دیکھنے کے لیے انھوں نے اپنے احباب کو مدعو کیا تھا۔ پدم سنگھ وہاں پہنچے تو دیکھا۔ بابو بٹھل داس اور پروفیسر رومیش دت کے درمیان ایک سرگرم مناظرہ ہورہاہے اور کنور صاحب پنڈت پربھاکرراؤ اور سید تیغ علی بیٹھے ہوئے اس مناظرہ کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ گویا بٹیروں کی لڑائی ہورہی ہے۔ پدم سنگھ کو دیکھتے ہی کنورصاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور بولے۔ "آیئے آیئے۔ یہاں خونریز جنگ ہورہی ہے۔ کسی طرح انھیں الگ کیجیے۔ نہیں تو دونوں لڑتے لڑتے مرجائیں گے۔"

اتنے میں پروفیسر دت بولے،"تھیاصوفسٹ ہونا کوئی گالی نہیں ہے۔ میں تھیاصوفسٹ ہوں۔ اور اسے ساری دنیا جانتی ہے۔ یہ ہماری ہی سوسائٹی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ آج امریکہ، جرمنی، روس وغیرہ ملکوں میں آپ کے رام اور کرشن کے معتقد، اور گیتا اُپنشد وغیرہ مقدس کتابوں کے شائق نظر آنے لگے ہیں۔ ہماری سوسائٹی نے ہندو قوم کا رتبہ بڑھادیا ہے۔ اس کے دائرہ اثر کو وسیع کردیا ہے۔ اور اسے اس مسندِ اعزاز پر بیٹھا دیا ہے۔ جسے وہ اپنی آرام طلبی اور جمود کے باعث صدیوں سے چھوڑے بیٹھے تھی۔ یہ ہندو قوم کی احسان فراموشی ہوگی اگر وہ ان لوگوں کی منت گزار نہ ہو۔ جنھوں نے اپنی شمعوں سے اسے بصارت عطا کی ہے۔ یہ شمع چاہے میڈم بلیوٹسکی نے روشن کی ہو، چاہے کرنل الکٹ نے، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں جن لوگوں کی ذات سے فیض پہنچا ہے۔ ان کا مشکور ہونا۔ ہمارا فرض ہے۔ اگر آپ اسے روحانی غلامی کہتے ہیں تو آپ کی صریح بے انصافی ہے۔

بٹھل داس نے اس تقریر کو ایسی لاپرواہی سے سنا۔ گویا یہ کوئی مہمل بکواس ہے۔ اور بولے ''جسے آپ احسان گزار کہتے ہیں۔ اسی کو میں روحانی غلامی کہتا ہوں۔ بلکہ غلام تو ایک طرح سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا جسم چاہے جکڑا ہوا ہو۔ لیکن اس کی روح آزاد ہوتی ہے۔ آپ لوگوں نے تو اپنی روحانی آزادی ہی کو بیچ دیا ہے۔ آپ کی انگریزی تعلیم نے آپ کو اتنا پست ہمت بنادیا ہے، آپ اپنے روحانی اور مذہبی اعتقادات میں بھی یورپین علماء کے فیصلے کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ اپنشدوں کی عزت اس لیے نہیں کرتے ہیں۔ کہ وہ بجائے خود عزت کے قابل ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہیلوٹسکی اور سیکمولر نے ان کی تعریف کی ہے۔ آپ کے مذہبی رسوم و رواج سب بے معنی تھے۔ لیکن اب جو اہلِ مغرب نے ان کے اوصاف ظاہر کیے۔ تو آپ کو ان میں سرتاپا خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ آپ لوگوں میں اپنی عقل تمیز سے کام لینے کی طاقت سلب ہوگئی ہے۔ ابھی چند سال قبل تک آپ یہاں کے تانترک ودیا کی بات بھی نہ پوچھتے تھے۔ یورپین علماء نے جب ان کے معنی کا انکشاف کرنا شروع کیا۔ تو آپ جھاڑ پھونک۔ ٹوٹے ٹوٹکے کے قائل ہوگئے ہیں۔ یہ ذہنی متابعت جسمانی انقیاد سے کہیں زیادہ حقیر ہے آپ اپنشدوں کو انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ گیتا کو جرمن میں۔ آپ ارجن کو ارجنا کہتے ہیں۔ کرشن کو کرشنا۔ رام کو راما۔ یہ سب آپ کی زباندانی ہے۔ آپ نے ہی ذہنی غلامی کے باعث اس ملک میں بھی اطاعت قبول کرلی۔ جہاں ہم اپنے بزرگوں کے علم اور کمال کی بدولت قیامت تک اپنی سربلندی کے پھریرے اڑاسکتے تھے۔''

رومیش دت کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ اس کا کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے۔ کہ کنور صاحب بول اٹھے،''یارو! اب مجھ سے بولے بغیر نہیں رہاجاتا۔ بابو بٹھل داس آپ اپنے اس غلامی کے الزام کو واپس لیجیے۔''

بٹھل داس ۔کیوں واپس لوں؟

کنور صاحب ۔آپ کو یہ الزام دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بٹھل داس ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

کنور صاحب ۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے شخص کو غلام کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ اندھوں کی بستی میں کون کسی کو اندھا کہے گا۔ ہم سب کے سب امیر ہوں یا غریب، راجا ہوں یا فقیر غلام ہیں۔ ہم اگر جاہل مفلس، گنوار ہیں۔ تو تھوڑے

غلام ہیں۔ ہم اپنے رام کا نام لیتے ہیں۔ اپنی دھوتی پگڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنی گائے پالتے ہیں۔ اور اپنی پاک گنگا میں نہاتے ہیں اور اگر ہم تعلیم یافتہ صاحب ثروت اور بیدار مغز ہیں۔ تو بہت غلام ہیں۔ کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ بدیسی زبان بولتے ہیں۔ کتے پالتے ہیں۔ ٹب میں نہاتے ہیں۔ اور اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ہماری ساری قوم انھیں دو جماعتوں میں منقسم ہے۔ اس لیے کوئی کسی کو غلام نہیں کہہ سکتا۔ غلامی کو مختصر صورتوں میں تقسیم کرنا خیال باطل ہے۔ غلامی صرف روح سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ اس کی دوسری صورتیں اسی میں مشتمل ہیں موٹر، بنگلے، پولو، اور پیانو یہ سب لوہے کی ایک بیڑیاں ہیں۔ جس نے ان بیڑیوں کو نہیں پہنا۔ انھیں کو سچی آزادی کا لطف حاصل ہوسکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں۔ جو اپنے پسینہ کی کمائی کماتے ہیں۔ اپنا قومی لباس۔ قومی زبان اور قومی معاشرت کے لیے کسی غیر کے محتاج نہیں، ہم جو مغرب پرست اور روشن خیال ہیں۔ لوہے کی بیڑیاں پہن کر اپنی روحانی آزادی کو ہاتھ سے کھوکر کسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انھیں قابلِ رحم سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل قابلِ رحم ہم ہیں۔ جو اپنی روٹیوں کے لیے بھی دوسروں کے دستِ کرم کے محتاج ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں۔ جو بنگلوں پر جبیں سائیاں کرتے ہیں۔ خانساموں کے ناز اٹھاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں لیے لیے دربدر گھومتے ہیں۔ کسانوں کو کسی نے یہ بیہودہ حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟ ہم پالتو کتے ہیں۔ جو جنگل کے آزاد جانوروں کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔ ہمارے لیے اس سے بہتر کوئی تشبیہ نہیں ہوسکتی۔

پربھاکر راؤ نے مسکرا کہا، "آپ کو کسان بن جانا چاہیے۔"

کنور صاحب۔ کسان بن جاؤں تو اپنے پہلے جنم کی سزائیں کیوں کر جھیلوں گا؟ بڑے دن میں میوے کی ڈالیاں کیسے لگاؤں گا۔ سلامی کے لیے خانساموں کی خوشامدیں کیسے کروں گا۔ خطابوں کے لیے نینی تال کی زیارت کیوں کر کروں گا۔ ڈنر پارٹی دے کر لیڈیوں کے کتوں کو کیوں کر گود میں اٹھاؤں گا۔ اپنے آقاؤں کو خوش رکھنے کے لیے قومی بہبود کی تجاویز کی مخالفت کیوں کر کروں گا۔ یہ سب انسانی پستی کے آخری درجے ہیں۔ اس منزل کو طے کیے بغیر ہماری نجات نہیں ہوسکتی۔ (پدم سنگھ سے) کہیے شرما جی! آپ کی تجویز بورڈ میں کب آئے گی؟ آپ آج کل کچھ افسردہ خاطر نظر آتے ہیں۔ کیا اس تجویز کا بھی وہی حشر ہوگا۔

جو ہماری بیشتر قومی تحریکوں کا ہوا کرتا ہے؟

ادھر کچھ دنوں سے فی الواقع پدم سنگھ بے دل سے ہو رہے تھے۔ جوں جوں تجویز کے پیش ہونے کا زمانہ قریب آتا تھا۔ ان کا اعتماد کمزور ہوتا جاتا تھا۔ انھیں اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنے شکوک کو کسی پر ظاہر کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ کنور صاحب کی طرف نگاہ اعتماد سے دیکھ کر بولے، "جی نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔ ہاں ان دنوں ذرا فرصت کم تھی۔ اس وجہ سے اتنی سرگرمی سے کام نہ ہو سکا۔"

کنور صاحب۔ تجویز کی کامیابی میں تو اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے؟

تیغ علی نے عارفانہ انداز سے کہا، "ان پر اعتماد کرنا ریت پر دیوار بنانی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ادھر کیا ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں۔ عجب نہیں۔ کہ وہ حضرات آپ کو عین وقت پر دھوکا دیں۔"

پدم سنگھ۔ مجھے ان سے ایسی امید نہیں ہے۔

تیغ علی ۔ یہ آپ کی شرافت ہے۔ وہاں اس وقت اردو ہندی کا قضیہ درپیش ہے۔ گاؤکشی، جداگانہ انتخاب، سود کا مجوزہ قانون ان سب ہی مسائل سے مذہبی تعصّبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

پربھاکر راؤ۔ کیا سیٹھ بلبھدرداس تشریف نہ لائیں گے۔ کسی طرح انھیں اپنی طرف کھینچنا چاہیے۔

کنور صاحب ۔ میں نے انھیں دعوت ہی نہیں دی۔ کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ وہ نہ آئیں گے۔ وہ اختلافِ رائے کو جانی دشمنی خیال کرتے ہیں۔ ہمارے لیڈروں کی بالعموم یہی حالت ہے۔ یہی ایک امر ہے۔ جس میں ان کی زندہ دلی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے ان سے ذرا بھی اختلاف کیا۔ اور وہ آپ کی جان کے گاہک ہوگئے۔ آپ سے بولنا تو دور رہا۔ آپ کی صورت سے گریز کریں گے۔ بلکہ موقع پائیں گے۔ تو حکام سے آپ کی شکایت کریں گے۔ اپنے جوارحین میں آپ کے طور وطریق، عادات و اطوار کا مضحکہ اڑائیں گے۔ آپ برہمن ہیں تو آپ کو بھکاری کہیں گے۔ آپ چھتری ہیں تو اجڈ گنوار کا لقب عطا کریں گے۔ آپ ویش ہیں۔ تو آپ کو بقال اور ڈنڈی تول کا خطاب ملے گا۔ اور اگر آپ

شودر ہیں۔ تب تو آپ بنے بنائے چانڈال ہیں۔ آپ کو اگر گانے کا شوق ہے تو آپ پاکھنڈی اور پوپ ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی مستورات پر بھی کیچڑ پھینکنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمارے یہاں اختلافِ رائے بدترین گناہ ہے اور اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ اہا وہ دیکھیے ڈاکٹر شیاماچرن کا موٹر آگیا۔

ڈاکٹر صاحب موٹر سے اترے اور حاضرین کی طرف مربیانہ انداز سے دیکھتے ہوئے بولے، "I am sorry I was so late" کنور صاحب نے ان کی تعظیم کی۔ اور لوگوں نے بھی ہاتھ ملائے۔ اور ڈاکٹر صاحب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے، "When is the performance to begin." کنور صاحب نے کہا، ''ڈاکٹر صاحب آپ بھولتے ہیں یہ کالے آدمیوں کی مجلس ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا، ''معاف کیجیے۔ مجھے یاد نہ رہا۔ کہ یہاں ملیچھوں کی زبان میں گفتگو کرنا منع ہے۔''

کنور صاحب۔ لیکن دیوتاؤں کی مجلس میں تو آپ سے شاید کبھی ایسی غلطی نہ ہوتی ہو۔

ڈاکٹر۔ تو مہاراج اس گناہ کا پرائشچت کرائیے۔

کنور صاحب۔ اس کا پرائشچت ہے۔ کہ آپ ہم جیسے گنواروں سے مادری زبان میں باتیں کیا کیجیے۔

ڈاکٹر۔ آپ راجا صاحب ہیں۔ آپ سے یہ عہد پورا ہوسکتا ہے۔ ہمارا انگریزی زبان سے شب وروز کا واسطہ ہے۔ ہم اس عہد کو نہیں نبھاسکتے۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ یہی زبان آج اس ملک کی Lingua Franca. ہے۔

کنور صاحب۔ آپ ہی جیسے معزز اصحاب نے تو اُسے یہ مرتبہ دے رکھاہے۔ فارس اور کابل کے کندۂ ناتراش فوجیوں اور ہندو سوداگروں کے میل جول سے اردو جیسی زبان وجود میں آگئی اگر ہمارے مختلف صوبہ جات کے اہل علم باہمی تعلقات میں اپنی ہی زبان پر تکیہ کرنے پر مجبور ہوتے۔ تو اب تک یہاں قومی زبان پیدا ہوجاتی۔ جب تک ہمارا صاحبِ علم طبقہ انگریزی زبان کا شیدا بنارہے گا۔ کسی قومی زبان کا ایجاد ہونا محال ہے۔ مگر یہ ایک وقت طلب امر ہے۔ اس میں کون جان کھپائے۔ یہاں تو انگریزی جیسی مکمل زبان مل گئی۔ بس لوگ اسی کے ہورہے۔ اب چاروں طرف سے یہی صدائیں آتی ہیں۔ کہ انگریزی ہماری لنگوافرنیکا ہے۔ اور ہمیں کسی ہندستانی زبان کو یہ شرف بخشنے کا خیال ترک کردینا چاہیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ انگریزی زبان میں بولنا اور لکھنا لوگ کیوں اس قدر باعثِ فخر

سمجھتے ہیں۔ میں نے بھی انگریزی پڑھی ہے۔ دوسال انگلستان میں بھی رہ چکا ہوں۔ اور آپ کے کتنے ہی انگریزی پر جان دینے والوں سے بہتر انگریزی لکھ اور بول سکتا ہوں۔ پر مجھے اس سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے۔ جیسے کسی انگریز کے اتارے ہوئے کپڑوں سے۔

پدم سنگھ ان مباحثوں میں شریک نہ ہوئے۔ جونہی موقع ملا۔ انھوں نے بٹھل داس کو قریب بلاکر شانتا کا خط دکھلایا۔ بٹھل داس نے پوچھا، "اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

پدم سنگھ۔ میری تو کچھ عقل ہی کام نہیں کرتی۔ جب سے یہ خط ملا ہے۔ ایسا معلوم ہورہاہے کہ میں ندی میں بہا جاتا ہوں۔

بٹھل داس ۔کچھ نہ کچھ تو کرناہی پڑے گا؟

پدم سنگھ۔ کیاکروں؟

بٹھل داس۔ شانتا کو رخصت کرالائیے۔

پدم سنگھ۔ سارے خاندان سے ناتا ٹوٹ جائے گا۔

بٹھل داس۔ ٹوٹ جائے۔ اس وقت فرض یہی ہے۔ اس سے منہ موڑنا مناسب نہیں۔

پدم سنگھ۔ آپ یہ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن مجھ میں اتنا استحکام نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

بٹھل داس ۔ اپنے گھر میں نہ رکھیے۔ بدھوا آشرم میں رکھ دیجیے۔ یہ تو مشکل نہیں؟

پدم سنگھ ۔ ہاں یہ آپ نے اچھی تدبیر نکالی مجھے اتنا بھی نہ سوجھتا تھا۔ مشکلات میں میری عقل جیسے چرنے چلی جاتی ہے۔

بٹھل داس ۔ لیکن جانا آپ کو پڑے گا۔

پدم سنگھ ۔ یہ کیوں۔ کیا آپ کے جانے سے کام نہ چلے گا؟

بٹھل داس ۔ بھلا اماناتھ اسے میرے ساتھ کیوں بھیجنے لگے۔

پدم سنگھ۔ اس میں انھیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔

بٹھل داس ۔ آپ تو کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں ۔ شانتا ان کی بیٹی نہ سہی۔ لیکن اس وقت وہ ہی اس کے سرپرست ہیں۔ وہ اسے ایک بیگانہ آدمی کے ساتھ کیوں آنے دیں گے؟

پدم سنگھ۔ بھائی صاحب آپ ناراض نہ ہوں۔ میں فی الواقع کچھ بدحواس ہوگیا ہوں۔ لیکن

میرے چلنے سے معاملہ طول پکڑجائے گا۔ بھائی صاحب سنیں گے تو مجھے مار ہی ڈالیں گے۔ جنواسے میں انھوں نے مجھے جس بری طرح دبوچا تھا۔ وہ مجھے یاد ہے۔

بٹھل ۔ خیر آپ نہ چلیے۔ میں ہی چلا جاؤں گا ۔ لیکن اماناتھ کے نام ایک خط لکھ دینے میں تو آپ کو تامل نہ ہوگا؟

پدم سنگھ۔ میں ڈرتا ہوں کہ آپ مجھے نرا مٹی کا تودہ سمجھنے لگیں گے۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ ایسی کوئی حکمت بتلائیے۔ کہ خدا نخواستہ کوئی بات پیدا ہو۔ تو میں صاف نکل جاؤں۔ بھائی صاحب کو مجھ پر الزام رکھنے کا موقع نہ ملے۔

بٹھل داس نے جھنجلا کر کہا،"جناب میری فکر اتنی رسا نہیں ہے بھلے آدمی! آپ بھی اپنے تئیں انسان کہیں گے۔ کہاں تو وہ دھواں دار تقریریں کرتے ہو۔ اور ایسے بلند جذبات سے پُر کہ معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا سے مستغنی ہو۔ اور کہاں یہ مہمل وسوسے؟"

پدم سنگھ نے خفیف ہوکر کہا،"اس وقت آپ جو چاہیں کہہ لیں۔ اس مہم کی ساری ذمہ داری آپ کے سر رہے گی۔"

بٹھل داس ۔ اچھا ایک تار تو دے دیجیے۔ یا اتنا بھی نہ ہوگا؟

پدم سنگھ نے اچھل کر کہا: "ہاں میں تار دے دوں گا۔ میں تو جانتا تھا کہ آپ کوئی نہ کوئی راہِ فرار ضرور نکالیں گے۔ اب اگر کبھی بات آئی تو کہہ دوں گا۔ کہ تار میں نے نہیں دیا تھا۔ کسی غیر شخص نے میرے نام سے دے دیا ہوگا"۔

مگر ایک ہی لمحہ میں ان کا خیال تبدیل ہوگیا۔ اپنے ضعفِ قلب پر غیرت آئی۔ دل میں سوچا بھائی صاحب ایسے کم اندیش نہیں ہیں۔ کہ اس کارِ خیر کے لیے مجھ سے ناراض ہوجائیں۔ اور اگر ناراض بھی ہوں۔ تو مجھے اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔

بٹھل ۔ تو آج ہی تار دے دیجیے۔

پدم سنگھ۔ لیکن یہ سراسر جعلسازی ہوگی۔

بٹھل۔ اس میں بھی کوئی شک ہے۔

پدم سنگھ ۔ میں بھی چلوں تو کیسا ہو؟

بٹھل۔ نہایت مناسب ۔ سارا کام بن جائے۔ ہر ایک بات بوجوہ احسن طے ہوجائے۔

پدم سنگھ۔ بہتر ہے۔ ہم اور آپ دونوں چلیں۔

بٹھل داس۔ تو کب؟
پدم سنگھ۔ بس آج تار دیے دیتا ہوں۔ پرسوں شام کی گاڑی سے چلے چلیں گے؟
بٹھل داس۔ طے ہوگیانا؟
پدم سنگھ۔ جی ہاں مستقل طور پر۔ آپ میرے کان پکڑ کر کھینچ لے جائیے گا۔
بٹھل داس نے اپنے سادہ دل دوست کو اعتقاد کی نظروں سے دیکھا اور تب دونوں آدمی جل ترنگ سننے جا بیٹھے۔ جس کی دلآویز صدائیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

(۱۹)

جب ہم حصول صحت کے لیے آب وہوا تبدیل کرنے جاتے ہیں۔ تو خاص احتیاط کرتے ہیں کہ ہم سے کوئی بدپرہیزی نہ ہو۔ مقررہ وقت پر کھاتے ہیں، سیر کرتے ہیں، آرام کرتے ہیں۔ ہم کو ہروقت اپنی صحت کی فکر لگی رہتی ہے۔ سمن بدھوا آشرم میں روحانی صحت حاصل کرنے گئی تھی۔ اور اپنے مدعا کو ایک دم کے لیے بھی فراموش نہ کرتی تھی۔ وہ اپنی بیوہ بہنوں کی خدمت میں حاضر رہتی۔ اور فرصت کے وقت مذہبی کتابیں پڑھتی۔ روز گنگا اشنان کرنے جاتی۔ ان کاموں سے اس کے دلِ پُر درد کو سکون ملتا تھا۔
بٹھل داس نے امولا کی خبریں اس سے چھپائی تھیں۔ لیکن جب شانتا کو آشرم میں رکھنے کا قطعی فیصلہ ہوگیا۔ تو انھوں نے سمن کو اس کے لیے تیار کرنا مناسب سمجھا۔ کنور صاحب کے یہاں سے آکر انھوں نے اس کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔
آشرم میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات بہت جاچکی تھی۔ پر سمن کو کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ اسے آج اپنی غلط روی کا واقعی صدمہ ہورہاتھا۔ جس طرح مریض کلوروفارم سونگھ لینے کے بعد ہوش میں آکر اپنے چیرے ہوئے پھوڑے کے گہرے زخم کو دیکھتا ہے۔ اور درد کے خوف سے پھر غش کھاجاتا ہے۔ وہی حالت اس وقت سمن کی تھی۔ ماں باپ اور بہن ۔ تینوں اسے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ماں شرم سے اور غم سے سر جھکائے اداس ہورہی تھی۔ باپ کھڑے اس کی طرف غضبناک اور پُرخون آنکھوں سے تاک رہے تھے۔ اور شانتا حسرت اور یاس کی تصویر بنی ہوئی کبھی زمین کی طرف دیکھتی تھی، کبھی آسمان کی طرف۔ سمن طائر مجروح کی طرح تڑپ اٹھی وہ ایک عالم جنوں میں چارپائی سے اٹھی۔ اور دیوار پر اپنا سر پٹک دیا۔ وہ اپنی ہی نگاہ میں اس وقت بھٹنی معلوم ہوتی تھی۔ سر

میں چوٹ لگتے ہی وہ تیوراکر گر پڑی۔ ایک لمحہ کے بعد اسے ہوش آیا۔ سر سے خون جاری تھا۔ اس نے آہستہ سے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ آنگن میں اندھیرا چھایا ہواتھا۔ وہ لپکی ہوئی پھاٹک پر آئی۔ پر وہ بند تھا۔ اس نے تالے کو کئی بار ہلایا۔ لیکن نہ کھول سکی۔ بوڑھا چوکیدار پھاٹک کے قریب ہی سو رہاتھا۔ سمن آہستہ سے اس کے پاس آئی۔ اور اس کے بستر پر کنجی ٹٹولنے لگی۔ چوکیدار چونک پڑا۔ اور چورچور چلانے لگا۔ سمن وہاں سے بے تحاشا بھاگی۔ اور اپنے کمرہ میں آکر کیواڑ بند کرلیے۔ اس پر رقت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بلک کررونے لگی۔ ہائے! مجھ جیسی خانہ خراب عورت دنیا میں نہ ہوگی۔ میں نفس پروری کی ہوس میں اپنے خاندان کو غارت کردیا۔ میں اپنے باپ کی قاتلہ ہوں میں نے شانتا کی گردن پر چھری چلائی ہے۔ میں اسے یہ روئے سیاہ کیوں کر دکھاؤں گی۔ اس کے سامنے کیوں کر تاکوں گی۔ دادا نے جس وقت میری داستان سنی ہوگی۔ انھیں کسی قدر صدمہ ہواہوگا۔ یہ سوچ کر وہ پھر رونے لگی۔ یہ خیال اور سب تکلیفوں سے جانگزا تھا۔ اگر کرشن چندر سے یہ باتیں کہنے کے بجائے مدن سنگھ اسے کولھو میں پیل دیتے۔ ہاتھی کے پیروں سے کچلوا دیتے۔ آگ میں جھونک دیتے۔ کتوں سے نچوا دیتے۔ تو وہ ذرا بھی چوں نہ کرتی۔ وہ جس وقت گھر سے نکلی تھی۔ اسے یہ گمان بھی نہ تھا۔ کہ مجھے دال منڈی میں بیٹھنا پڑے گا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس یاس اور اندوہ کی حالت میں وہ بھول گئی تھی۔ کہ میرا باپ اور بہن بھی ہے۔ عرصہ دراز کی جدائی نے اس کے دل میں ان کی یاد ہی باقی نہ رکھی تھی۔ وہ دنیا میں اپنے کو اکیلی۔ بے یار و مددگار سمجھتی تھی۔ میں کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ جہاں کوئی اپنا شناسا اپنا عزیز نہیں ہے۔ یہاں میں جو کچھ کروں گی۔ وہ چھپارہے گا۔ کوئی مجھ پر ہنسنے والا نہیں ہے۔ پر اب ایسے اتفاق آپڑے تھے۔ کہ وہ پھر اپنے تئیں عزیزوں اور یگانوں کے رشتہ میں بندھا ہوا پاتی تھی۔ جنھیں وہ بھول گئی تھی۔ وہ پھر اس کے سامنے آگئے تھے اپنے یگانوں کے قرب نے اس کی شمع غیرت کو روشن کردیا۔

سمن نے باقی رات ایک روحانی عذاب کی حالت میں بسر کی۔ چار بجنے پر جونہی پھاٹک کھلا وہ گنگا اشنان کرنے چلی۔ وہ اکثر اکیلے ہی جایا کرتی تھی۔ اس لیے چوکیدار نے کچھ پوچھا نہیں۔

گنگا کنارے پہنچ کر سمن اِدھر اُدھر تاکنے لگی۔ وہ آج گنگا میں نہانے نہیں ڈوبنے

آئی تھی۔ اسے کسی قسم کا خوف، گھبراہٹ یا اضطراب نہ تھا۔ کل کسی وقت شانتا آشرم میں آجائے گی۔ اس سے ملاقات کرنے کی بہ نسبت گنگا کی گود میں منہ چھپالینا کتنا آسان تھا!

ناگاہ اس نے دیکھا۔ کہ کوئی آدمی اس کی طرف چلا آرہا ہے۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ لیکن سمن کو اتنا معلوم ہوگیا کہ وہ سادھو ہے۔ سمن کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ اس نے ارادہ کیا۔ کہ اسے سادھو کو دے دوں۔ لیکن جونہی وہ قریب آیا۔ سمن نے شرم حقارت اور دہشت سے منہ چھپالیا۔ یہ گجانند تھے!

سمن کھڑی تھی۔ گجانند اس کے پیروں پر گرپڑے۔ اور تھرتھراتی ہوئی آواز سے بولے۔ "سمن میرا قصور معاف کرو۔"

سمن ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس شب بربادی کا نقشہ کھنچ گیا۔ زخم تازہ ہوگیا۔ اس کے جی میں آیا۔ کہ اسے خوب ذلیل کروں۔ کہوں کہ تم میرے باپ کے قاتل۔ میری زندگی کو تباہ کرنے والے ہو۔ پر کچھ گجانند کے ندامت آمیز انکسار۔ کچھ ان کے فقیرانہ بھیس اور کچھ اس جوش عفو نے جو ایسی حالت میں دل پر طاری ہوجاتا ہے۔ اسے پگھلادیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ رقت آمیز لہجہ میں بولی۔ "تمھارا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ سب میرے کرموں کا پھل تھا۔"

گجانند ۔ نہیں سمن ایسا نہ کہو۔ یہ سب میری جہالت اور حماقت کا پھل ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کی کچھ پرائشچت کرسکوں گا۔ لیکن اس کے مہلک نتائج دیکھ کر پرائشچت کی طرف سے مایوس ہوگیا۔ آہ! میں نے انھیں آنکھوں سے پنڈت کرشن چندر کو گنگا میں ڈوبتے دیکھا ہے!

سمن نے بے تاب ہوکر پوچھا۔ "کیا آپ اس وقت وہاں موجود تھے؟"

گجانند ۔ ہاں موجود تھا۔ میں رات کو امولا جارہا تھا۔ راستہ میں مجھے مل گئے۔ مجھے آدھی رات کو انھیں ندی کی طرف جاتے دیکھ کر شبہ ہوا۔ انھیں اپنے ڈیرے پر لایا۔ اور انھیں تشفی دینے کی کوشش کی۔ پھر یہ سمجھ کر کہ میرا منشا پورا ہوگیا۔ میں سوگیا۔ تھوڑی دیر میں جب میری آنکھ کھلی۔ تو انھیں وہاں نہ دیکھا۔ فوراً گنگا کی طرف دوڑا۔ اس وقت ان کے پکارنے کی آواز میرے کانوں میں آئی لیکن جب تک میں یہ فیصلہ کرسکوں۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ بے رحم لہروں نے انھیں چھپالیا۔ وہ نفس پاک میری آنکھوں کے سامنے جنت کو

سدھارا۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ کہ میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ معلوم نہیں ایشور کے یہاں اس کی کیا سزا ملے گی۔

گجانند کی روحانی کوفت نے سمن کے دل پر وہی کام کیا۔ جو صابن مَیل کے ساتھ کرتا ہے۔ اس نے دل میں بیٹھے ہوئے غبار کو اوپر کردیا۔ وہ خیالات نکل پڑے۔ جنھیں وہ مخفی رکھنا چاہتی تھی بولی:"ایشور نے تمھارے باطن کو روشن کردیاہے۔ تم اپنی نکوکاریوں سے چاہے کچھ کر بھی لو۔ پر میری کیا گت ہوگی۔ میں تو دونوں جہاں سے گئی۔ہائے میری ہوس عیش نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب کیا چھپاؤں۔ تمھاری غریبی اور اس سے زیادہ تمھارے دلآزارانہ برتاؤ نے مجھے اپنی حالت سے بیزار کردیا تھا۔ اس وقت اس پھپھولے کو پھوڑنے کے لیے ذرا سی ٹھیس بھی بہت تھی۔ تمھاری محبت تمھاری ہمدردی تمھاری ملائمت، تمھاری شفقت اس پھپھولے پر مرہم کا کام کرتی ۔ لیکن تم نے اسے بے دردی کے ساتھ مسل دیا میں درد سے بیتاب بے ہوش ہوگئی۔ تمھارے اس بے رحمانہ سلوک کو جب یاد کرتی ہوں تو دل میں ایک شعلہ سا دہک اُٹھتا ہے۔ اور تہ دل سے تمھارے لیے بددعا نکل آتی ہے۔ یہ میرا آخری وقت ہے۔ ایک لمحہ میں یہ گناہ آلود جسم گنگا میں ڈوب جائے گا اس لیے ایشور سے اب دعا کرتی ہوں۔ کہ وہ تمھاری خطائیں معاف کرے۔ تم میرے اور اپنے گناہوں کا پرائشچت کرسکو۔"

گجانند نے متفکرانہ انداز سے کہا، "سمن اگر جان دے دینے سے گناہوں کا پرائشچت ہوجاتا تو میں اب تک کبھی کا جان دے چکا ہوتا۔"

سمن نے کہا۔ "کم سے کم مصیبتوں کا تو خاتمہ ہوجائے گا؟"

گجانند۔ ہاں تمھاری مصیبتوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن ان کی مصیبتوں کا خاتمہ نہ ہوگا۔ جو تمھارے دکھ سے دکھی ہورہے ہیں۔ تمھارے ماں باپ قید جسم سے آزاد ہوگئے ہیں۔ لیکن ان کی روحیں تمھارے آس پاس پھررہی ہیں۔ وہ اب بھی تمھارے سکھ سے سکھی اور تمھارے دکھ سے دکھی ہوں گی، سوچ لو۔ اپنی جان دے کر ان کی روحوں کو عذاب میں ڈالوگی۔ یا اپنی زندگی کو سدھار کر انھیں نجات دوگی۔ یہ بھی سوچو۔ کہ تمھارے نہ رہنے سے اس بیکس شانتا کی کیا حالت ہوگی جس نے ابھی تک زمانہ کا اونچ نیچ نہیں دیکھا۔ تمھارے سوا دنیا میں اس کا اور کون ہے۔ اما ناتھ کا حال تم جانتی ہو۔ وہ اس کا نباہ نہیں

کرسکتے۔ ان میں رحم ہے۔ پر رحم سے زیادہ لالچ ہے کبھی نہ کبھی وہ اس سے ضرور ہی اپنا گلا چھڑالیں گے۔ اس وقت وہ کس کی ہوکر رہے گی؟

سمن کو گجانند کی باتوں میں سچی ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے ان کی طرف عاجزانہ انداز سے دیکھ کر کہا،"اسی لیے میں نے گنگا میں ڈوبنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ شانتا سے ملاقات کرنے کے مقابلہ میں مجھے ڈوب مرنا زیادہ آسان معلوم ہوتاہے۔ اس نے کئی دن ہوئے پنڈت پدم سنگھ کے پاس ایک خط بھیجا تھا۔ اما ناتھ اس کی شادی کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُسے منظور نہیں کرتی۔"

گجانند ۔ دیوی ہے۔

سمن۔ شرماجی بے چارے اور کیاکرتے۔ انھوں نے فیصلہ کیاہے۔ کہ اُسے لاکر آشرم میں رکھیں۔ اگر ان کے بھائی صاحب راضی ہوگئے۔ تب تو اچھا ہے۔ ورنہ اس دکھیا کو نہ معلوم کتنے دنوں تک آشرم میں رہنا پڑے گا۔ وہ کل یہاں آجائے گی۔ اس کے سامنے جانے کا خوف۔ اس سے آنکھیں ملانے کی شرم مجھے مارے ڈالتی ہے۔ جب وہ ملامت کی نظروں سے میری طرف دیکھے گی۔ اس وقت میں کیا کروں گی؟ اور جو کہیں اس نے نفرت کے باعث مجھ سے گلے ملنے سے پرہیز کیا۔ تب تو میں اسی وقت زہر کھالوں گی۔ اس ذلت سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔

گجانند نے سمن کو ارادتمندانہ نظروں سے دیکھا۔ انھیں محسوس ہوا۔ کہ ایسی حالت میں میرے دل کی بھی وہی حالت ہوتی۔ جو اس وقت سمن کی ہورہی ہے۔ بولے،"سمن تمھاری باتیں سچی ہیں۔ لیکن تمھارے دل پر چاہے جو کچھ گزرے شانتا کی خاطر تمھیں سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ تمھاری ذات سے اس کی جتنی بھلائی ہوسکتی ہے۔ اتنی دوسرے کی ذات سے ممکن نہیں۔ اب تک تم اپنے لیے جیئں تھیں اب دوسروں کے لیے جیو۔"

یہ کہہ کر گجانند جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔ سمن گنگا کنارے دیرتک کھڑی ان کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ تب اشنان کرکے آشرم کی طرف چلی۔ جیسے کوئی سپاہی جنگ میں شکست کھاکر سر جھکائے ہوئے گھر کی طرف جاتاہے۔

(۲۰)

شانتا نے پدم سنگھ کے نام خط تو لکھ دیا تھا۔ پر اُسے جواب کی کوئی امید نہ تھی۔

تین دن گزر گئے اس کی مایوسی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اگر موافق جواب نہ آیا۔ تو اما ناتھ ضرور ہی میری شادی کر دیں گے یہ سوچ کر اس کا دل کانپنے لگتا تھا۔ وہ دن میں کئی بار دیوی کے چبوترے پر جاتی۔ اور طرح طرح کی منتیں مانتی۔ کبھی شیوجی کے مندر میں جاتی۔ اور ان سے اپنی مراد مانگتی۔ سدن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دھیان سے نہ اترتا تھا۔ وہ اس کی تصویر سے مخاطب ہوکر کہتی، "پران ناتھ مجھے کیوں نہیں اپناتے! کیا بدنامی کے خیال سے! ہائے کیا میری جان اتنی سستی ہے۔ کہ ان داموں بکے۔ تم مجھے ترک کر رہے ہو۔ مجھے آگ میں جھونک رہے ہو۔ محض اس لیے کہ میں سمن کی بہن ہوں۔ یہی انصاف ہے! کہیں تم مجھے مل جاتے۔ میں تمھیں پکڑلیتی۔ پھر دیکھتی۔ کہ تم مجھ سے کیسے بھاگتے ہو۔ تم پتھر نہیں ہو۔ کہ میرے آنسوؤں سے نہ پگھل جاؤ۔ تم اپنی آنکھوں سے ایک بار میرا حال زار دیکھ لیتے۔ تو پھر تم سے نہ رہاجاتا۔ ہاں تم سے ہرگز رہا نہ جاتا۔ تمھارا وسیع دل، درد سے خالی نہیں ہوسکتا۔ کیا کروں؟ تمھیں اپنے دل کی حالت کیوں کر دکھاؤں؟"

چوتھے دن علی الصباح پدم سنگھ کا تار ملا۔ شانتا سہم گئی۔ اس کا جذبۂ الفت کچھ دھیما پڑگیا اپنی آنے والی حالت کے تفکرات نے دل کو مشوش کردیا۔

لیکن اما ناتھ پھولے نہ سمائے۔ باجے کا انتظام کیا۔ سواریاں جمع کیں۔ سارے گاؤں میں نوید بھیجی چوپال میں فرش وفروش بچھوائے گاؤں کے لوگ حیران تھے۔ کہ یہ کیسا گونہ ہے؟ شادی تو ہوئی ہی نہیں گونہ کیسا؟ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اما ناتھ نے کوئی نہ کوئی چال چلی ہے۔ ایک خرانٹ ہے۔ وقت معینہ پر اما ناتھ اسٹیشن گئے اور باجے بجواتے ہوئے۔ مہمانوں کو گھر لائے۔ اور چوپال میں انھیں اتارا۔ صرف تین آدمی تھے، بٹھل داس، پدم سنگھ ۔ اور ایک ملازم ۔

دوسرے دن شام کے وقت رخصتی کی مہورت تھی۔ تیسرا پہر ہوگیا۔ مگر اما ناتھ کے گھر میں گاؤں کی کوئی عورت نظر نہیں آتی۔ وہ باربار اندر آتے ہیں، تیور بدلتے ہیں۔ دیواروں کو دھمکاکر کہتے ہیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ جانھوی سے بگڑکر کہتے ہیں۔ میں ان سبھوں کی خبر لوں گا۔ لیکن وہ دھمکیاں جو کبھی نمبرداروں کا زہرہ آب کردیا کرتی تھیں۔ آج کسی پر اثر نہیں کرتیں۔ برادری بے جا دباؤ برداشت نہیں کرتی۔ نخوت اور تکبر کا سر نیچا کرنے کے لیے وہ ایسے ہی موقعوں کی منتظر رہتی ہے۔

شام ہوئی۔ کہاروں نے پالکی دروازہ پر لگا دی۔ جانھوی اور شانتا خوب گلے مل کر روئیں۔ شانتا کا دل دردِ محبت سے بھرا ہوا تھا۔ اس گھر میں اس نے جو جو مصیبتیں جھیلیں وہ سب اس وقت بھول گئی تھیں۔ ان لوگوں سے اب پھر ملاقات نہ ہوگی۔ اس گھر کے درودیوار کے پھر درشن نہ ہوں گے۔ ان سے ہمیشہ کے لیے رشتہ ٹوٹتا ہے۔ اس خیال سے اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا تھا۔۔ جانھوی کے دل میں بھی ہمدردانہ رحم کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ اس غریب یتیم لڑکی کو ہماری ذات سے بہت تکلیف ہوئی۔ یہ سوچ کر وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکتی تھی۔ دونوں کے دل خالص سچے اور نازک جذبات سے اُمڈے ہوئے تھے۔

اما ناتھ گھر میں آئے تو شانتا ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اور بین کرکے رونے لگی، ”تمھیں میرے باپ ہو۔ اپنی اس بدنصیب بیٹی کو بھول نہ جانا۔ میری بہنوں کو گہنے کپڑے دینا۔ ہولی اور تیجے میں بلانا۔ لیکن میں تمھاری دوحرفوں ہی کو نعمت سمجھوں گی۔“ اما ناتھ نے اسے تشفّی دیتے ہوئے کہا، ”بیٹی میری جیسی دوبیٹیاں ہیں۔ ویسی ہی ایک تم بھی ہو۔ پرماتما تمھیں ہمیشہ آرام سے رکھے۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگے۔

شام کا وقت تھا۔ منی گائے گھر آئی۔ تو شانتا اس کے گلے سے چمٹ کر رونے لگی۔ اس نے تین چارسال تک اس گائے کی خدمت کی تھی۔ اب وہ کس کے لیے بھوسا لے کر دوڑے گی؟ کس کے گلے میں کالے ڈورے میں کوڑیاں گوندھ کر پہنائے گی؟ منی سر جھکائے اس کے ہاتھوں کو چاٹتی تھی۔ اس کا دردِ فراق اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

جانھوی نے شانتا کو لاکر پالکی میں بٹھادیا۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی۔ شانتا کو ایسا معلوم ہوا گویا میں گہرے پانی میں بہی جارہی ہوں۔

گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی پالکی کو دیکھتی تھیں، اور روتی تھیں۔

اما ناتھ اسٹیشن تک لوگوں کو پہنچانے گئے۔ چلتے وقت اپنی پگڑی اتارکر پدم سنگھ کے پیروں پر رکھ دی۔ پدم سنگھ نے انھیں گلے سے لگالیا۔

جب گاڑی چلی۔ تو پدم سنگھ نے بٹھل داس سے کہا۔”اب اس ڈرامے کا سب سے مشکل حصہ آگیا۔“

بٹھل داس ۔میں آپ کا منشا نہیں سمجھا۔

پدم سنگھ۔ ”کیا شانتا سے کچھ کہے سنے بغیر ہی اسے آشرم میں پہنچا دیجیے گا“۔ اُسے پہلے

سے تیار رکھنا چاہیے۔
بٹھل داس ۔ ہاں یہ آپ نے خوب یاد دلایا۔ تو جاکر کہہ دوں؟
پدم سنگھ ۔ ذرا سوچ لیجیے۔ کیا کہیے گا۔ ابھی تو یہ سمجھ رہی ہے کہ میں سسرال جارہی ہوں صدمۂ غم میں یہ امید اسے سنبھالے ہوئے ہے۔ لیکن جب اسے ہماری حرفتیں معلوم ہوجائیں گی تو اُسے کتنا رنج ہوگا! مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ کہ میں نے پہلے ہی یہ راز کیوں نہ کہہ دیا۔
بٹھل داس۔ تو اب کہنے میں کیا بگڑاجاتا ہے۔ مرزاپور میں گاڑی دیر تک ٹھہرے گی۔ میں جاکر اسے سمجھادوں گا۔
پدم سنگھ۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔
بٹھل داس ۔ اگر غلطی پر پچھتانے ہی سے کام چل جائے تو خوب جی بھرکر پچھتا لیجیے۔
پدم سنگھ۔ اگر آپ کے پاس پنسل ہو تو لائیے۔ اسے ایک خط لکھ کر سارا حال روشن کردوں۔
بٹھل داس ۔ نہیں تار دے دیجیے۔ یہ اور بھی بہتر ہوگا۔ آپ عجیب آدمی ہیں۔ سیدھی سی بات میں اس قدر پس و پیش کرنے لگتے ہیں۔
پدم سنگھ۔ موقع ہی ایسا آپڑا ہے۔ میں کیا کروں۔ ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ مغل سرائے میں دیرتک رکنا پڑے گا۔ بس وہیں اس کے پاس جاکر سب ماجرا کہہ سناؤں۔
بٹھل داس۔ یہ آپ بہت دور کی کوڑی لائے۔ اسی لیے عقل مندوں نے کہا ہے۔ کہ کوئی کام بلا سمجھے نہ کرنا چاہیے۔ آپ کی عقل راستہ پر آتی ہے۔ لیکن بہت چکر کھاکر۔ یہی بات آپ کو پہلے نہ سوجھی۔

شانتا ڈیوڑھے درجہ کے زنانے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں دو عیسائی لیڈیاں اور بھی بیٹھی تھیں۔ وہ شانتا کو دیکھ کر انگریزی میں باتیں کرنے لگیں۔

"معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑکی سسرال جارہی ہے۔"

"ایسا رورہی ہے۔ گویا کوئی ڈھکیلے لیے جاتا ہو۔"

"شوہر کی ابھی تک صورت ہی نہ دیکھی ہوگی۔ محبت کیوں کر ہوسکتی ہے۔ مارے خوف کے بے حال ہوئی جاتی ہے۔"

"یہ ان کے یہاں نہایت بیہودہ رواج ہے۔ بے چاری لڑکی غیروں میں بھیج دی جاتی ہے۔ جہاں کوئی اس کا ہمدرد نہیں ہوتا۔"

"یہ اسی دورِ توحش کی باقیات ہیں۔ جب لوگ لڑکیوں کو بزور اٹھالے جاتے تھے۔"

ایک لیڈی نے شانتا سے پوچھا،"کیوں بائی جی سسرال جارہی ہو؟"

شانتا نے آہستہ سے سر ہلاکر کہا، "ہاں"۔

"تم اتنی خوبرو ہو۔ تمھارا شوہر بھی تمھارے ہی جوڑ کا ہے؟"

شانتا نے متانت سے جواب دیا،"شوہر میں خوبصورتی نہیں دیکھی جاتی۔"

"اگر کالا کلوٹا ہو تو؟"

شانتا نے پُرغرور لہجہ میں جواب دیا،"ہمارے لیے وہ دیوتا ہے چاہے کیسا ہی ہو۔"

"اچھا مان لو! تمھارے سامنے دو آدمی آئیں۔ ایک خوبصورت ہو، دوسرا کم رو، تو تم کسے پسند کروگی؟"

شانتا نے مستقل انداز سے کہا،"جسے ہمارے ماں باپ پسند کریں۔"

شانتا سمجھ رہی تھی۔ کہ یہ دونوں لیڈیاں ہمارے طریق ازدواج پر آوازے کس رہی ہیں۔ وہ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پوچھا،"ہم نے سنا ہے۔ آپ لوگ اپنے شوہر خود چُن لیتی ہیں؟"

"ہاں! اس معاملہ میں ہم کو کامل آزادی ہے۔"

"آپ اپنے تئیں والدین سے زیادہ عقل مند سمجھتی ہیں؟"

"ہمارے والدین کیا جان سکتے ہیں۔ کہ ہم کو ان کے چنے ہوئے شوہر سے محبت ہوگی یا نہیں۔"

"تو آپ شادی میں محبت کو اول سمجھتی ہیں؟"

"ہاں! اور کیا۔ شادی محبت کا رشتہ ہے"۔

"ہم لوگ شادی کو دھرم کارشتہ سمجھتے ہیں۔ ہماری محبت دھرم کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔"

نوبجے گاڑی مغل سرائے پہنچی۔ بٹھل داس نے آکر شانتا کو اتارا۔ اور ذرا دور ہٹ کر پلیٹ فارم پر ایک قالین بچھاکر اسے بٹھا دیا۔ بنارس کی گاڑی کھلنے میں آدھ گھنٹہ کی دیر تھی۔

شانتا نے دیکھا۔ کہ ہزاروں آدمی سر پر بڑے بڑے گٹھر رکھے ایک تنگ دروازہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور باہر نکلنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے تنگ دروازہ پر ہزاروں آدمی اندر آنے کے لیے دھکم دھکا کر رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک چوڑے دروازے سے انگریز لوگ چھڑی گھماتے ہوئے۔ کتوں کو لیے لیڈیوں سے ہاتھ ملائے۔ بہ آسائش آتے جاتے ہیں کوئی انھیں نہیں روکتا۔ کوئی ان سے نہیں بولتا۔ پولیس کے ملازم بھی جُھک جُھک کر انھیں سلام کرتے ہیں؟

اتنے میں پنڈت پدم سنگھ اس کے قریب آئے اور بولے،"شانتا میں تمھارا دھرم پتا پدم سنگھ ہوں۔"

شانتا کھڑی ہوگئی۔ اور دونوں ہاتھ جوڑکر انھیں پرنام کیا۔ پدم سنگھ نے کہا،"تمھیں تعجب ہورہا ہوگا۔ کہ ہم لوگ چنار کیوں نہیں اترے۔ اس کا سبب یہی ہے۔ کہ ابھی تک میں نے بھائی صاحب سے تمھاری بابت کچھ نہیں پوچھا۔ تمھارا خط پاکر میں ایسا گھبرایا۔ کہ مجھے پہلے تمھیں امولا سے رخصت کرالانا سب سے ضروری معلوم ہوا۔ بھائی صاحب سے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس لیے ابھی کچھ دنوں تک تمھیں بنارس رہنا پڑے گا۔ میں نے تجویز کی ہے کہ تمھیں اس وقت اسی آشرم میں ٹھہراوں گا۔ جہاں آج کل تمھاری بہن سُمن رہتی ہے۔ سمن کے ساتھ رہنے میں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ تم نے سمن کے متعلق جو شرمناک افواہیں سنی ہیں۔ انھیں دل سے نکال ڈالو۔ وہ اب دیوی ہے۔ اس کی زندگی اب نمونہ کے قابل ہوگئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں تمھیں اس کے ساتھ رکھنے پر ہرگز راضی نہ ہوتا۔ مہینہ دومہینہ میں، بھائی صاحب کو راضی کرلوں گا۔ اگر تمھیں یہ انتظام نہ پسند ہو تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو تاکہ میں کوئی دوسری فکر کروں۔

پدم سنگھ نے ان الفاظ کو بڑی مشکل سے ختم کیا۔ سمن کی انھوں نے جو تعریف کی تھی۔ اس پر انھیں خود اعتبار نہ تھا۔ مدن سنگھ کے متعلق بھی وہ اس سے زیادہ کہہ گئے۔ جتنا کہنا چاہتے تھے انھیں اس بھولی بھالی لڑکی کو اس طرح مغالطہ دیتے ہوئے روحانی صدمہ ہورہا تھا۔

شانتا روتی ہوئی پدم سنگھ کے پیروں پر گرپڑی۔ اور یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے،"میں اب آپ کی شرن میں ہوں۔ جو مناسب سمجھیے۔ وہ کیجیے۔ شرم، یاس، اور غم کا

اظہار ان سے بہتر لفظوں میں نہیں ہوسکتا تھا۔"

شانتا کے دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھ گیا۔ اب اسے اپنے مستقبل کی بابت کسی اندیشہ کی ضرورت نہ تھی۔ اسے کچھ دنوں کے لیے اپنی زندگی کا راستہ معین نظر آنے لگا۔ اس وقت اس کی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو اپنے جھونپڑے میں آگ لگ جانے سے اس لیے خوش ہو۔ کہ کچھ دیر کے لیے وہ تاریکی کے خوف سے آزاد ہوجائے گا۔

گیارہ بجے یہ لوگ آشرم میں داخل ہوئے۔ بٹھل داس اترے کہ جاکر سمن بائی کو خبردوں۔ پر دیکھا۔ تو وہ بخار سے بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ آشرم کی کئی عورتیں اس کی تیمارداری میں مصروف تھیں۔

کئی عورتوں نے شانتا کو گاڑی سے اتارا۔ شانتا آہستہ آہستہ صحن کے کمرہ میں گئی۔ اور اس کے سرہانے کھڑی ہوکر بولی، "بہن۔"

سُمن نے آنکھیں کھول دیں۔ شانتا مورت کی طرح کھڑی اپنی بہن کو دل سوز اور پُرآب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ یہ میری وہی پیاری بہن ہے۔ جس کے ساتھ میں تین چار سال قبل کھیلا کرتی تھی۔ وہ لمبے لمبے سیاہ گیسو کہاں ہیں؟ وہ کندن سا دمکتا ہوا رُخِ روشن کہاں ہے؟ وہ شوخ، مسکراتی، ہوئی آنکھیں کہاں غائب ہوگئیں۔ وہ اینگورسے بھرا ہوا جسم، وہ لبِ گلفام، وہ قدرِ رعنا، وہ نزاکت، وہ ملاحت کہاں گئیں؟ یہ سمن ہے یا اس کی لاش! شانتا کا دل درد اور پریم سے امڈ آیا۔ اس نے دوسری عورتوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ اور تب وہ روتی ہوئی سمن کے گلے سے لپٹ گئی، اور بولی۔ "بہن کیسی طبیعت ہے؟ تمھاری شانتی کھڑی ہے۔"

سمن نے آنکھیں کھولیں۔ اور شانتا کو وحشت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی، "کون شانتی؟ ہٹ جا۔ مجھے مت چھو۔ میں ابھاگنی ہوں، میں روسیاہ ہوں۔ تو دیوی ہے، تو پاک نفس ہے۔ میرے قریب مت آ۔ یہاں سے بھاگ جا۔"

یہ کہتے کہتے سمن پھر بے ہوش ہوگئی۔ شانتا ساری رات سمن کے پاس بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔

(۲۱)

شانتا کو آشرم میں آئے ایک ماہ سے زائد ہوگیا۔ لیکن پدم سنگھ نے ابھی تک اپنے

گھر میں کسی سے اس کا چرچا نہیں کیا۔ کبھی سوچتے۔ بھائی صاحب کو خط لکھوں۔ کبھی سوچتے چل کر ان سے خود کہوں۔ کبھی بٹھل داس کو بھیجنے کا خیال کرتے۔ لیکن کوئی قطعی رائے نہ قائم کرسکتے تھے۔

ادھر ان کے احباب اخراج کی تجویز کو بورڈ میں پیش کرنے کے لیے اصرار کررہے تھے۔ انھیں اس کی کامیابی کی پوری امید تھی۔ اندیشہ ہوتا تھا۔ کہ تاخیر سے کوئی نیا رخنہ نہ پیدا ہوجائے۔ پدم سنگھ ان لوگوں کو بھی ٹالتے آتے تھے۔ یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آگیا۔ اور اب بٹھل داس اور رومیش دت نے انھیں اتنا تنگ کیا۔ کہ انھیں مجبور ہوکر بورڈ میں باضابطہ طور پر اپنی تجویز کی اطلاع کرنی پڑی۔ دن اور وقت معین ہوگیا۔

جوں جوں دن قریب آتا جاتا تھا۔ پدم سنگھ کا انتشار قلب بڑھتا جاتاتھا۔ انھیں محسوس ہوتا تھا۔ کہ محض اس تجویز کے منظور ہوجانے سے مقصود نہ حاصل ہوگا۔ اُسے عملی صورت میں لانے کے لیے شہر کے جملہ معززین کی ہمدردی اور امداد کی ضرورت ہوگی۔ اسی لیے وہ حاجی ہاشم کو کسی نہ کسی طرح اپنے موافق حال بنانا چاہتے تھے۔ حاجی صاحب کا شہر میں اتنا دباؤ تھا۔ کہ ارباب نشاط بھی ان کی مرضی کی خلاف ورزی نہ کرسکتی تھیں۔ بالآخر حاجی صاحب بھی پگھل گئے۔ انھیں پدم سنگھ کی نیک نیتی پر یقین آگیا۔

آج بورڈ میں یہ تجویز پیش ہوگی۔ میونسپل کورٹ کے احاطہ میں بڑی بھیڑبھاڑ ہے۔ فوج حُسن نے خوب مسلح ہوکر اپنی پوری جمیعت سے بورڈ پر حملہ کیا ہے۔ دیکھیں بورڈ کی کیا حالت ہوتی ہے۔

بورڈ کی کاروائی شروع ہوگئی۔ جملہ اراکین جلوہ افروز ہیں۔ ڈاکٹر شیاماچرن نے پہاڑ پر جانا ملتوی کردیا۔ منشی ابوالوفا کو تو آج رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ کبھی اندر جاتے ہیں۔ کبھی باہر آتے ہیں۔ ان کا جوش اور انہاک آج اعتدال سے متجاوز ہوگیا ہے۔

پدم سنگھ نے اپنی تجویز پیش کی۔ اور تلے ہوئے الفاظ میں اس کی تصریح کی۔ یہ تین حصوں میں منقسم تھی۔

(۱) طوائفوں کو شہر کے مرکزی مقامات سے ہٹاکر بستی سے دور رکھا جائے۔

(۲) انھیں شہر کی خاص سیر گاہوں اور باغوں میں آنے کی ممانعت کی جائے۔

(۳) رقص کی مجلسوں پر ایک شدید ٹیکس لگایا جائے۔ اور ایسے جلسے کسی حالت میں

کھلے مقامات میں نہ کیے جائیں۔
پروفیسر رومیش دت نے اس تجویز کی تائید کی۔
سید شفقت علی نے فرمایا، ”مجھے اس تجویز سے اتفاق کلی ہے۔ لیکن بغیر مناسب ترمیم کے میں اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔ میری رائے ہے۔ کہ تجویز کے پہلے حصہ میں یہ الفاظ بڑھادیے جائیں۔ بہ استثنائے ان کے جو نو ماہ کے اندر اپنا نکاح کرلیں۔ یا کوئی ایسا ہنر سیکھ لیں۔ جس سے وہ جائز طریق پر اپنی زندگی بسر کریں۔“
کنور انردھ صاحب نے فرمایا، ”مجھے اس ترمیم سے کامل اتفاق ہے۔ ہمیں اس طبقہ کو قابل نفرت سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے یہ ہماری عین کج فہمی ہے۔ہم جو شب و روز رشوتیں لیتے ہیں۔ سود کھاتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ بیکسوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ ہرگز اس قابل نہیں ہیں۔ کہ جمہور کے کسی حصہ کو حقیر سمجھیں۔ سب سے ذلیل ہم ہیں۔ سب سے بڑے گنہگار بدکار۔ اور سیہ کار ہم ہیں۔ جو اپنے تئیں مہذب، ممتاز، منور اور مرقع سمجھتے ہیں۔ ہمارے مہذب برادران وطن ہی کی بدولت دال منڈی آباد ہے۔ چوک میں چہل پہل ہے۔ چکلوں میں رونق ہے۔ یہ مینا بازار ہمیں لوگوں نے سجایا ہے۔ یہ چڑیاں ہمیں لوگوں نے پھنسائی ہیں۔ یہ کٹھ پتلیاں ہمیں نے بنائی ہیں۔ جس قوم میں جابر زمیندار، رشوت خوار، عمال سرکار۔ خون آشام مہاجن اور خود غرض عزیز اور دوست اعزاز اور وقار کے قابل سمجھے جائیں۔ وہاں دال منڈی کیوں نہ آباد ہو۔ حرام کی دولت حرام کاری کے سوا اور کہاں جاسکتی ہے؟ جس دن نذرانہ، رشوت، سود درسود اور ناجائز منافعہ کا خاتمہ ہوگا۔ اسی روز دال منڈی ویران ہوجائے گی۔ وہ چڑیاں اڑجائیں گی۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں، خاص تجویز اس ترمیم کے بغیر نشتر کا وہ زخم ہے۔ جس پر مرہم نہیں۔ میں اسے قبول نہیں کرسکتا۔
پنڈت پربھاکر راؤ نے فرمایا، ”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس ترمیم کو اصل رزولیوشن سے کیا تعلق ہے۔ اسے آپ الگ ایک دوسری تجویز کی صورت میں پیش کرسکتے ہیں۔ اس طبقہ کی اصلاح کے لیے آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تمام تر قابل ستائش ہے۔ لیکن کام بستی سے ہٹ کر بھی اتنا ہی آسان یا مشکل ہے۔ جتنا شہر کے اندر۔ بلکہ باہر اس کا زیادہ سہل الحصول ہونا ممکن ہے۔“

منشی ابوالوفا بولے، ”مجھے اس ترمیم سے پورا اتفاق ہے۔“

منشی عبد اللطیف نے فرمایا، ”اس ترمیم کے بغیر تجویز ہرگز قابلِ پذیرائی نہیں۔“

دیناناتھ تیواری نے بھی ترمیم پر زور دیا۔

سید تیغ علی نے فرمایا،”اس ترمیم سے اصل تجویز کی منشا کے فوت ہونے کا احتمال ہے آپ تو ایک مکان کا صدر دروازہ بند کرکے عقب کی طرف ایک دوسرا دروازہ کھول رہے ہیں یہ غیر ممکن ہے۔ کہ وہ عورتیں جو اب تک عیش اور تکلف کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ مشقت اور مزدوری کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوجائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ اس ترمیم سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گی۔ کوئی اپنے بالاخانہ پر ”سنگر“ کی ایک مشین رکھ کر اپنا بچاؤ کرلے گی۔ کوئی موزے کی ایک مشین رکھ لے گی۔ کوئی پان کی دکان کھول لے گی۔ کوئی اپنے بالاخانہ پر سیب اور انار کے خوانچے سجادے گی۔ نقلی نکاحوں اور فرضی شادیوں کا بازار گرم ہوجائے گا۔ اور اس پردہ کی آڑ میں پہلے سے بھی زیادہ حرام کاریاں ہونے لگیں گی۔ اس ترمیم کو منظور کرنا انسانی خصلت سے بیگانگی کا اظہار کرنا ہے۔“

حکیم شہرت خان نے کہا، ”مجھے سید تیغ علی صاحب کے خیالات بجا معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے ان خبیث ہستیوں کو شہربدر کردینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر وہ جائز طریق پر زندگی بسر کرنا چاہیں۔ تو کافی اطمینان کے بعد انھیں امتحاناً شہر میں آباد ہونے کی اجازت دینی چاہیے۔ شہر کا دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ ترمیم سے اس تجویز کا مقصد غائب ہوجائے گا۔“

مسٹر شاکر بیگ نے فرمایا، ”ملکی معاملات میں مصلحت چاہے کتنی ہی قابلِ تعریف ہو۔ لیکن اخلاقی معاملات میں وہ سراسر قابلِ اعتراض ہے۔ اس سے اخلاقی مکروہات پر صرف پردہ پڑجاتا ہے ان کا ازالہ نہیں ہوتا۔“

پنڈت پدم سنگھ خاموش بیٹھے ہوئے اراکین کی موافق اور مخالف رائیں غور سے سن رہے تھے۔ سید شفقت علی کے طرزِ استدلال نے ان کے دل پر ایک خاص اثر کیا تھا۔ کنورصاحب کے پُرحقیقت الفاظ نے اس اثر کو اور بھی قوی کردیا تھا۔ انھیں فی الواقع یہ سراسر ظلم معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان عورتوں کو بے رحمی سے شہر کے باہر نکال دیاجائے۔ دیگر اصحاب نے اس ترمیم پر جو اعتراضات کیے۔ وہ ان کی نظروں میں بالکل نہ جنچے۔ وہ دیر تک

شش و پنچ میں رہنے کے بعد بولے، "چونکہ اس تجویز سے ہمارا منشا اس طبقہ کو تکلیف دینا نہیں۔ بلکہ ان کی اصلاح کرنا ہے۔ اس لیے مجھے اس ترمیم کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔"

صدر جلسہ نے ترمیم پر ممبروں کی رائے لی۔ آٹھ رائیں مخالف تھیں اور آٹھ موافق۔ سیٹھ بلبھدرداس نے اس کے موافق رائے دی ۔ ڈاکٹر شیاماچرن نے کسی طرف سے زبان نہیں کھولی۔ ترمیم پاس ہوگئی۔

تب اصل تجویز کے پہلے حصہ پر رائیں طلب کیں۔ ۹ موافق تھیں۔ اور آٹھ مخالف یہ حصہ منظور ہوگیا۔

پروفیسر رومیش دت، مسٹر رستم بھائی، اور پنڈت پربھاکر راؤ نے اس ترمیم کے منظور ہونے میں اپنی شکست سمجھی۔ اور پدم سنگھ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا انھوں نے دغا کی ہے۔

منشی ابوالوفا اور ان کے احباب ایسے خوش تھے۔ گویا ان کی فتح ہوئی۔ ان کی یہ مسرت پربھاکرراؤ اور ان کے حامیوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔

تجویز کے دوسرے حصہ پر رائے لی گئی ۔ پربھاکرراؤ اور ان کے حامیوں نے اب کے اس کی مخالفت کی۔ وہ پدم سنگھ کو انحراف کی سزا دینا چاہتے تھے۔ یہ حصہ نامنظور ہوگیا۔ منشی ابوالوفا اور ان کے احباب بغلیں بجانے لگے۔

اب تجویز کے تیسرے حصہ کی باری آئی۔ کنورصاحب نے اس کی تائید کی۔ حکیم شہرت خاں، سید شفقت علی، شریف حسین، اور شاکربیگ نے بھی اس سے موافقت ظاہر کی۔ لیکن پربھاکرراؤ اور ان کے احباب نے اس کی بھی مخالفت کی۔ ترمیم کے پاس ہوجانے کے بعد انھیں اب اس معاملہ میں اور سبھی کوششیں بے سود معلوم ہوتی تھیں۔ یہ تینوں اصحاب ان لوگوں میں تھے۔ جو'سب' یا کچھ 'نہیں' کے اصول پر چلتے ہیں۔ تجویز کا یہ حصہ بھی نامنظور ہوگیا۔

کچھ رات گئے جلسہ برخاست ہوا۔ جنھیں ہار کا خوف تھا۔ وہ ہنستے ہوئے نکلے۔ جنھیں جیت کا یقین تھا۔ ان کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

چلتے وقت کنورصاحب نے رستم بھائی سے کہا، "یہ آپ لوگوں نے کیا کردیا؟"

رستم بھائی نے طنز آمیز لہجہ میں کہا، "جو آپ نے کیا وہی ہم نے بھی کیا۔ آپ نے گھڑے میں سوراخ کردیا۔ ہم نے اسے پٹک دیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔"

سب لوگ چلے گئے۔ اندھیرا گہرا ہوگیا۔ چوکیدار اور مالی بھی پھاٹک بند کرکے چل دیے۔ لیکن پدم سنگھ وہیں گھاس پر مغموم اور متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔

(۲۲)

پدم سنگھ کا دل کسی طرح یہ تسلیم نہ کرتا تھا۔ کہ اس ترمیم کے قبول کرنے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی۔ انھیں مطلق گمان نہ تھا۔ کہ میرے احباب ایک فروعی بات پر مجھ سے ایسی مخالفت کریں گے۔ انھیں اپنی تجویز کے دو حصوں کے رد ہوجانے کا ملال نہ تھا۔ ملال یہ تھا۔ کہ اس کا الزام انھیں کے سر منڈھا جاتا تھا۔ حالانکہ انھیں یہ سراسر اپنے معاونین کی تنگ دلی اور ناعاقبت اندیشی معلوم ہوتی تھی۔ اس ترمیم کو وہ ابھی تک ضمنی ہی سمجھتے تھے۔ اس کے ناجائز استعمال کے متعلق جو اندیشے ظاہر کیے گئے۔ ان پر انھیں مطلق اعتماد نہ تھا۔ ان پر اب یہ روشن ہوتا جاتا تھا۔ کہ موجودہ طرزِ معاشرت کے ہوتے ہوئے اس تجویز سے جو امیدیں کی گئی تھیں۔ ان کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ کبھی کبھی پچھتاتے تھے۔ کہ میں نے ناحق یہ دردِ سر مول لیا۔ انھیں تعجب ہوتا تھا کہ میں کیوں کر اس خارستان میں الجھا۔ اگر اس تجویز کی بے اثری کی ساری ذمہ داری اس ترمیم کے سر جاپڑتی تو وہ اپنے تئیں ایک بارِ عظیم سے سبکدوش سمجھتے۔ پر یہ ہونے والی نہیں۔ اب ساری بدنامی مجھی پر آئے گی۔ مخالفین میرا ہی مضحکہ اڑائیں گے۔ میرے ہی طرزِ عمل پر نکتہ چینیاں کریں گے۔ اور یہ ساری رسوائی مجھے تنہا برداشت کرنی پڑے گی۔ کوئی میرا دوست نہیں۔ بٹھل داس سے امید تھی۔ کہ وہ میرے ساتھ انصاف کریں گے۔ میرے روٹھے ہوئے دوستوں کو منا لائیں گے۔ لیکن بٹھل داس نے الٹا مجھی کو خطاوار ٹھہرایا۔ پدم سنگھ کے حامیوں میں صرف کنورانردھ سنگھ ہی ایک ایسے آدمی تھے۔ جو ان کے دلِ پُر غم کو تسلی دیتے رہتے تھے۔

پورے مہینے بھر پدم سنگھ کچہری نہ جاسکے۔ بس تنہا افسردگی کی حالت میں بیٹھے ہوئے اسی خلجان میں پڑے رہتے تھے۔ ان کے خیالات میں اب ایک خاص رواداری پیدا ہوگئی تھی۔ دوستوں کی مخالفت سے انھیں یہ سبق ملتا تھا۔ کہ جب ایسے بیدار مغز ایسے

صاحب الرائے اشخاص ایک ذرا سی بات پر اپنے مسلمہ اصولوں سے منحرف ہوسکتے ہیں۔ تو اس قوم کا بیڑا پرماتما ہی پار لگائے۔ مانا کہ میں نے اس ترمیم کے قبول کرنے میں غلطی کی۔ جہالت کی، حماقت کی۔ لیکن میری حماقت نے انھیں کیوں کجروی پر مائل کیا؟

پدم سنگھ کو اس کوفت باطن کی حالت میں پہلی بار تجربہ ہوا۔ کہ عورت میں تشفی اور غمگساری کی کتنی طاقت ہے۔اس وقت اگر دنیا میں کوئی انسان تھا۔ جو ان کی حالت کو کامل طور پر سمجھتا ہو۔ تو وہ سبھدرا تھی۔ وہ اس ترمیم کو اس سے کہیں زیادہ ضروری سمجھتی تھی۔ جتنا وہ خود سمجھتے تھے۔ وہ ان کے مخالف دوستوں پر اس سے کہیں زیادہ حرف زنی کرتی تھی۔ جتنی وہ خود کرتے تھے۔ اس کی باتوں سے پدم سنگھ کو بڑی تقویت ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ سبھدرا میں ایسی دقیق باتوں کے سمجھنے اور تولنے کا مادہ نہیں ہے۔ اوروہ جو کچھ کہتی ہے۔ وہ میری ہی آوازِ بازگشت ہے۔ تاہم اس علم سے ان کی تقویت میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔

لیکن مہینہ پورا بھی نہ ہونے پایا تھا۔ کہ پنڈت پربھاکرراؤ نے اپنے اخبار میں اس معاملہ کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ نکالنا شروع کردیا۔ ان میں پدم سنگھ پر ایسی پُرمعنی چوٹیں ہوتی تھیں۔ کہ وہ پڑھ کر تلملا جاتے تھے۔ ایک مضمون میں حضرت نے پدم سنگھ کے گزشتہ سوانح اور ترمیم میں خاص تعلق ثابت کیا۔ ایک دوسرے مضمون میں ان کے طرزِ عمل پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا، ”یہ زمانہ حال کے خادمانِ قوم کی حالت ہے۔ جو قوم چاہے بھول جائیں۔ پر اپنے تئیں نہیں بھولتے۔ جو قومی خدمت کی آڑ میں اپنا شکار کیا کرتے ہیں۔ قوم کے نوجوان غار میں گریں تو گریں کاشی کے حاجی صاحب کی نظرِ شفقت رہنی چاہیے۔“ پدم سنگھ کو ان جھوٹے اتہام اور کنایوں پر جتنا غصہ آتا تھا۔ اتنا ہی تعجب بھی ہوتا تھا۔ کدورت اس حدتک جاسکتی ہے اس کا تجربہ انھیں اب ہوا۔ یہ حضرات شرافت اور تہذیب کے علم بردار بنتے ہیں۔ لیکن ان کا ظرف اتنا تنگ ہے۔ اور طرفہ یہ کہ کسی میں اتنی جرأت نہیں۔ کہ ان مضامین کی تردید کرے۔

شام کا وقت تھا۔ پدم سنگھ میز کے سامنے بیٹھے ہوئے اس مضمون کا جواب لکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ پر کچھ سوجھتا نہ تھا کہ کیا لکھیں۔ کہ اتنے میں سبھدرا نے آکر کہا، ”گرمی میں یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ چلوباہر بیٹھو۔“

پدم سنگھ ۔ پربھاکرراؤ نے آج مجھے خوب گالیاں دی ہیں۔ انھیں کا جواب لکھ رہا ہوں۔
سبھدرا ۔ یہ تمھارے پیچھے کیوں اس طرح پڑا ہواہے؟ یہ کہہ کر سبھدرا نے اخبار اٹھا لیا۔ اور پانچ منٹ میں اس مضمون کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔

پدم سنگھ نے پوچھا، ”کیسا مضمون ہے؟“

سبھدرا ۔ یہ کوئی مضمون تھوڑاہی ہے۔ یہ تو کھلم کھلا گالی ہے۔ میرا خیال تھا۔ کہ گالیوں کی لڑائی عورتوں ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن دیکھتی ہوں۔ تو مرد ہم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ عالم فاضل بھی ہوں گے؟

پدم سنگھ ۔ ان کے علم کی تھاہ پانی مشکل ہے۔ دنیا کا سارا علم ان کے قلم میں ہے۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ جس پر وہ رائے زنی نہ کرسکتے ہوں۔

سبھدرا ۔ اور اس پر یہ حال!

پدم سنگھ۔ میں اس کا جواب لکھ رہاہوں۔ ایسی خبرلوں۔ کہ وہ بھی یاد کریں کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔

سبھدرا ۔ مگر گالیوں کا جواب کیا ہوگا؟

پدم سنگھ۔ گالیاں۔

سبھدرا۔ نہیں گالیوں کا جواب خموشی ہے۔ گالیوں کا جواب گالی تو جاہل بھی دیتے ہیں۔ پھر ان میں اور تم میں فرق ہی کیا رہا۔

پدم سنگھ نے سبھدرا کو نگاہِ عقیدت سے دیکھا۔ اس کی بات ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی ہمیں ان لوگوں سے بھی نصیحتیں ملتی ہیں۔ جنھیں ہم اپنے غرور میں کم بین سمجھتے ہیں۔ بولے، ”چپ سادھ لوں؟“

سبھدرا ۔ میری تو یہی صلاح ہے اُسے جو جی میں آئے بکنے دو۔ کبھی نہ کبھی وہ ضرور شرمندہ ہوگا۔ بس وہی ان گالیوں کی سزا ہوگی۔

پدم سنگھ۔ وہ شرمندہ کبھی نہ ہوگا۔ یہ لوگ شرم کا مرض نہیں پالتے۔ ابھی میں ان کے پاس جاؤں تو میری بڑی خاطر کریں گے۔ ہنس ہنس کر باتیں کریں گے۔ لیکن شام ہوتے ہی۔ پھر ان پر گالیوں کا نشہ سوار ہوجائے گا۔

سبھدرا ۔ تو کیا ان کا کام دوسروں کی مذمت کرنا ہے؟

پدم سنگھ ۔ نہیں کام تو یہ نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے خریداروں کی تفریح کے لیے اس قسم کا ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ ایسے سوقیانہ مضامین سے خریداروں کی تعداد میں خوب اضافہ ہوتا ہے۔ پبلک کو ایسے جھگڑوں میں خاص مزہ آتا ہے۔ اور اڈیٹر صاحبان اپنے اعلیٰ فرائض کو بھول کر پبلک کی اس نزاع پسند میلان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیشوائی کے اعلیٰ رتبہ سے گر کر مخلوق کی بدمذاقیوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ بعض اصحاب تو یہاں تک کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ کہ خریداروں کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم ان کا کھاتے ہیں۔ تو انھیں کا گائیں گے۔

سبھدرا ۔ تب تو یہ لوگ محض پیسے کے غلام ہیں۔ ان پر غصہ کے بجائے رحم کرنا چاہیے۔

پدم سنگھ میز پر سے اٹھ آئے۔ جواب لکھنے کا خیال ترک کردیا۔ وہ سبھدرا کو اس قدر فرلیس نہ سمجھتے تھے۔ انھیں آج تجربہ ہوا۔ کہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے باوجود میں فیاضی طبع میں اس تک نہیں پہنچتا۔ یہ ناخواندہ ہوکر بھی مجھ سے کہیں زیادہ بیدارمغز ہے۔ انھیں آج معلوم ہوا۔ کہ عورت بے اولاد ہوکر بھی شوہر کے لیے اطمینان اور راحتِ دل کا ایک چشمہ ہے۔ سبھدرا نے آج ان کے دل میں ایک نئے جذبۂ الفت کو جگایا۔ ایک مہر آہنی جس نے برسوں کی جمی ہوئی کدورت کو صاف کردیا۔ انھوں نے اسے خلوص اور احسان مندی کی نظروں سے دیکھا۔ سبھدرا یہ رمز سمجھ گئی اور اس کا دل مسرت سے سرشار ہوگیا۔

(۲۳)

سدن جب سمن کو دیکھ کر لوٹا۔ تو اس کی حالت اس غریب آدمی کی سی تھی۔ جس کی برسوں کی جمع کی ہوئی بساط چوروں نے اڑالی ہو۔

وہ سوچتا تھا۔ سمن مجھ سے بولی کیوں نہیں؟ اس نے میری طرف تاکا کیوں نہیں؟ کیا وہ مجھے اتنا قابلِ نفرت سمجھتی ہے؟ نہیں غالباً وہ اپنی پچھلی باتوں پر شرمندہ ہے۔ اور مجھے بھول جانا چاہتی ہے۔ ممکن ہے اُسے میری شادی کی خبر مل گئی ہو۔ اور وہ مجھے بے انصاف بے رحم سمجھ رہی ہو۔ اسے ایک بار پھر سمن سے ملاقات کرنے کی پُرزور خواہش ہوئی۔ دوسرے دن وہ بدھوا آشرم کے گھاٹ کی طرف چلا۔ لیکن آدھے راستہ سے لوٹ آیا۔ اُسے خوف ہوا کہ کہیں شانتا کا ذکر آگیا۔ تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اسے سوامی گجانند کی تنبیہ کا بھی خیال آگیا۔

سدن اب کبھی کبھی شانتا کے متعلق اپنے فرائض پر غور کیا کرتا۔ مہینوں تک تمدنی مسائل پر تقریریں سننے کا اس پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ وہ دل میں یہ تسلیم کرنے لگا تھا۔ کہ ہم لوگوں نے شانتا کے ساتھ ضرور بے انصافی کی ہے۔ مگر ابھی تک اس میں وہ قوت عمل نہ پیدا ہوئی تھی۔ جو بدنامی کو حقیر سمجھتی ہے۔ اور ضمیر کی آواز کے سامنے کسی کی پروا نہیں کرتی۔

ان دنوں اسے کتب بینی اور مطالعہ سے خاص ذوق ہوگیا تھا۔ دال منڈی اور چوک کی سیر سے نفور۔ اس کے منچلے پن نے یہ نئی صورت اختیار کی تھی۔ آریہ سماج کے جلسوں میں اس نے ایسی کئی تقریریں سنی تھیں۔ جس میں تہذیب نفس کی اہمیت ظاہر کی گئی تھی۔ اس کا یہ خیال مٹنے لگا تھا۔ کہ مجھے جو کچھ ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہو چکا، وہاں اسے بتلایا گیا تھا۔ کہ حصول علم تہذیب نفس کی دلیل نہیں۔ تہذیب کے مقابلہ میں علم ...... کی وقعت بہت کم ہے۔ اسی دن سے سدن اخلاقی تصانیف کا گرویدہ ہوگیا۔ اور روز بروز اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے اب تجربہ ہونے لگا تھا کہ میں کتابی علم کے بغیر بھی دنیا میں کچھ کام کرسکتا ہوں۔ ان تصانیف میں خواہشات کو زیر کرنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے جو ہدایتیں کی گئی تھیں۔ انھیں وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بھولتا تھا۔

وہ میونسپل بورڈ کے اس جلسہ میں موجود تھا۔ جس میں اخراج کی تجویز پیش تھی۔ اس ترمیم کو وہ نہایت مضر خیال کرتا تھا۔ اور اپنے چچا کی غلطی کو تسلیم کرتا تھا۔ لیکن جب پربھاکرراؤ نے پدم سنگھ پر اعتراضات کی بوچھار شروع کی۔ تو وہ بے اختیار ان کی حمایت پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے دو تین مضامین لکھے۔ اور ڈاک کی معرفت پربھاکرراؤ کے پاس بھیجے۔ کئی دن تک ان کے شائع ہونے کی امید کرتا رہا۔ اسے یقین تھا۔ کہ ان مضامین کے چھپتے ہی ایک شور برپا ہوجائے گا۔ دنیا میں شاید کوئی انقلاب آجائے گا۔ جونہی ڈاکیہ اخبار لاتا۔ وہ اپنے مضامین کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا۔ لیکن ان کے بجائے اسے وہی دلآزار مذمت آمیز مضامین نظر آتے۔ انھیں پڑھ کر اس کے دل میں آگ سی جلنے لگتی تھی۔ لیکن آخری مضمون کو پڑھ کر اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اس نے ارادہ کیا۔ کہ اب چاہے جو کچھ ہو۔ اڈیٹر صاحب کی خبر لینی چاہیے۔ اگر ان میں شرافت ہوتی۔ تو وہ میرے مضامین کو ضرور چھاپتے۔ زبان غلط ہی سہی۔ لیکن مضامین دلیلوں سے خالی نہ تھے۔ انھیں چھپا رکھنے سے

صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ حضرات واجب و ناواجب کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔ صرف عوام کو خوش رکھنے کے لیے کذب و افترا سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے اپنے خیالات کسی سے ظاہر نہیں کیے۔

شام کے وقت ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر 'جگت' کے دفتر جا پہنچا۔ دفتر بند ہوچکا تھا۔ لیکن پنڈت پربھاکرراؤ اپنے گوشۂ ادارت میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ سدن بے دھڑک اندر جاکر ان کے روبرو کھڑا ہوگیا۔ پربھاکرراؤ نے سر اُٹھایا۔ تو ایک قوی ہیکل نوجوان کو ڈنڈا لیے کھڑے دیکھا۔ غصہ سے بولے، "آپ کون ہیں۔"

سدن ۔ میرا مکان یہیں ہے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ اتنے دنوں سے پنڈت پدم سنگھ کو گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟

پربھاکرراؤ۔ اچھا۔ آپ ہی نے دوتین مضامین میرے پاس بھیجے تھے؟

سدن۔ جی ہاں میں نے ہی بھیجے تھے۔

پربھاکرراؤ ۔ تو ان کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آیئے تشریف رکھیے۔ میں تو آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن آپ کا پتہ نہ معلوم تھا۔ آپ کے مضامین نہایت محققانہ اور مدلل ہیں۔ میں انھیں کبھی کا چھاپ دیتا۔ لیکن گمنام مضامین شائع کرنا اصول کے خلاف ہے اس لیے مجبور تھا۔ اسم شریف؟

سدن نے اپنا نام بتلایا۔ اس کا غصہ فرو ہورہا تھا۔

پربھاکر۔ آپ شرماجی کے بڑے معتقد ہیں۔

سدن۔ میں ان کا بھتیجا ہوں۔

پربھاکر۔ اچھا! تب تو آپ گھر ہی کے آدمی ہیں۔ کہیے شرماجی کا مزاج تو اچھا ہے۔ وہ ادھر عرصے سے نہیں آئے۔

سدن۔ ابھی تو بخیریت ہیں۔ لیکن آپ کے مضامین کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ تو خبر نہیں ان کی کیا حالت ہو۔ آپ ان کے خیرخواہ اور معاون ہوکر اتنے بدظن کیوں کر ہوگئے؟

پربھاکر۔ بدظن ہوگیا! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں ان سے ذرہ بھر بھی بدظن نہیں ہوں۔ آپ ہم ایڈیٹروں کے فرائض سے غالبًا واقف نہیں ہیں۔ ہم عوام کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھنا ہمارے طرزِ عمل کے خلاف

ہے۔ ہم نہ کسی کے دوست ہیں۔ اور نہ کسی کے دشمن۔ ہم قومی معاملات میں کسی کی غلطیوں کو معاف نہیں کرسکتے۔ اسی لیے کہ ایسا کرنے سے ان غلطیوں کا اثر اور بھی مضرت ناک ہوجاتا ہے۔ پدم سنگھ میرے خاص دوست ہیں۔ اور میں دل سے ان کی عزت کرتا ہوں۔ مجھے ان سے صرف اصولی اختلاف تھا۔ لیکن پرسوں ہی مجھے ایسے ثبوت ہاتھ آئے ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس ترمیم کے قبول کرنے میں ان کی کوئی اور غرض بھی مخفی تھی۔ آپ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کہ کئی ماہ ہوئے انھوں نے سمن بائی نام کی ایک بازاری عورت کو بدھوا آشرم میں خفیہ طور پر داخل کردیا۔ اور تقریباً ایک ماہ سے اس کی چھوٹی بہن کو بھی اسی آشرم میں ٹھہرا رکھا ہے۔ میرا دل اب بھی چاہتا ہے۔ کہ یہ خبر غلط ہو۔ لیکن میں بہت جلد کسی اور نیت سے نہیں، تو محض اس کی تردید کرانے کے لیے اس خبر کو شائع کردوں گا۔

سدن ۔ یہ باتیں آپ سے کس نے کہیں؟

پربھاکرراؤ ۔ یہ میں نہیں بتلا سکتا۔ لیکن آپ شرماجی سے کہہ دیجیے گا۔ کہ اگر یہ بے جا اتہام ہوں۔ تو مجھے آگاہ کردیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہواہے۔ کہ اس تجویز کے بورڈ میں آنے سے پہلے شرماجی روزانہ حاجی ہاشم سے ملنے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔ کہ میں ان کی نیت کو کہاں تک صاف سمجھ سکتاہوں۔

سدن کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ پربھاکرراؤ کی باتوں نے اُسے رام کرلیا۔ وہ دل میں ان کا معتقد ہوگیا۔ اور کچھ اِدھراُدھر کی باتیں کرکے لوٹ آیا۔ اسے اب سب سے بڑی فکر یہ تھی۔ کہ کیا شانتا سچ مچ آشرم میں لائی گئی ہے۔

رات کو کھانا کھاتے وقت اس نے بہت چاہا۔ کہ شرماجی سے اس امر کے متعلق کچھ گفتگو کروں۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ وہ ساری رات مضطرب اور پریشان رہا۔ شانتا آشرم میں کیوں آئی ہے؟ چچا صاحب نے اُسے یہاں کیوں بلایا ہے؟ کیا اما ناتھ نے اُسے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کیا۔ اسی قسم کے سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ علی الصباح وہ بدھوا آشرم کے گھاٹ کی طرف چلا۔ کہ اگر سمن سے ملاقات ہوجائے تو اس سے ساری حقیقت دریافت کروں۔ اسے گھاٹ پر بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ سمن آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے ایک اور عورت سرجھکائے چلی آتی تھی۔ اس کے چہرہ پر گھونگٹ

پڑا ہوا تھا۔

سدن کو دیکھتے ہی سمن ٹھٹھک گئی۔ وہ ادھر کئی دنوں سے سدن سے ملنا چاہتی تھی۔ اگرچہ پہلے اس نے اپنے دل میں تہیہ کرلیاتھا۔ کہ سدن سے کبھی نہ بولوں گی۔ پر اب شانتا کی خاطر اس عہد کو قائم رکھنا محال تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے۔ سدن سے کہا، "سدن سنگھ آج بڑے نصیبوں سے تمھارے درشن ہوئے۔ تم نے تو ادھر آناہی چھوڑدیا۔ خیریت سے تو ہو؟"

سدن جھپتا ہوا بولا، "ہاں سب خیریت ہے۔"

سمن۔ دبلے بہت نظر آتے ہو۔ بیمار تھے کیا؟

سدن ۔ نہیں بہت اچھی طرح ہوں۔ مجھے موت کہاں؟

ہم اکثر اپنی خفت مٹانے کے لیے مصنوعی جذبات کی آڑ لیاکرتے ہیں۔ تاکہ ہمارے حال پر دوسروں کو ترس آئے۔

سمن۔ چپ رہو کیسا اشگون زبان سے نکالتے ہو۔ بھلا میں مرنے کو مناتی تو ایک بات تھی۔ جس کے کارن یہ سب ہورہا ہے۔ سدن میں سچ کہتی ہوں۔ اس رام لیلا کی کیکئی میں ہی ہوں۔ خود بھی اپنے ساتھ لے ڈوبی۔ کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ مجھے آج تم سے بہت باتیں کہنی ہیں معاف کرنا۔ اب میں تمھیں بھیا کہوں گی۔ اب میرا تم سے بھائی بہن کا ناتا ہے۔ میں تمھاری بڑی سالی ہوں۔ اگر کوئی کڑی بات، منہ سے نکل جائے۔ تو بُرا مت ماننا۔ میرا حال تو تمھیں معلوم ہی ہوگا۔ تمھارے چچا صاحب نے اس عذاب سے مجھے رہائی دی۔ اور اب میں آشرم میں پڑی اپنے برے دنوں کو روتی ہوں۔ اور سدا روؤں گی۔ ادھر ایک ماہ سے میری بدنصیب بہن بھی یہاں آگئی ہے۔ اماناتھ کے گھر اس کا نباہ نہ ہوسکا۔ شرماجی کو پرماتما ہمیشہ خوش رکھے۔ وہ خود امولا گئے۔ اور اُسے ساتھ لے آئے۔ لیکن یہاں لاکر انھوں نے بھی اسے بھلادیا۔ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ بھلا یہ کہاں کا دستور ہے۔ کہ ایک بھائی چوری کرے۔ اور دوسرا پکڑا جائے، سزا پائے؟ اب تم سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ اپنے کھوٹے نصیب سے، دنوں کے پھیرے، اپنے پہلے جنم کے پاپوں سے مجھ ابھاگنی نے دھرم کا راستہ چھوڑدیا۔ اس کی سزا مجھے ملنا چاہیے تھی۔ اور وہ ملی۔ لیکن اس غریب نے کیا خطا کی تھی۔ جس کے لیے تم لوگوں نے اسے ترک کردیا؟ اس کا جواب تمھیں دینا پڑے گا۔

دیکھو۔ بزرگوں کی آڑ مت لینا۔ یہ کم ہمت آدمیوں کی عادت ہے۔ سچے دل سے بتلاؤ۔ یہ ظلم تھا یا نہیں؟ اور تم نے کیوں کر اس ظلم کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے دیا؟ کیا تمھیں ایک بیکس لڑکی کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے خراب کرتے ہوئے ذرا بھی افسوس نہ ہوا؟

اگر شانتا وہاں نہ ہوتی۔ تو شاید سدن اس وقت دل کی باتیں زبان سے نکالنے کی جرأت کرجاتا۔ وہ اس ظلم کو قبول کرلیتا۔ لیکن شانتا کے روبرو وہ یکایک اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ ہوسکا۔ اس کے ساتھ ہی خاندانی وقار کا سہارا لیتے ہوئے بھی اسے شرم آتی تھی۔ وہ منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالنا چاہتا تھا۔ جس سے شانتا کو ملال ہو۔ اس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات بھی نہ کرسکتا تھا۔ جو جھوٹی امیدیں پیدا کرے۔ اس کی اُڑتی ہوئی نگاہ نے ،جو شانتا پر پڑی تھی۔ اسے دبدھے میں ڈال دیاتھا۔ اس کی حالت اس لڑکے کی سی تھی۔ جو کسی مہمان کی لائی ہوئی شیرینی کو للچائی نظروں سے دیکھتا ہے۔ مگر ماں کے خوف سے نکال کر کھا نہیں سکتا۔ بولا،" بائی جی۔ آپ نے پہلے ہی میرا منہ بند کردیا ہے۔ اس لیے کیسے کہوں۔ کہ جو کچھ کیا وہ میرے بزرگوں نے کیا۔ میں ان کے سر الزام رکھ کر اپنا گلا چھڑانا نہیں چاہتا۔ اس وقت بدنامی سے میں بھی ڈرتا تھا۔ اتنا تو آپ بھی مانیں گی۔ کہ دنیا میں رہ کر دنیا کی چال چلنی پڑتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں۔ کہ جبر ہواہے۔ لیکن یہ جبر ہم نے نہیں کیا۔ وہ اس سماج نے کیا ہے۔ جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔"

سمن۔ بھیا تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ میں تم سے باتوں میں نہیں پیش پاسکتی۔ جو تمھیں مناسب معلوم ہو۔ وہ کرو۔ ظلم ظلم ہی ہے۔ چاہے کوئی ایک آدمی کرے۔ یا ساری ذات کرے۔ دوسروں کے خوف سے کسی پر ستم ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ شانتا یہاں کھڑی ہے۔ اس لیے میں اس کا رازِ دل نہیں کھولنا چاہتی لیکن اتنا ضرور کہوں گی۔دوسری جگہ تمھیں چاہے دولت، حسن، اور عزت مل جائے۔ پر یہ پریم نہ ملے گا۔ اگر تمھارا ہی جیسا اس کا دل بھی ہوتا۔ تو یہ آج اپنی نئی سسرال میں آرام سے بیٹھی ہوتی لیکن صرف تمھاری محبت نے اسے یہاں کھینچا۔ تم اسے جو جی چاہے کہو۔ وہ عمر بھر تمھارے نام پر بیٹھی رہے گی۔

سدن نے دیکھا۔ کہ شانتا کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے پیروں پر گررہے ہیں۔ اس کا قلب تشنہ درد سے بیتاب ہوگیا۔ نہایت بیکسانہ انداز سے بولا،" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ایشور جانتا ہے۔ کہ مجھے کتنا صدمہ ہے!"

سمن۔ تم مرد ہو۔ سب کچھ کرسکتے ہو۔

سدن۔ مجھ سے جو کچھ کہیے کرنے کو تیار ہوں۔

سمن۔ وعدہ کرتے ہو؟

سدن۔ میرے دل کی جو حالت ہورہی ہے۔ وہ دل جانتا ہے۔ زبان سے کیا کہوں؟

سمن۔ مردوں کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ سدن نے شرمندہ ہوکر کہا، ''اگر اپنے قابو کی بات ہوتی۔ تو اپنا دل نکال کر آپ کو دکھا دیتا۔''

سمن۔ اچھا تو آپ اسی گنگا کے کنارے شانتا کا ہاتھ پکڑ کر کہیے۔ کہ تم میری ہو۔ اور میں تمھارا شوہر ہوں۔ میں ہمیشہ تمھاری حفاظت اور پرورش کروں گا۔

سدن کی اخلاقی جرأت نے جواب دے دیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ گویا اپنا منہ چھپانے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ گنگا مجھے نگلنے کے لیے بڑھی چلی آتی ہیں۔ اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح آسمان کی طرف دیکھا، اور دل میں اپنی بے غیرتی کو محسوس کرتا ہوا رُک رُک کر بولا، ''سمن مجھے اس کے لیے سوچنے کا موقع دو۔''

سمن نے ملائمت سے کہا، ''ہاں خوب سوچ لو۔ کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ میں تمھیں دھرم سنکٹ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔''

یہ کہہ کر وہ شانتا سے بولی۔ ''دیکھ تیرا شوہر تیرے سامنے کھڑا ہے۔ مجھ سے جو کچھ کہتے سنتے بنا۔ وہ میں نے کہا سنا۔ لیکن وہ نہیں پسیجتا۔ وہ اب سدا کے لیے تیرے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہے اور اس میں کچھ طاقت ہے تو اسے روک لے۔ اور اس سے یہ عہد کرالے۔''

یہ کہہ کر سمن گنگا کی طرف چلی۔ شانتا بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ اس کی محبت کو غرور نے زیر کردیا۔ جس کے نام پر وہ تازیست مصیبتیں جھیلنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ جس کے قدموں پر وہ دل میں اپنے تئیں نثار کرچکی تھی۔ اسی سے وہ اس وقت تن بیٹھی۔ اس نے اس کی حالت کو نہ دیکھا۔ اس کی مشکلات پر غور نہ کیا۔ یہ نہ سوچا کہ ابھی وہ اپنا مالک نہیں۔ دوسروں کا محتاج ہے۔ اس وقت اگر وہ سدن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوجاتی۔ تو یقیناً اس کی مراد برآتیں۔ سدن اتنا سنگ دل نہ تھا۔ لیکن اس

نے التجا کی بہ نسبت غرور کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

سدن ایک لمحہ وہاں کھڑا رہا۔ اور تب بادلِ مجروح گھر کی طرف چلا۔

(۲۴)

سدن دل میں ایسا شرمندہ تھا۔ گویا اس سے کوئی بڑا بھاری گناہ ہوگیا ہو۔ وہ باربار اپنے الفاظ کو یاد کرتا اور اسی نتیجہ پر پہنچتا کہ میں بڑا بے رحم ہوں۔ دردِ محبت نے اُسے وارفتہ بنادیا تھا۔وہ سوچتا تھا۔ مجھے دنیا کا اتنا خوف کیوں ہے؟ دنیا مجھے کیا دے دیتی ہے؟ کیا محض جھوٹی بدنامی کے خوف سے میں اس نعمت سے دست بردار ہوجاؤں۔ جو معلوم نہیں میرے پہلے جنم کے کتنے نیک کاموں کا ثمرہ ہے۔ اس دولت کو ترک کردوں۔ جو مجھے ساری دنیا کی نعمتوں سے مستغنیٰ بناسکتی ہے۔ اگر راہِ راست پر چلنے کے لیے میرے عزیز اور یگانے مجھے چھوڑدیں۔ تو کیا پرواہ؟ بدنامی کا خوف اس لیے ہے کہ وہ ہمیں برے کاموں سے بچاتا ہے۔ اگر وہ راہِ فرض میں جارہی ہو۔ تو اس سے ڈرنا بزدلی ہے۔ اگر ہم کسی بے گناہ پر جھوٹا مقدمہ چلائیں۔ تو دنیا ہمیں بدنام نہیں کرتی۔ وہ اس کام میں ہماری مدد کرتی ہے۔ ہم کو گواہ اور وکیل دیتی ہے۔ ہم کسی کا روپیہ ہضم کرجائیں۔ کسی کی جائداد دبا بیٹھیں۔ تو دنیا ہم کو کوئی سزا نہیں دیتی۔ یا دیتی بھی ہے۔ تو بہت خفیف۔ لیکن ایسے کام کے لیے جس میں گناہ کا شائبا بھی نہیں۔ وہ ہم کو بدنام کرتی ہے۔ ہمارے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگا دیتی ہے۔ ہم کو زندہ درگور کردیتی ہے۔ دنیا اور زبانِ خلق کے خوف سے میں اسے ترک کردوں۔ اسے منجدھار میں ڈوبنے دوں؟ نہیں دنیا جو چاہے کہے۔ مجھ سے یہ ظلم نہ ہوگا۔

میں مانتا ہوں۔ کہ ماں باپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ انھوں نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میری پرورش کی ہے۔ باپ کی گود میں کھیلا ہوں۔ ماں کا خونِ جگر پی کر پلا ہوں۔ میں ان کے اشارے پر زہر کا پیالہ پی سکتا ہوں۔ تلوار کی دھار پر چل سکتا ہوں۔ شعلوں میں کود سکتا ہوں۔ لیکن ان کی ضد یا اصرار پر میرا ہاتھ ایک بے گناہ عورت پر نہ اٹھے گا۔ نہ کہ اس عورت پر جس کے نباہ کا میں نے عہد کیا ہے۔ والدین مجھ سے ضرور ناراض ہوجائیں گے۔ ممکن ہے مجھے ترک کردیں۔ مجھے مردہ سمجھ لیں۔ لیکن کچھ دنوں کے غصہ و غم کے بعد انھیں تسکین ہوجائے گی۔ وہ مجھے بھول جائیں گے۔ زمانہ ان کے زخم کو بھر دے گا۔

آہ میں کتنا سنگ دل ہوں۔ وہ نازنین جو کسی رنواس کا سنگار بن سکتی ہے۔ وہ حسینہ جو تنویر صبح کی طرح سرورانگیز اور شفق کی طرح شگفتہ ہو۔ میرے روبرو ایک بیکس فریادی کی طرح سر جھکائے کھڑی رہے۔ اور میں ذرا بھی نہ پسیجوں! وہ ایسا موقع تھا۔ کہ میں اس کے پیروں پر سر رکھ دیتا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہتا،"دیوی میری خطا معاف کرو۔" گنگا سے گنگا جل لاتا۔ اور اس کے پیروں پر چڑھاتا۔ پر میں پتھر کی مورت کی طرح کھڑا اپنے خاندانی اعزاز کا بے سُرا راگ الاپتا رہا۔ وائے نصیب! میری ان یاوہ گوئیوں سے ان کی طبع نازک کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا ثبوت اس کی بے نیازی ہے۔ اس نے مجھے خشک، بے مہر، متکبر، دغاباز سمجھا ہوگا۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ واقعی میں اسی قابل ہوں!

یہ تاسف انگیز خیالات کئی دن تک سدن کے دل کو پامال کرتے رہے۔ آخر اس نے فیصلہ کیا۔ کہ مجھے اپنا جھونپڑا الگ بنانا چاہیے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نباہ ہونا مشکل ہے۔ والدین کے گھر کا دروازہ میرے لیے بند ہے۔ شاید کھٹکھٹانے سے بھی نہ کھلے۔ چچا صاحب مجھے شوق سے لیں گے۔ لیکن ان کے یہاں رہ کر گھر میں بیر کا بیج بونا اچھا نہیں۔ بس میرے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ کہ اپنی کھچڑی الگ پکاؤں۔

وہ روز ارادہ کرتا۔ کہ چل کر عذر تقصیر کر آؤں۔ لیکن چلنے کے وقت ہمت جواب دے دیتی۔ دل میں سوال اٹھتا۔ کس بوتے پر؟ گھر کہاں ہے؟

یہ کاوش غم محبت کی خلش سے کم نہ تھی۔ وہ ہر دم اسی فکر میں ڈوبا رہتا کہ کیوں کر اس عقدہ کو حل کروں۔ لیکن عقل کچھ کام نہ کرتی۔ اس نے سارے شہر کی خاک چھان ڈالی۔ کبھی دفتروں کی طرف جاتا۔ کبھی بڑے بڑے کارخانوں کے چکر لگاتا۔ اور دوچار گھنٹے گھوم کر لوٹ آتا۔ اس روزانہ دوادوش کے باوجود منزل مقصود کا سواد بھی نہ نظر آتا تھا۔ اب تک اس کی زندگی بے فکری اور لااُبالی میں گزری تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی متکبرانہ بے نیازی تھی۔ عرض حال کے لیے اس کے لبوں نے کھلنا نہ سیکھا تھا۔ التجا اور منت سے اس کی طبیعت بیگانہ تھی۔ وہ نہ جانتا تھا۔ کہ دنیا کی بارگاہ میں بہت سر جھکانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اسی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ جو پتھر کے بے رحم آستانوں پر ماتھا رگڑنا جانتا ہے۔ جو اپنی ساری دعاؤں کو صرف دربان کرسکتا ہے۔ جو جفاکش ہے۔ جاں نثار

ہے۔ باہر ہے۔ منکسر ہے۔ علیم ہے۔ جس نے کسی سنیاسی کی طرح غصہ کو جیت لیا ہے۔ جو گوشمالیوں کو احسان سمجھتا ہے۔ ذلت کو دودھ کی طرح پی جاتا ہے۔ اور جس نے غیرت کو پیروں تلے کچل ڈالا ہے۔ اس دربار میں وہی سرخرو اور کارگزار ہے۔ جو بے زبان ہے، بے دلیل ہے، بے عذر ہے، اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہی اوصاف جو فرشتوں سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اس دربار میں بے وقعت ہیں۔ وہ ایماندار تھا، راست گو تھا۔ بے لوث تھا۔ آزاد تھا۔ جو بات کہتا منہ پر۔ لگی لپٹی رکھنا نہ جانتا تھا۔ پر اسے خبر نہ تھی۔ کہ ان اوصاف کی اخلاقی وقعت چاہے جو کچھ ہو۔ دنیا کی نگاہ میں سند اور سفارش کی وقعت ان سے کہیں زیادہ ہے۔ سدن کو اب بہت افسوس ہوتا۔ کہ میں نے ناحق اپنی عمر تلف کی۔ کوئی ایسا ہنر نہ سیکھا۔ جس سے کسب معاش کرسکتا۔ اس طرح کوچہ گردی کرتے کرتے ایک مہینہ گزرگیا۔ اور کاربر آری کی صورت نہ پیدا ہوئی۔

اس مایوسی نے رفتہ رفتہ اس میں بے زاری کا جذبہ پیدا کیا۔ اسے اپنے والدین پر۔ اپنے چچا پر۔ دنیا پر۔ اور اپنے آپ پر غصہ آتا۔ اسے ارباب ثروت و اختیار سے ایک بغض للہ سا ہوگیا۔ ابھی چندروز قبل وہ خود فٹن پر سیر کرنے نکلتا تھا۔ لیکن اب کسی کو فٹن پر آتے دیکھ کر اس کا خون ابلنے لگتا۔ وہ کسی فیشن ایبل آدمی کو پیدل چلتے دیکھتا۔ تو خواہ مخواہ اس سے شانہ ملاکر چلتا۔ اور منتظر رہتا۔ کہ یہ ذرا بھی زبان ہلائے۔ تو اس کی خبر لوں۔ بسا اوقات وہ کوچبانوں کی چیخ پکار کی بھی پروا نہ کرتا۔ چھیڑ چھیڑ کر لڑنا چاہتا۔ یہ لوگ بن ٹھن کر ہوا خوری کرنے جاتے ہیں۔ میں ان کا غلام ہوں کہ انھیں راستہ دیتا رہوں!

گھر پر معقول جائداد ہونے کے باعث سدن کو فکرمعاش نے کبھی نہ ستایا تھا۔ والدین نے بھی اس لیے اس کی تعلیم ضروری نہ سمجھی تھی۔ پر اب دفعتاً جو یہ مسئلہ اس کے سامنے آیا۔ تو اسے معلوم ہوا۔ کہ میں اسے حل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ اس نے انگریزی نہ پڑھی تھی۔ پر ادھر اس نے اردو ہندی کی کافی استعداد حاصل کرلی تھی۔ وہ مہذب طبقہ کو قومی زبانوں سے انس نہ رکھنے کے باعث ملک اور قوم کا دشمن سمجھتا تھا۔ جب سے اس کے مضامین "جگت" میں شائع ہوئے تھے۔ وہ انگریزی خوان فرقہ کو متکبرانہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ یہ سب کے سب غرض کے غلام ہیں۔ انھوں نے محض غریبوں

کو ٹھگنے کے لیے محض اپنا پیٹ پالنے کے لیے۔ انگریزی پڑھی ہے۔ کوئی وکیل بنا پھرتا ہے کوئی ہیٹ کالر لگائے گھومتا ہے۔ سب کے سب قوم کا خون چوسنے والے ہیں۔ اس پر قوم کے پیشوا بننے کا دعویٰ۔ سب فیشن کے غلام ہیں۔ جن کی تعلیم نے انھیں انگریزوں کا منہ چڑھانا سکھا دیا ہے۔ جن میں درد نہیں، دھرم نہیں، اپنی قومی زبان سے محبت نہیں، اخلاقی ہمت نہیں، خود داری نہیں، قومی آن نہیں۔ یہ بھی کوئی آدمی ہیں؟ ایسے ہی خیالات اس کے دل میں آیا کرتے تھے۔ لیکن اب جو وہ فکر معاش سے دوچار ہوا۔ تو اسے معلوم ہوا۔ کہ میں اس فرقہ سے بیجا طور پر بد ظن تھا۔ یہ بے چارے رحم کے قابل ہیں۔ میں ہندی بھاشا کا پنڈت نہ سہی۔ پر بہتیروں سے اچھی بھاشا جانتا ہوں۔ میرے خصائل پاکیزہ نہ ہوں۔ پر بہتیروں سے اچھے ہیں۔ میرے خیالات بلند نہ ہوں۔ پر ایسے نیچے بھی نہیں۔ لیکن میرے لیے سب دروازے بند ہیں۔ میں یا تو کہیں چپراسی ہوسکتا ہوں۔ یا بہت ہوگا۔ تو کانسٹبل ہوجاؤں گا۔ بس یہی میری ہستی ہے۔ ہمارے ساتھ یہ کتنی زیادتی ہے! ہم کیسے ہی باسیرت ہوں۔ کتنے ہی فہیم ہوں۔ کتنے ہی بیدار مغز ہوں۔ پر انگریزی زبان سے نا آشنا ہوں۔ تو ان کمالات کی کوئی وقعت نہیں! ہم سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگا۔ جو اس ظلم کو خموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ نہیں۔ بلکہ اس پر غرور کرتے ہیں۔ اس کا جس گاتے ہیں۔ اور اپنی موجودہ حالت پر پھولے نہ سما کر اسے اپنا وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں! نہیں مجھے ملازمت کا خیال دل سے نکال ڈالنا چاہیے۔

سدن کی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو رات کو جنگل میں بھٹکتا ہو۔ اندھیری رات پر جھنجلاتا ہے۔

اس فکر اور نارسائی کی حالت میں ٹہلتا ہوا۔ وہ ایک دن ندی کے کنارے اس مقام پر جانکلا جہاں بہت سی کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ ادھر اُدھر اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ بعض بعض کشتیوں میں سے سریلی تانوں کی صدائیں آرہی تھیں۔ کئی ناؤں پر سے ملاح بورے اتار رہے تھے۔ سدن ایک ناؤ پر جا بیٹھا۔ کنار دریا کی شاعرانہ لطافت اور شام کی خیال انگیز تنہائی نے اس پر محویت کا عالم طاری کردیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیسی لطف کی زندگی ہے۔ کاش میں بھی ساری دنیا سے الگ۔ ایسے ہی ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ندی کی لہروں پر چلتا اور خوشی کے راگ گاتا۔ یہیں ندی کے کنارے میری ایک چھوٹی

سی جھونپڑی ہوتی۔ شانتا دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھا کرتی۔ اور کبھی کبھی ہم دونوں ناؤ پر بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے۔ اس کی رنگین طبیعت نے اس سادہ اور قانع زندگی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی۔ کہ وہ وفورِ شوق سے بیتاب ہوگیا۔ وہاں کی ایک ایک چیز سرور اور شعر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اٹھا۔ اور ایک ملاّح سے پوچھا، "کیوں جی چودھری یہاں کوئی ناؤ بکاؤ بھی ہے؟"

ملاح بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ سدن کو دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ اور اسے کئی ناویں دکھائیں۔ سدن نے ایک نئی کشتی پسند کی۔ مول تول ہونے لگا۔ کتنے ہی اور ملاح جمع ہوگئے۔ آخر تین سو روپیہ میں معاملہ طے ہوگیا۔ یہ بھی طے ہوگیا۔ کہ جس کی ناؤ ہے۔ وہی اسے چلانے کے لیے نوکر ہوگا۔

سدن گھر کی طرف چلا تو ایسا خوش تھا۔ گویا اسے زندگی میں اب اور کوئی آرزو نہیں ہے۔ گویا اس نے کسی جنگ میں فتح پائی ہے۔ ساری رات اس کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی وہی کشتیاں جو بادبان کھولے افق کی طرف سے چلی آرہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہیں۔ وہی دلفریب نظارے اسے دکھائی دیتے رہے۔ خیال نے کنارِ دریا پر ایک خوبصورت جھونپڑا تیار کیا۔ ہری بھری لتاؤں سے سجا ہوا۔ تب شانتا کی دلآویز تصویر اس میں جلوہ افروز ہوئی۔ جھونپڑا ایک عالی شان محل بنا۔ اس میں ایک پُرفضا باغ سجا۔ اور سدن اس کے کنجوں میں شانتا کے ساتھ محوِخرام ہوگیا۔ ایک طرف ندی کا سہانا راگ تھا۔ دوسری طرف چڑیوں کی خوشنوائیاں تھیں۔ جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے۔ اسے ہم ہمیشہ ایک ہی انداز میں دیکھتے ہیں۔ اسی انداز میں ہم اسے یاد کرتے ہیں۔ وہی وضع، وہی عالم ہمارے لوحِ دل پر منقوش ہوجاتا ہے۔ سدن شانتا کو اسی عالم میں دیکھتا تھا۔ جب وہ ایک سادی ساڑی پہنے، سر جھکائے، گنگا کے کنارے کھڑی تھی۔ یہ تصویر اس کی آنکھوں سے نہ اترتی تھی۔

سدن کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس پیشہ میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ نقصان کا امکان بھی اس کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ سب سے طرفہ بات یہ تھی۔ کہ ابھی تک اس نے یہ نہ سوچا تھا کہ اتنے روپے کہاں سے آئیں گے۔

صبح ہوتے ہی اسے روپیوں کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کس سے مانگوں؟ کون دے گا؟

مانگوں کس بہانہ سے؟ چچا صاحب سے کہوں؟ نہیں آج کل وہ خود ہی زیر بار ہیں۔ مہینوں سے کچہری نہیں جاتے اور دادا سے مانگنا تو پتھر سے تیل نکالنا ہے۔ کیا کروں؟ اگر اس وقت نہ گیا۔ تو چودھری اپنے دل میں کیا کہے گا۔ وہ چھت پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ منصوبوں کا جو رفیع محل اس نے ذرا دیر قبل کھڑا کیا تھا۔ پامال ہونے لگا۔ شباب کی امید پیال کی آگ ہے۔ جس کے جلنے اور بجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ یا کسی نادار کا وقار جو شام کو بنتا اور صبح کو بگڑ جاتا ہے۔

دفعتاً سدن کو ایک خیال آگیا۔ وہ زور سے کھل کھلاکر ہنسا جیسے کوئی اپنے دشمن کو زمین پر گراکر بے ہنسی ہنستا ہے۔ واہ! میں بھی کیسا احمق ہوں۔ میرے صندوق میں میری موہن مالا رکھی ہوئی ہے۔ تین سو سے کچھ زیادہ ہی کی ہوگی۔ کیوں نہ اسے بیچ ڈالوں۔ جب کوئی مانگے گا۔ تو دیکھا جائے گا۔ کون مانگتا ہے۔ اور کسی نے پوچھا بھی تو صاف کہہ دوں گا۔ کہ بیچ کر کھا گیا۔ جو کچھ کرنا ہوگا۔ کرلیں گے۔ اور اگر اس وقت تک ہاتھ میں روپے آگئے تو نکال کر پھینک دوں گا۔ اس نے صندوق سے مالا نکالی۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اسے کیوں کر بیچوں۔ بازار میں کوئی زیور بیچنا اپنی عزت بیچنے سے کم ذلت کی بات نہیں ہے۔ اسی فکر میں اداس بیٹھا تھا۔ کہ جیتن کہار کمرہ میں جھاڑو دینے آیا۔ سدن کو متفکر دیکھ کر بولا، ”بھیا آج اداس ہو۔ آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔ رات سوئے نہیں کیا؟“

سدن۔ ہاں آج نیند نہیں آئی۔ سر پر ایک فکر سوار ہے۔

جیتن۔ ایسی کون سی فکر ہے میں بھی سنوں۔

سدن۔ تم سے کہہ دوں۔ تو ابھی سارے گھر میں دہائی دیتے پھروگے۔

جیتن۔ بھیا تمھاری ہی غلامی میں عمر بیت گئی۔ ایسا پیٹ کا ہلکا ہوتا۔ تو ایک دن نباہ نہ ہوتا۔ اس سے نشا کھاتر رہو۔

جس طرح ایک نادار لیکن بامروت آدمی کے منہ سے انکار نکلتا ہے۔ بہت شش وپنج، بہت معذوری و مجبوری۔ بہت ندامت اور رکاوٹ کے ساتھ۔ اسی طرح سدن کے منہ سے نکلا، ”میرے پاس ایک موہن مالا ہے۔ اسے کہیں بیچ دو۔ مجھے روپیوں کی ضرورت ہے۔“

جیتن۔ تو یہ کون بڑا کام ہے۔ اتنی سی بات کے لیے کیوں پھکر کرتے ہو۔ لیکن روپے لے

کر کیا کروگے؟ مالکن سے کیوں نہیں مانگ لیتے؟ وہ کبھی ناہیں نہ کریں گی۔ مالک سے کہوگے تو نہ ملے گا۔ اس گھر میں مالک کچھ نہیں ہیں۔ جو ہیں مالکن ہیں۔

سدن ۔ میں گھر میں کسی سے نہیں مانگنا چاہتا۔

جیتن نے مالا لے کر دیکھی۔ اسے ہاتھوں سے تولا۔ اور شام تک اسے بیچ لانے کا وعدہ کرکے چلاگیا۔ مگر وہ بازار نہ گیا۔ بلکہ وہ سیدھا اپنی کوٹھری کی طرف چلا۔ دونوں کیواڑ بند کرلیے۔ اور اپنی کھاٹ کے نیچے کی زمین کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک مٹی کی ہانڈی نکل آئی۔ یہی اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ ساری زندگی کی کفایت شعاری، بخل، قطع و برید، بددیانتی، دلالی، گول مال اسی ہانڈی کے اندر ان روپیوں کی صورت میں بند تھا۔ شاید اسی وجہ سے روپے کے چہرہ بھی داغدار اور سیاہ ہوگئے تھے۔ لیکن مدت العمر کے گناہوں کا کتنا مختصر نتیجہ تھا! گناہ کتنے سستے بکتے ہیں۔

جیتن نے روپے گن کر بیس بیس کی ڈھیریاں لگائیں۔ کل سترہ ڈھیریان تھیں۔ تب اس نے ترازو پر مالے کو روپیوں سے تولا۔ پندرہ روپیہ سے کچھ زیادہ وزن تھا۔ سونے کا نرخ بازار میں بڑھا ہواتھا۔ پر اس نے ایک تولہ کی قیمت پچیس ہی روپے قائم کی۔ پھر پچیس پچیس روپیوں کی ڈھیریاں بنائیں۔ تیرہ گڈیاں ہوئیں۔ اور پندرہ روپے بچ رہے۔ اس کے کل روپے مالے کی قیمت سے ۳۵ روپے کم تھے۔ اس نے دل میں کہا۔ اب یہ سودا ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ کہہ دوں گا مالا تیرہ ہی روپے بھر تھی۔ ۱۵ روپے اور بچ جائیں گے۔ چلو مالا رانی! تم اس ڈربے میں آرام سے بیٹھو۔

ہانڈی پھر زمین کے نیچے چلی گئی۔ ثمرۂ گناہ اور بھی مختصر ہوگیا۔

جیتن اس وقت مارے خوشی کے اچھلا پڑتا تھا۔ اس نے بات ہی بات میں پچاس روپیوں پر ہاتھ مارا تھا۔ ایسا موقع اسے زندگی میں کبھی نہ ملا تھا۔ اس نے سوچا آج ضرور کسی بھلے آدمی کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا۔ بگڑی ہوئی آنکھوں کی طرح بگڑے ہوئے ایمان میں بھی روشنی کا گزر نہیں ہوتا۔

دس بجے جیتن نے ۳۲۵ روپے لاکر سدن کے ہاتھ میں رکھے۔ سدن کو گویا پڑا ہو دھن ملا۔

روپے دے کر جیتن نے بے غرضانہ انداز سے منہ پھیرا۔ سدن نے پانچ روپے نکال

کر اس کی طرف بڑھا دیے اور بولا، "یہ لو تمباکو پینا۔"

جیتن نے ایسا منہ بنایا۔ جیسے کوئی بھگت شراب کا پیالہ دیکھ کر بچتا ہے۔ اور بولا، "بھیا تمھارا دیا تو کھاتا ہی ہوں۔ یہ کہاں بچیں گے؟"

سدن ۔ نہیں نہیں میں خوشی سے دیتا ہوں لے لو۔ کوئی حرج نہیں ہے۔

جیتن ۔ نہیں بھیا یہ نہ ہوگا۔ ایسا کرتا تو اب تک چار پیسے کا آدمی ہوجاتا۔ نارائن تمھیں بنائے رکھے۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سدن کو یقین ہوگیا۔ کہ یہ بڑا ایماندار اور نیک بخت آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک کروں گا۔

شام کو سدن کی ناؤ گنگا کی لہروں پر اس طرح چل رہی تھی۔ جیسے آسمان پر بادل چلتے ہیں۔ لیکن اس کے چہرہ پر مسرت کی شگفتگی کے بجائے فکرِ فردا کی جھلک نمایاں تھی۔ جیسے کوئی طالب علم کامیابی کا تمغا حاصل کرنے کے بعد فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے تجربہ ہوتاہے۔ کہ اب تک جو باندھ مجھے دنیا کے سیلاب سے بچائے ہوئے تھا۔ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور میں اتھاہ ندی میں کھڑا ہوں۔ سدن سوچ رہا تھا۔ میں نے ناؤ ندی میں ڈال دی لیکن یہ پار بھی لگے گی۔ اسے اب معلوم ہورہاتھا کہ پانی گہراہے۔ ہوا تیز ہے اور زندگی کا سفر اتنا خوش گوار نہیں ہے۔ جتنا میں سمجھتا تھا۔ لہریں اگر میٹھے سُروں میں گاتی ہیں۔ تو خوفناک آواز سے گرجتی بھی ہیں۔ ہوا اگر لہروں کو تھپکیاں دیتی ہیں تو کبھی کبھی انھیں اچھال بھی دیتی ہے۔

(۲۵)

پربھاکرراؤ کا غصہ کچھ تو سدن کے مضامین سے فرو ہوگیا تھا۔ اور جب پدم سنگھ نے سدن کے اصرار سے سمن کی پوری سرگزشت انھیں لکھ بھیجی۔ تو وہ مطمئن ہوگئے۔

اخراج کی تجویز کو منظور ہوئے تین ماہ گزرگئے۔ لیکن اس کی ترمیم کے متعلق تیغ علی اور دیگر اصحاب کو جو اندیشے تھے۔ وہ باطل ثابت ہوئے۔ نہ دال منڈی کے مکانوں پر دکانیں ہی آراستہ ہوئیں۔ اور نہ ارباب نشاط نے رشتۂ عقد ہی سے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کی۔ ہاں کئی بالاخانے خالی البتہ ہوگئے۔ ان کے مکینوں نے اخراج کے خوف سے دوسری جگہ رہنے کا انتظام کرلیا۔ کسی قانون کی خلاف ورزی کے لیے اس سے زیادہ نظام بندیوں کی

ضرورت ہوتی ہے۔ جتنی کہ اس کے اجراء کے لیے۔ پربھاکرراؤ کی طمانیت خاطر کا یہ دوسرا سبب تھا۔

پدم سنگھ نے اس تجویز کو تحریک نفرت سے ہاتھ میں لیا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ان کی نفرت بہت کچھ انسانیت اور ہمدردی کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ انھیں جذبات نے انھیں ترمیم سے متفق ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ سوچتے یہ بے چاریاں نفسانی خواہشات کا شکار ہورہی ہیں۔ نشہ ہوس نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کے ساتھ رحم اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اگر ان پر ستم روا رکھا گیا۔ تو ان کی قوت اصلاح اور بھی زائل ہوجائے گی۔ اور جن روحوں کو ہم نصیحت سے، محبت سے، تعلیم سے، تشفی سے بچاسکتے ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔ ہم خود مکروہات کے غلام۔ انھیں سزا دینے کا کوئی مجاز نہیں رکھتے۔ ان کے فعل ہی انھیں کیا کم ذلیل و خوار کررہے ہیں۔ کہ ہم ان پر یہ ستم کرکے ان کی زندگی کو اور بھی خراب و خستہ کریں۔

خیالات فعل کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ پدم سنگھ نے جھجک اور پس و پیش کو ترک کرکے دائرہ عمل میں قدم رکھا۔ وہی شخص جو سمن کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اب دن دوپہر دال منڈی کے بالاخانوں پر بیٹھا نظر آنے لگا۔ اسے اب زبانِ خلق کا خوف نہ تھا۔ تضحیک اور تحقیر کا اندیشہ نہ تھا۔ اس کا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ اس کے دل میں سچی خدمت کا جوش پیدا ہوگیا تھا۔ کچا پھل پتھر مارنے سے بھی نہیں گرتا۔ لیکن پک کر وہ خود بخود زمین کی طرف ہوجاتا ہے۔

بٹھل داس اس معاملہ میں پدم سنگھ سے متفق نہ ہوسکے۔ انھیں ایسی ارواحِ خبیثہ کی اصلاح پر اعتماد نہ تھا۔ سید شفقت علی بھی جو اس ترمیم کے موجد تھے۔ پدم سنگھ سے کنی کاٹ گئے اور کنورصاحب کو تو اپنے سرود و ستار، سیروبہار ہی سے فرصت نہ تھی۔ صرف سوامی گجانند نے پدم سنگھ کی مدد کی۔ اور کامل طریق پر۔ اس نفسِ پاک نے اپنے تئیں خدمت پر قربان کردیا تھا۔

(۲۶)

ایک مہینہ گزرگیا۔ سدن نے اپنے اس نئے مشغلہ کا ذکر گھر میں کسی سے نہ کیا۔ وہ

روز سویرے اٹھتا اور گنگا اشنان کرنے کے بہانہ سے چلا جاتا۔ وہاں سے دس بجے گھر آتا۔ کھانا کھاکر پھر چل دیتا۔ اور تب کا گیا گیا گھڑی رات گئے لوٹتا۔ اب اس کی ناؤ گھاٹ پر کی سب ناؤں سے زیادہ سجی ہوئی خوش نما تھی۔ اس پر دو ایک مونڈھے رکھے رہتے تھے۔ اور ایک فرش بچھا رہتا تھا۔ اس لیے شہر کے اکثر تفریح پسند لوگ اس پر سیر کیا کرتے تھے۔ سدن کرایہ اور مزدوری کی بابت کچھ بات چیت نہ کرتا۔ یہ سب اس کا ملازم ملاح جھینگر کیا کرتا تھا۔ وہ کبھی تو کنارے ایک تخت پر بیٹھا رہتا۔ یا کسی کشتی پر جا بیٹھتا۔ وہ اپنے تئیں اکثر سمجھاتا۔ کہ کام کرنے میں کیا شرم؟ میں نے کوئی برا کام تو نہیں کیاہے۔ کسی کا غلام تو نہیں ہوں۔ کوئی مجھے آنکھیں تو نہیں دکھاسکتا۔ ایمان درست رہنا چاہیے۔ لیکن جونہی وہ کسی شریف آدمی کو اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھتا۔ خود بخود اس کے قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ اور شرم سے آنکھیں جھک جاتیں۔ وہ ایک زمیندار کا لڑکا تھا۔ اور ایک وکیل کا بھتیجہ ۔ اس درجہ سے اتر کر اب ملاح کا پیشہ کرنے میں اسے فطرتاً ایک ذلت محسوس ہوتی تھی۔ اور اسے استدلال کا کوئی پہلو دور نہ کرسکتا تھا۔ اس بیہودہ شرم سے اس کا بہت نقصان ہوجاتا تھا۔ جس کام کے لیے وہ آسانی سے ایک روپیہ وصول کرسکتا تھا۔ اسی کے لیے اسے اس سے نصف میں راضی ہونا پڑتا تھا۔ اونچی دکان پکوان پھیکے ہونے پر بھی بازار میں ممتاز ہوتی ہے۔ یہاں تو پکوان اچھے تھے صرف ایک سجیلے دکاندار کی ضرورت تھی۔ وضع و قطع ہر ایک پیشہ میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ آپ کسی سفید پوش حجام کو معمولی سے زیادہ اجرت دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ کسی خوش وضع یکہ بان کو خواہ مخواہ اجرت سے کچھ زیادہ ہی دے آتے ہیں۔سدن اس نکتہ کو سمجھتا تھا۔ پر طبعیت سے مجبور تھا۔ تاہم اوسطاً اسے ڈیڑھ دو روپے روز مل جاتے تھے۔ اور اب وہ زمانہ قریب آتا جاتا تھا۔ جب ندی کنارے اس کا جھونپڑا ملے گا۔ اور آباد ہوگا۔ اور اب اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتا جاتاتھا۔ اس خیال سے اس کی غیر تمیز طبیعت مخمور ہوجاتی تھی وہ اکثر رات کی رات انھیں آرزوؤں کا خواب دیکھنے میں کاٹ دیتا تھا۔

اسی اثناء میں میونسپل بورڈ نے ارباب نشاط کے لیے شہر سے ذرا ہٹ کر مکانات تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ لالہ بھگت رام کو اس کام کا ٹھیکہ ملا۔ انھیں اس پار کوئی ایسی زمین نہ مل سکی جہاں وہ اینٹ کے پزاوے لگاتے۔ اور چونے کے بھٹے بناتے۔ اس لیے انھوں نے ندی

پار زمین لی تھی۔ اور سب سامان وہیں تیار کرتے تھے۔ اس پار سے ان چیزوں کو لانے کے لیے انھیں ایک ناؤ کی ضرورت ہوئی۔ وہ ناؤ طے کرنے کے لیے ندی کنارے آئے۔ سدن سے ملاقات ہوگئی۔ سدن نے اپنی ناؤ دکھائی۔ بھگت رام نے پسند کی جھینگر سے مزدوری طے ہوئی۔ دو کھیوے روز لانے کا وعدہ ہوا۔ بھگت رام نے بیعانہ دیا اور چلے گئے۔

روپیہ کی چاٹ بری ہوتی ہے۔ سدن اب وہ اڑاؤ، لٹاؤ، فضول خرچ نوجوان نہیں تھا اس کے سر پر اب فکروں کا بوجھ ہے۔ قرض کا قرض ہے۔ وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اس کی نگاہ ایک ایک پیسے پر رہتی ہے۔ اسے اب روپے کمانے اور جھونپڑا بنوانے کی دھن ہے، اس دن وہ گھڑی رات رہے اٹھ کر ندی کنارے پر چلا آیا۔ اور جھینگر کو جگاکر ناؤ کھلوادی۔ دن نکلتے نکلتے اس پار جا پہنچا۔ واپسی کے وقت اس نے خود ڈنڈا لے لیا۔ اور ہنستے ہوئے دوچار ہاتھ چلائے۔ مگر جب کشتی کی چال میں نمایاں فرق دیکھا۔ تو اس نے زور زور سے ہاتھ چلانے شروع کیے۔ شہزور آدمی تھا۔ کشتی کی رفتار دونی ہوگئی۔ جھینگر پہلے مسکراتا رہا۔ لیکن اب حیرت میں آگیا آج سے وہ سدن کا دباؤ کچھ زیادہ ماننے لگا۔ اسے معلوم ہوگیا۔ کہ یہ بابو صاحب نرے مٹی کے لونڈے نہیں ہیں۔ کام پڑنے پر یہ اکیلے ہی کشتی کو پار لے جاسکتے ہیں۔ اور اب مجھے ٹرانے کی گنجائش نہیں ہے۔

اس دن دوکھیوے ہوئے۔ دوسرے دن ایک ہی ہوا۔ کیونکہ سدن کو آنے میں دیر ہوگئی۔ تیسرے دن اس نے نو بجے رات کو تیسرا کھیوا پورا کیا۔ لیکن پسینہ میں ڈوبا ہواتھا۔ ایسا تھک گیا تھا۔ کہ گھر تک آنا پہاڑ ہوگیا۔ اسی طرح متواتر دوماہ تک اس نے کام کیا۔ اور اسے خاصا نفع ہوا۔ اس نے دو ملاح اور رکھ لیے۔

سدن اب ملاحوں کا سرغنہ تھا۔ اس کا جھونپڑا تیار ہوگیا تھا۔ اندر ایک تخت تھا۔ دو پلنگ، دو لیمپ، کچھ معمولی برتن، ایک کمرہ بیٹھنے کا تھا، ایک کھانا پکانے کا، ایک سونے کا، دروازہ پر اینٹوں کا ایک چبوترہ تھا۔ اس کے اردگرد گملے رکھے ہوئے تھے۔ دوناندوں میں بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ جس کی لتائیں جھونپڑے کے اوپر چڑھتی آتی تھیں۔ یہ چبوترہ، اب ملاحوں کا اڈا تھا۔ وہ اکثر یہیں بیٹھے تمباکو پیا کرتے تھے۔ سدن نے ان کے ساتھ ایک بڑا سلوک کیا تھا۔ حکام سے خط و کتابت کرکے اس نے انھیں آئے دن کی بیگار سے نجات دلوادی تھی۔ اس دلیرانہ طرز عمل نے اس کا سکہ بیٹھا دیا تھا۔ اس کے پاس کچھ روپے جمع

ہوگئے تھے۔اور وہ ملاحوں کو ضرورت پر بلاسود کے قرض دے دیا کرتا تھا۔ اسے اب ایک بائسکل کی فکر تھی۔ شوقین اصحاب کی تفریح کے لیے وہ ایک بجرا بھی لینا چاہتا تھا۔ اور ہارمونیم کے لیے تو اس نے فرمائش بھی لکھ دی تھی۔ وہ اس دیوی کے استقبال کی تیاریاں کررہا تھا۔ جو اس کاشانے کو رشک فردوس بنائے گی۔

سدن کی حالت بیشک ایسی ہوگئی تھی۔ کہ وہ خانہ داری کا بوجھ اٹھاسکے۔ لیکن چچا کی مرضی کے بغیر وہ شانتا کو لانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ وہ گھر پر شرماجی کے ساتھ کھانے بیٹھتا تو دل میں مصمم ارادہ کرلیتا۔ کہ آج اس معاملے کو طے کرلوں گا۔ لیکن عین موقعہ پر ناطقہ دغا دے جاتا۔ بات منہ سے نہ نکل سکتی۔ اگرچہ اس نے پدم سنگھ سے خود اپنی کشتی رانی کا ذکر نہیں کیاتھا۔ لیکن انھیں لالہ بھگت رام سے سب حالات معلوم ہوگئے تھے۔ وہ سدن کی اس حرفت پسندی پر دل میں بہت خوش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دو کشتیاں اور لے لی جائیں۔ اور کاروبار بڑھادیا جائے۔ لیکن چونکہ سدن خود کچھ نہیں کہتا تھا۔ تو وہ بھی اس معاملہ میں خاموش رہنا مناسب سمجھتے تھے۔ وہ پہلے ہی سے اس کی خاطر کرتے تھے۔ اب کچھ عزت بھی کرنے لگے اور سبھدرا کے برتاؤ میں تو اب واضح فرق ہوگیا تھا۔ وہ اب اسے لڑکے کی طرح چاہنے لگی تھی۔

ایک روز رات کو سدن اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا ندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج نہ جانے کیوں ناؤ کے آنے میں دیر ہورہی تھی۔ سامنے لیمپ جل رہا تھا۔ سدن کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ پر اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ ناؤ کے نہ آنے سے اسے کسی سانحہ کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اس نے اخبار رکھ دیا۔ اور باہر نکل آیا۔ ریت پر چاندنی کا سنہرا فرش بچھا ہواتھا۔ اور چاند کی شعاعیں سطح ساکت پر ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی وادیٔ تاریک میں شفاف پانی کا چشمہ بتدریج چوڑا ہوتا ہوا نکلتا ہے۔ چبوترے پر کئی ملاح بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ دفعتاً سدن نے دو عورتوں کو شہر کی جانب سے آتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے ملاحوں سے پوچھا۔ ''ہم کو اس پار جانا ہے، کوئی ناؤ لے چلے گا؟''

سدن نے آواز پہچانی۔ یہ سمن تھی۔ سدن کے سینہ میں ایک گدگدی سی ہوئی۔ آنکھوں میں ایک سرور سا آیا وہ لپک کر چبوترے کے پاس آیا۔ اور سمن سے بولا، ''بائی جی۔ تم یہاں کہاں؟''

سمن نے غور سے سدن کی طرف دیکھا۔ گویا اسے پہچانتی نہیں۔ اس کے ساتھ والی عورت نے گھونگھٹ بڑھالیا۔ اور لالٹین کی روشنی سے کئی قدم ہٹ کر اندھیرے میں چلی گئی۔ سمن نے تعجب سے کہا،"کون سدن؟"

ملاحوں نے اٹھ کر گھیر لیا۔ لیکن سدن نے کہا: "تم لوگ جاؤ۔ یہ ہمارے گھر کی عورتیں ہیں، آج یہیں رہیں گی۔" اس کے بعد وہ سمن سے بولا،"بائی جی خیریت تو ہے۔ کیا ماجرا ہے؟"

سمن۔ سب خیریت ہے۔ بھاگ میں جو لکھا ہے۔ وہی بھوگ رہی ہوں۔ آج کا اخبار ابھی تم نے نہ پڑھا ہوگا۔ پربھاکرراؤ نے نہ جانے کیا چھاپ دیا۔ کہ آشرم میں ہل چل مچ گئی۔ ہم دونوں وہاں ایک دن بھی اور رہ جاتے۔ تو آشرم بالکل خالی ہوجاتا۔ وہاں سے نکل بھاگنا ہی مصلحت تھی اب اتنی عنایت کرو۔ کہ ہمیں اس پار لے جانے کے لیے ایک ناؤ ٹھیک کردو۔ وہاں یکہ کرکے مغل سرائے چلے جائیں گے۔ امولا کے لیے کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔ یہاں سے رات کو کوئی نہیں جاتی۔

سدن۔ اب تو تم اپنے گھر ہی پہنچ گئیں۔ امولا کیوں جاؤگی؟ تم لوگوں کو تکلیف تو بہت ہوئی۔ پر اس وقت تمھارے آنے سے مجھے جتنی خوشی ہوئی۔ وہ بیان نہیں کرسکتا۔ میں خود کئی دن سے ارادہ کررہا تھا۔ کہ تمھارے پاس آؤں۔ لیکن کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں تین چار مہینہ سے ملاحی کا پیشہ کرنے لگا ہوں۔ یہ تمھارا جھونپڑا ہے چلو اندر چلو۔

سمن اندر گئی۔ لیکن شانتا وہیں اندھیرے میں چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔ جب سے اس نے سدن سنگھ کی زبان سے اس کا دل شکن فیصلہ سنا تھا۔ اس دکھیا نے رورو کر دن کاٹے تھے۔ اسے باربار اپنے غرور پر افسوس ہوتا۔ وہ سوچتی اس وقت اگر میں ان سے منت کرتی۔ تو انھیں مجھ پر ضرور رحم آجاتا۔ سدن کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی۔ اور اس کی باتیں کانوں میں گونجتی تھیں۔ باتیں دل شکن تھیں۔ لیکن شانتا کو ان میں ہمدردی اور محبت کی بو آتی تھی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھالیا تھا۔ کہ یہ سب میری کھوٹی تقدیر کا پھل ہے۔ سدن کا بالکل قصور نہیں۔ وہ سچ مچ مجبور ہیں۔ اپنے ماں باپ کی بات ماننی ان کا فرض ہے۔ یہ میرا کمینہ پن ہے۔ کہ انھیں فرض کے راستہ سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ ہائے میں نے اپنے سوامی سے غرور کیا۔ اپنی سفلہ غرض کی دھن میں ان کی

بے عزتی کی۔ جوں جوں دن گزرتے تھے۔ شانتا کی روحانی کلفت بڑھتی جاتی تھی۔ اس غم، فکراور صدمۂ فراق سے وہ نازنین اس طرح سوکھ گئی تھی۔ جیسے جیٹھ میں ندی سوکھ جاتی ہے۔

سمن جھونپڑے میں چلی گئی۔ تو سدن آہستہ آہستہ شانتا کے سامنے آیا۔ اور کانپتے ہوئے بولا۔ "شانتا" یہ کہتے کہتے اس کا گلا پھنس گیا۔

شانتا سرورِ الفت سے سرشار ہوگئی۔ اس نے دل میں کہا۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ معلوم نہیں زندہ رہوں، نہ رہوں۔ ان کے درشن پھر ہوں یا نہ ہوں۔ ایک بار ان کے قدموں پر سر رکھ کر رونے کی آرزو کیوں دل میں رہ جائے۔ اس سے بہتر اور کون سا موقعہ ملے گا؟ یہ ایک بار مجھے اپنے ہاتھوں سے اٹھاکر میرے آنسو پونچھ دیں گے۔ تو مجھے تسکین ہوجائے گی۔ میرا جنم سپھل ہوجائے گا۔ میں جب تک جیوں گی۔ اسی خوئ قسمت کو یاد کرکے دل کو خوش کروں گی۔ مجھے تو یہ امید بھی نہ تھی کہ کبھی ان کے درشن پاؤں گی۔ لیکن جب ایشور نے وہ دن دکھایا۔ تو دل کی حسرت کیوں باقی رہے۔ زندگی کے صحرائے خشک میں یہ ہرابھرا درخت مل گیا ہے۔ تو کیوں نہ اس کے سایہ میں دم لے کر اپنے دلِ سوزاں کو ٹھنڈا کرلوں۔

یہ سوچ کر شانتا روتی ہوئی سدن کے پیروں پر گرپڑی۔ لیکن ٹوٹا ہوا دل ان جذبات کا بار نہ سنبھال سکا۔ مرجھایا ہوا پھول ہوا کا جھونکا لگتے ہی ریزہ ریزہ ہوگیا۔ سدن جھکا کہ اُسے اٹھاکر سینے سے لگائے چمٹائے۔ لیکن شانتا کی حالت دیکھ کر بے اختیار اس کے جگر سے ایک صدائے درد نکل آئی۔ جب اس کو پہلے دریا کے کنارے دیکھا تھا۔ تو وہ حسن کی ایک شگفتہ کونپل تھی۔ پَر آج وہ ایک برگ خزاں رسیدہ تھی۔ خشک اور زرد!

سدن کا دل دریا میں چمکتی ہوئی چاند کی کرنوں کی طرح تھرتھرارہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تن بے جاں کو اٹھا لیا۔ خلوص درد میں اسے ایشور کی یاد آئی۔ روتے ہوئے بولا، "ایشور مجھ سے بڑا گناہ ہوا ہے۔ میں نے ایک نرم اور نازک دل کو بڑی بے دردی سے مسلا ہے۔ لیکن اس کی یہ سزا بہت سخت ہے۔ تم رحیم ہو، مجھ پر رحم کرو۔"

شانتا کو سینے سے لگائے ہوئے سدن جھونپڑے میں گیا۔ اور اسے پلنگ پر لٹاکر بکیسانہ

انداز سے بولا، "سمن دیکھو۔ یہ کیسی ہوئی جارہی ہیں۔ میں ڈاکٹر کے پاس دوڑا جاتا ہوں۔"
سمن نے قریب آکر بہن کو دیکھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نبض کا پتہ نہیں۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً پنکھا اٹھالیا۔ اور جھلنے لگی۔ وہ غصہ جو مہینوں سے اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں جمع ہورہا تھا۔ پھوٹ نکلا۔ سدن کی طرف ملائمت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی۔"یہ تمھارے ظلم کا پھل ہے۔ یہ تمھاری کرنی ہے۔ تمھارے ہی بے رحم ہاتھوں نے اس پھول کو اتنی بے دردی سے مسلا ہے۔ تمھارے ہی پیروں نے اس پودے کو اتنی بے رحمی سے کچلا ہے۔ لو اب تمھارا گلا چھوٹا جاتا ہے۔ سدن جس دن سے تم نے زہریلے تیروں سے اسے مارا۔ اس دن سے اس غریب نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں آئی۔ اس کی آنکھیں کبھی خشک نہیں ہوئیں۔ بہت گلا دبانے سے دوچار لقمے کھالیا کرتی تھی اور تم نے یہ سزا اسے صرف اس لیے دی۔ کہ وہ میری بہن ہے۔ حالانکہ میرے ہی پیروں پر تم نے برسوں ناک رگڑی ہے۔ میرے تلوے تم نے برسوں سہلائے ہیں۔ میری ناپاک محبت میں تم برسوں متوالے رہے ہو۔ اس وقت بھی تو تم اپنے ماں باپ کے سعادت مند بیٹے تھے۔ یا کوئی اور تھے؟ اس وقت بھی تو تم اسی اونچے خاندان کے چراغ تھے۔ یا کوئی اور تھے؟ تب تمھاری ناپاک حرکتوں سے خاندان کی ناک نہ کٹتی تھی؟ آج تم آکاش کے دیوتا بنے پھرتے ہو۔ اندھیرے میں جھوٹا کھانے سے پرہیز نہیں۔ اجالے میں دعوت سے بھی انکار۔ یہ نری مکاری ہے۔ نری دغابازی۔ جیسا تم نے اس اناتھ کے ساتھ کیا ہے۔اس کا پھل تمھیں ایشور کے یہاں سے ملے گا۔ اس کو تو بھگتنا تھا بھگت چکی۔ آج نہ مری کل مرجائے گی۔ لیکن تم اسے یاد کرکے روؤگے۔ کوئی دوسری عورت ہوتی تو تمھاری باتیں سن کر پھر تمھاری طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھتی۔ لیکن یہ غریب سدا تمھارے نام پر مرتی رہی۔ لاؤ تھوڑا سا ٹھنڈا پانی۔"

سدن مجرم کی طرح سر جھکائے سنتا رہا۔ اس ملامت سے اس کا دل کچھ ہلکا ہوا۔ سمن نے اگر غصہ میں گالیاں دی ہوتیں۔ تو شاید اسے اور بھی تسکین ہوتی۔ وہ اپنے تئیں اس طعن و تشنیع کا سراسر سزاوار پاتا تھا۔ جب ہم سے کوئی ایسا فعل ہوجاتا ہے۔ جس پر ہم خود نادم ہوں۔ تو کسی غیر کی لعن طعن ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن یہ حالت صرف معمولی

خطاؤں میں ہوتی ہے۔ ہماری قوتِ تحمل درجہ گناہ کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے۔
سدن نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لاکر سمن کو دیا۔ اور خود پنکھا جھلنے لگا۔ سمن نے شانتا کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ اس پر بھی جب شانتا نے آنکھیں نہ کھولیں تو سدن ڈرتے ڈرتے بولا، "جاکر ڈاکٹر بلا لاؤں نا؟"
سمن۔ نہیں گھبراؤ مت۔ ٹھنڈک پہنچتے ہی ہوش آجائے گا۔ ڈاکٹر کے پاس اس مرض کی دوا نہیں ہے۔
سدن کو یک گونہ تسلی ہوئی۔ بولا، "سمن چاہے تم سمجھو کہ میں بات بنارہا ہوں۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ اسی منحوس گھڑی سے میری روح کو ایک لمحہ بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ میرا دل باربار مجھے نفریں کرتا تھا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ چل کر اپنی خطائیں معاف کراؤں۔ لیکن یہی خیال آتا تھا۔ کہ کس بوتے پر جاؤں؟ گھر والوں سے ہمدردی کی امید نہ تھی۔ اور مجھے تو تم جانتی ہو۔ ہمیشہ کوتل بنارہا۔ بس اسی فکر میں ڈوبا رہتا تھا کہ کسی طرح چار پیسے پیدا کروں۔ اور اپنی جھونپڑی الگ بناؤں۔ مہینوں نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ کہیں ٹھکانہ نہ ملا۔ آخر تقدیر گنگا کے کنارے لائی۔ جی میں آیا ایک کشتی لے کر اپنے تئیں منجدھار میں ڈال دوں۔ یا تو پار ہی ہوجاؤں گا یا ڈوب ہی مروں گا۔ لیکن ناؤ چل نکلی۔ یہ جھونپڑا بنالیا ہے۔ اور ارادہ ہے کہ کچھ روپے ہاتھ آجائیں تو اس پار کسی موضع میں ایک مکان بنوالوں۔ کیونکہ ان کی طبیعت کچھ سنبھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے؟"
سمن کا غصہ کچھ دھیما ہوا۔ بولی "ہاں اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ صرف غشی تھی۔"
سدن ایسا خوش ہوا۔ کہ اگر وہاں ایشور کی مورت ہوتی۔ تو وہ اس کے پیروں پر سر پٹک دیتا۔ بولا، "سمن تم نے مجھے جلا لیا۔ اگر کوئی اور بات ہوجاتی۔ تو اسی لاش کے ساتھ میری بھی لاش نکلتی۔"
سمن۔ چپ رہو، کیسی بات منہ سے نکالتے ہو۔ پرماتما چاہیں گے تو بنا دوا ہی اچھی ہوجائے گی۔ اور تم دونوں بہت دنوں تک سکھ سے رہوگے۔ تم ہی اس کی دوا ہو۔ تمھاری محبت ہی اس کی جان ہے۔ تمھیں پاکر اب اسے کوئی اور آرزو نہیں ہے۔ لیکن اگر تم نے بھول کر بھی کبھی اس سے من موٹا کیا۔ تو اس کی پھر یہی حالت ہوجائے گی اور تمھیں

ہاتھ ملنا پڑے گا۔

استنے میں شانتا نے کروٹ بدلی، اور پانی مانگا۔ سمن نے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اور پھر چارپائی پر لیٹ گئی۔ وہ پُر استعجاب نگاہوں سے اِدھر اُدھر تاک رہی تھی۔ گویا اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اور سمن کی طرف دیکھتی ہوئی بولی، ''کیوں یہی میرا گھر ہے نا؟ ہاں ہاں یہی ہے۔ اور وہ کہاں ہیں؟ میرے مالک۔ میری زندگی کے ادھار؟ انھیں بلاؤ۔ آکر مجھے درشن دیں۔ بہت جلایا ہے۔ اس آگ کو بجھائیں۔ میں ان سے کچھ پوچھوں گی۔ کیا نہیں آتے؟ اچھا تو لو میں ہی آتی ہوں۔ آج ان سے میری تکرار ہوگی۔ نہیں میں ان سے تکرار نہ کروں گی۔ صرف یہی کہوں گی ۔ کہ اب مجھے چھوڑکر کہیں مت جانا۔ چاہے گلے کا ہار بناکر رکھو۔ چاہے پیروں کی بیڑی بناکر رکھو۔ پر اپنے ساتھ رکھو۔ یہ بروگ اب نہیں سہاجاتا۔ میں جانتی ہوں۔ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ اچھا نہ سہی۔ تم مجھے نہیں چاہتے۔ میں تو تمھیں چاہتی ہوں۔ اچھا یہ بھی نہ سہی۔ میں بھی تمھیں نہیں چاہتی۔ میرا بیاہ تو تمھارے ساتھ ہوا ہے۔ نہیں۔ نہیں ہوا۔ اچھا کچھ نہ سہی۔ میں تم سے حجت نہیں کرتی۔ لیکن میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ اور اگر تم نے پھر اپنی آنکھ پھیری تو اچھا نہ ہوگا۔ ہاں اچھا نہ ہوگا۔ میں سنسار میں رونے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ یہی نا ہوگا۔ کہ چار آدمی تم پر ہنسیں گے۔ میری خاطر سے سہ لینا۔ کیا ماں باپ چھوڑدیں گے؟ کیسی بات کہتے ہو۔ ماں باپ لڑکے کو نہیں چھوڑتے۔ تم دیکھ لینا۔ میں انھیں کھینچ لاؤں گی۔ کیا انھیں مجھ پر رحم نہ آئے گا ......''

یہ کہتے کہتے شانتا کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔

سمن۔ اب سو رہی ہے۔ سونے دو۔ ایک نیند سو لے گی۔ تو طبیعت ٹھکانے آجائے گی۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ اب تم بھی گھر جاؤ۔ شرماجی گھبرا رہے ہوں گے۔

سدن۔ آج نہ جاؤں گا۔

سمن۔ نہیں نہیں وہ لوگ گھبرائیں گے۔ شانتا اب بالکل اچھی ہے۔ دیکھو کیسے مزہ سے سوتی ہے اتنے دنوں میں آج ہی میں نے اسے یوں سوتے دیکھا ہے۔

سدن نہیں مانا۔ وہیں برآمدے میں آکر تخت پر لیٹ رہا۔ اور سوچنے لگا۔

بابو بٹھل داس منصف مزاج آدمی تھے۔ جس طرف انصاف کھینچ لے جاتا۔ ادھر ہی چلے جاتے تھے۔ اس میں انھیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ جب انھوں نے پدم سنگھ کو جادۂ حق سے ہٹتے دیکھا۔ تو ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور کئی ماہ تک ان کے گھر نہ آئے۔ لیکن جب پربھاکر راؤ نے آشرم پر حملے کرنا شروع کیے۔ اور سمن کے متعلق چند پوشیدہ باتیں ظاہر کردیں تو بٹھل داس کا ان سے بھی بگاڑ ہوگیا۔ اب سارے شہر میں ان کا کوئی ہمدم نہ تھا۔ اب انھیں تجربہ ہورہا تھا۔ کہ ایک ایسے دارالخیر کے منتظم ہوکر جس کا وجود دوسروں کی ہمدردی اور اعانت پر قائم ہو۔ میرا کسی فریق سے مخصوص ہونا حد درجہ نازیبا ہے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کہ ان حملوں کا کیا جواب دوں۔ باتیں بہت کچھ سچی ہیں۔ سمن فی الواقع بازاری عورت تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی آشرم میں داخل کیا۔ انتظامیہ کمیٹی سے اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کی منظوری نہیں حاصل کی۔ دراصل میں نے آشرم کو اپنی ذاتی چیز خیال کیا۔ میرا مقصد چاہے کتنا ہی قابل تعریف ہو۔ پر اسے مخفی رکھنا۔ ہرگز مناسب نہ تھا۔

بٹھل داس ابھی کچھ فیصلہ نہ کرنے پائے تھے۔ کہ آشرم کی معلّمہ نے آکر کہا۔ "بابوجی آنندی۔ راجکماری اور گوری گھر جانے کو تیار بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے بہت سمجھایا۔ پر وہ کسی طرح نہیں مانتیں۔"

بٹھل داس نے جھنجلا کر کہا، "کہہ دو چلی جائیں۔ مجھے اس کا خوف نہیں ہے۔ ان کے لیے میں سمن اور شانتا کو نہیں نکال سکتا۔"

معلّمہ چلی گئی۔ اور بٹھل داس پھر خیال میں ڈوبے۔ "یہ عورتیں اپنے تئیں کیا سمجھتی ہیں؟ کیا سمن اس درجہ گری ہوئی ہے۔ کہ یہ سب اس کے ساتھ رہ بھی نہیں سکتیں۔ ان کا اعتراض ہے کہ آشرم بدنام ہوگیا ہے۔ اور یہاں رہنے میں ہماری بدنامی ہے۔ ہاں ضرور بدنامی ہے۔ جاؤ میں تمھیں نہیں روکتا۔"

اس وقت ڈاکیہ چٹھیاں لے کر آیا۔ بٹھل داس کے نام پانچ خطوط تھے۔ ایک میں لکھا تھا میں اپنی لڑکی ودیاوتی کو آشرم میں رکھنا مناسب نہیں خیال کرتا۔ میں اسے لینے آرہا ہوں۔ دوسرے صاحب نے دھمکایا تھا۔ کہ اگر طوائفوں کو آشرم سے نکالا نہ جائے گا۔ تو

میں چندہ دینا بند کردوں گا۔ تیسرے خط میں بھی یہی منشا تھا۔ باقی دونوں چٹھیاں بٹھل داس نے نہ کھولیں۔ان دھمکیوں سے وہ خائف نہیں ہوئے۔ بلکہ اور بھی جھلّاگئے۔ یہ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ کہ میں ان کی گیدڑ بھبکیوں سے کانپنے لگوں گا۔ یہ نہیں سمجھتے۔ کہ بٹھل داس کسی کی پروا نہیں کرتا۔ آشرم چاہے ٹوٹ جائے لیکن شانتا اور سمن کو میں ہرگز علٰحدہ نہ کروں گا۔ بٹھل داس کے غرور نے ان کے احساس حق کو زائل کردیا۔ سینہ زوری اور ثبات دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ فرق صرف ان کے عمل میں ہے۔

سمن دیکھ رہی تھی۔ کہ میرے ہی باعث یہ بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ اسے افسوس ہورہاتھا۔ کہ میں یہاں کیوں آئی۔ اس نے دل و جان سے ودھواؤں کی خدمت کی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا وہ جانتی تھی کہ بٹھل داس کبھی مجھے یہاں سے نہ جانے دیں گے۔ اس لیے اس نے ارادہ کیا کہ کیوں نہ میں خود چپکے سے چلی جاؤں۔ تین عورتیں چلی گئی تھیں۔ تین چار مستورات جانے کی تیاریاں کررہی تھیں۔ اور کئی عورتوں نے اپنے اپنے گھر خطوط بھیجے تھے۔ صرف وہی عورتیں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ پروہ بھی سمن سے آنکھیں چراتی پھرتی تھیں۔ سمن یہ بے عزتی برداشت نہ کرسکی۔ اس نے شانتا سے مشورہ کیا۔ شانتا بڑی شش وپنج میں پڑی۔ پدم سنگھ کی اجازت کے بغیر وہ آشرم سے نکلنا غیرمناسب سمجھتی تھی۔ لیکن جب سمن نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ تم رہتی ہو تو رہو۔ لیکن میرا یہاں رہنا ممکن نہیں۔ تو شانتا بھی مجبور ہوگئی۔ اس جنگل میں بھٹکتے ہوئے آدمی کی طرح جو کسی دوسرے آدمی کو دیکھ کر محض اس لیے اس کے ساتھ ہولیتا ہے کہ ایک سے دو ہوجائیں گے۔ شانتا اپنی بہن کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئی۔

سمن نے پوچھا،"اور جو پدم سنگھ ناراض ہوں؟"

شانتا۔ انھیں ایک خط لکھ کر پوری سرگزشت سنادوں گی۔

سمن۔ اور جو سدن سنگھ بگڑے؟

شانتا۔ جو سزا دیں گے۔ وہ بھگت لوں گی۔

سمن۔ خوب سوچ لو، ایسا نہ ہو پچھتانا پڑے۔

شانتا۔ رہنا تو مجھے یہیں چاہیے۔ پر تمھارے بغیر مجھ سے رہا نہ جائے گا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ کہاں چلوگی؟

سمن۔ تمھیں امولا پہنچادوں گی۔
شانتا۔ اور تم؟
سمن۔ میرا ایشور مالک ہے۔ کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلی جاؤں گی۔

دونوں بہنوں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دونوں مل کر روئیں۔ جونہی آٹھ بجے اور بٹھل داس کھانا کھانے کے لیے اپنے گھر گئے۔ دونوں بہنیں سب کی نگاہ بچاکر چل کھڑی ہوئیں۔

رات بھر کسی کو خبر نہ ہوئی۔ سویرے چوکیدار نے آکر بٹھل داس کو یہ خبر سنائی۔ وہ گھبرائے اور لپکے ہوئے سمن کے کمرہ میں جا پہنچے۔ سب چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ صرف دونوں بہنوں کا پتہ نہ تھا۔ بے چارے بڑی تشویش میں پڑے ۔ پدم سنگھ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ انھیں اس وقت سمن پر غصہ آیا۔ یہ سب اسی کی حرکت ہے۔ وہ شانتا کو بھی بھگاکر لے گئی ہے۔ دفعتاً انھیں سمن کی چارپائی پر ایک خط پڑا ہوا ملا۔ اُسے اٹھالیا۔ اور پڑھنے لگے۔ سمن نے چلتے وقت یہ خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔ اسے پڑھ کر بٹھل داس کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ لیکن سمن کے باعث مجھے آج نیچا دیکھنا پڑا۔ انھوں نے دل میں فیصلہ کیاتھا کہ میں دھمکی دینے والوں کو نیچا دکھاؤں گا۔ یہ موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں ڈرگیا؟ اس خیال سے بٹھل داس آشفتہ خاطر ہوئے۔

آخر وہ کمرہ سے نکلے اور سیدھے پدم سنگھ کے پاس پہنچے۔

شرماجی نے یہ خبر سنی تو سناٹے میں آگئے۔ بولے۔"اب کیا ہو؟"

بٹھل داس ۔ وہ امولا پہنچ گئی ہوں گی۔
پدم سنگھ۔ ہاں ممکن ہے۔
بٹھل۔ سمن اتنی دور کا سفر آسانی سے کرسکتی ہے؟
پدم سنگھ۔ ہاں بہت آسانی سے۔
بٹھل ۔ سمن تو امولا گئی نہ ہوگی؟
پدم ۔ کون جانے دونوں بہنیں ڈوب مری ہوں۔
بٹھل۔ ایک تار بھیج کر پوچھ کیوں نہ لیا جائے۔
پدم ۔ کون منہ لے کر پوچھوں۔ جب مجھ سے شانتا کی خبرگیری تک نہ ہوسکی۔ تو اس کے

متعلق کچھ پوچھنا نہایت شرمناک ہے۔ مجھے آپ کے اوپر کامل اعتماد تھا۔ اگر جانتا کہ آپ اتنی لاپرواہی کریں گے۔ تو اسے اپنے ہی گھر رکھتا۔
بٹھل۔ آپ تو ایسی باتیں کررہے ہیں۔ گویا میں نے عمداً انھیں آشرم سے نکال دیا۔
شرما۔ آپ ان کی تشفی کرتے رہتے۔ تو وہ کبھی بھی نہ جاتیں۔ آپ نے مجھے بھی اس وقت اطلاع دی ہے جب موقع ہاتھ سے نکل گیا۔
بٹھل۔ آپ ساری ذمہ داری میرے ہی سر ڈالنا چاہتے ہیں۔
شرما۔ اور کس کے سر ڈالوں۔ آشرم کے منتظم آپ ہی ہیں۔ یا کوئی اور؟
بٹھل۔ شانتا کو آشرم میں رہتے تین ماہ گزرگئے۔ آپ بھول کر بھی آشرم کی طرف گئے؟ اگر آپ کبھی کبھی وہاں جاکر اس کی خیر وعافیت پوچھتے رہتے۔ تو اسے اطمینان رہتا۔ جب آپ نے کبھی اس کی بات تک نہ پوچھی۔ تو وہ کس امید پر وہاں پڑی رہتی۔ میں اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرتاہوں۔ پر آپ بھی الزام سے نہیں بچ سکتے۔

پدم سنگھ آج کل بٹھل داس سے چڑے ہوئے تھے۔ وہ انھیں کے ایما اور تحریک سے بازار حسن کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے۔ پرجب آخرکار کام کرنے کا موقع آیا۔ تو وہ صاف نکل گئے اور بٹھل داس بھی ارباب نشاط سے ان کی ہمدردی دیکھ کر انھیں شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے دونوں اصحاب اپنے دل میں غبار بھرے ہوئے ایک دوسرے کو متہم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ پدم سنگھ انھیں خوب جھنجھوڑنا چاہتے تھے۔ پر یہ دندان شکن جواب پاکر انھیں خاموش ہونا پڑا۔ بولے، ”ہاں اتنی خطا ضرور میری ہے۔“
بٹھل داس۔ نہیں آپ کو خطاوار ثابت کرنا مقصود نہیں ہے۔ خطا سب میری ہے۔ آپ نے میرے سپرد کردیا۔ تو آپ کا ان کی طرف سے مطمئن ہوجانا ایک قدرتی امر تھا۔
پدم سنگھ۔ نہیں فی الواقع یہ میری بزدلی اور سہل نگاری کا نتیجہ ہے۔ آپ انھیں جبراً تھوڑے ہی رکھ سکتے تھے۔

پدم سنگھ نے اپنی خطا تسلیم کرکے بازی پلٹ دی تھی۔ ہم آپ جھک کر دوسروں کو جھکاسکتے ہیں۔ پر تن کو جھکانا مشکل ہے۔
بٹھل ۔ شاید سدن کو کچھ معلوم ہو۔ ذرا انھیں بلایئے۔
پدم ۔ وہ تو رات ہی سے غائب ہے۔ ندی کنارے ایک جھونپڑا بنوالیا ہے۔ اور ایک ناؤ

چلاتا ہے۔ شاید رات وہیں رہ گیا۔
بٹھل۔ کیا عجب ہے دونوں بہنیں وہیں پہنچ گئی ہوں۔ کہیے تو جاکر دیکھوں؟
پدم۔ اجی نہیں آپ کس خیال میں ہیں۔ وہ اتنا روشن خیال نہیں ہے۔ ان کے سایہ سے بھاگتا ہے۔

دفعتاً سدن کمرے میں داخل ہوا۔ پدم سنگھ نے پوچھا۔"تم رات کہاں رہ گئے؟ ساری رات تمھارے انتظار میں گزری۔"

سدن نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا،"میں خود ہی شرمندہ ہوں۔ لیکن ایک ایسی ضرورت آپڑی۔ کہ مجھے مجبوراً رکنا پڑا۔ اتنا موقع ہی نہ ملا۔ کہ آکر کہہ جاتا۔ میں نے آپ سے شرم کے مارے کبھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن ادھر کئی ماہ سے میں نے ایک ناؤ چلانی شروع کی ہے۔ وہیں ندی کنارے ایک جھونپڑا بنوالیا ہے۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ اس کام کو جم کر کروں۔ آپ سے اس جھونپڑے میں رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔
پدم سنگھ۔ اس کا چرچا تو ایک بار لالہ بھگت رام نے مجھ سے کیا تھا۔ لیکن ملال یہی ہے۔ کہ اب تک تم نے مطلق ذکر نہ کیا۔ ورنہ شاید میں بھی تمھاری کچھ مدد کرسکتا۔ خیر میں اسے برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ تمھیں اس حالت میں دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔ لیکن میں اسے کبھی نہ مانوں گا۔ کہ تم اپنا گھر رکھتے ہوئے اپنی ہانڈی الگ چڑھاؤ۔ کیا ایک کشتی اور رکھ لی جائے تو کچھ زیادہ فائدہ ہوسکتا ہے؟"
سدن۔ جی ہاں۔ میں خود اسی فکر میں ہوں۔ لیکن اس کے لیے میرا گھاٹ پر رہنا ضروری ہے۔
پدم سنگھ۔ بھئی یہ تو بری شرط ہے۔ شہر میں رہ کر تم مجھ سے الگ رہو۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ اس میں چاہے تمھیں کچھ نقصان بھی ہو۔ لیکن میں نہ مانوں گا۔
سدن۔ آپ میری یہ عرض قبول کیجیے۔ میں بہت مجبور ہوکر آپ سے یہ عرض کرنے کی جرأت کررہا ہوں۔
پدم سنگھ۔ آخر وہ کیا بات ہے۔ جو تمھیں اس قدر مجبور کررہی ہے۔ تم مجھے غیر کیوں سمجھتے ہو؟ جو تردد ہو وہ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔
سدن۔ میں اب اس گھر میں رہ کر آپ کو بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اب اس فرض

کو پورا کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ جسے کچھ دنوں تک اپنی کاہلی اور بزدلی سے ٹالتا آتا تھا۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک خون ناحق میں والد صاحب کی اعانت کروں۔ اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ پر اپنے فعل کی ذمہ داری رکھ کر ان میں اور آپ میں نفاق پیدا کروں۔ میں آپ کا لڑکا ہوں۔ جب مجھے کوئی ضرورت ہوگی۔ آپ کو ستاؤں گا کوئی تکلیف ہوگی۔ آپ کا دامن پکڑوں گا۔ لیکن رہوں گا الگ۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری تجویز کو پسند کریں گے۔

بٹھل داس تہہ پر پہنچ گئے۔ پوچھا،"کل سمن اور شانتا سے تمھاری ملاقات تو نہیں ہوئی؟"

سدن کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ جیسے کسی نازنین کے چہرہ سے نقاب اٹھ جائے۔ دبی زبان سے بولا،"جی ہاں۔"

پدم سنگھ دریائے تفکر میں غوطے کھانے لگے۔ نہ ہاں کہہ سکتے تھے نہ نہیں کہتے بنتا تھا۔ اب تک وہ اس معاملہ میں اپنے تئیں بالکل پاک سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس ظلم کا سارا الزام اپنے بھائی کے سر ڈال دیا تھا۔ اور سدن کو تو وہ کاٹھ کا پتلا سمجھتے تھے۔ لیکن اب اس نرغہ میں پڑکر وہ ادھراُدھر بھاگ نکلنے کی راہ دیکھتے پھرتے تھے۔ دنیا کا خوف تو انھیں نہیں تھا۔ خوف یہ تھا، کہ کہیں بھائی صاحب یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ یہ سب میرے ہی اشارہ سے ہواہے۔ اور میں نے ہی سدن کو گمراہ کیا ہے۔ یہ خیال ان کے دل میں جاگزیں ہوگیا۔ تو وہ ساری عمر مجھے معاف نہ کریں گے۔

پدم سنگھ کئی منٹ تک اسی الجھن میں پڑے رہے۔ آخر بولے،"سدن یہ معاملہ ایسا نازک ہے کہ میں اپنی ذمہ داری پر کچھ نہیں کرسکتا بھائی صاحب کی منشا جانے بغیر ہاں یا نہیں۔ کیوں کر کہوں۔ تم میرے اصولوں کو جانتے ہو۔ میں تمھاری اخلاقی جرأت کی تعریف کرتا ہوں۔ کہ پرماتما نے تمھیں حق پر آمادہ کیا۔ لیکن میں بھائی صاحب کی مرضی کو مقدم سمجھتا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے، کہ تم ان دونوں کے رہنے کا انتظام کردو۔ بس یہیں تک۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ بھائی صاحب کی جو مرضی ہو۔ وہ کرو۔"

سدن نے کسی قدر بے فکری سے کہا،"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ کیا جواب دیں گے؟"

پدم ۔ ہاں معلوم کیوں نہیں۔
سدن۔ تو ان سے پوچھنا بے سود ہے۔ ماں باپ کے حکم سے میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔ جو ان کی دی ہوئی ہے۔ لیکن کسی بے گناہ کی گردن پر تلوار نہیں چلاسکتا۔
پدم۔ تمھیں اس میں کیا عذر ہے کہ دونوں بہنیں الگ مکان میں ٹھہرا دی جائیں؟

سدن نے تیز ہوکر کہا "یہ تو میں تب کروں۔ جب مجھے چھپانا ہو۔ میں کوئی گناہ کرنے نہیں جارہا ہوں۔ جو اسے چھپاؤں۔ اپنی زندگی کا نہایت اہم فرض ادا کرنے جارہا ہوں۔ میں اس کام کو کارِخیر سمجھ کر نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا روحانی اور انسانی فرض سمجھ کر۔ اب تک شادی کے جو مراسم ادا نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کل ندی کے کنارے ادا کیے جائیں گے ۔ اگر آپ تشریف لائیں گے۔ تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا ورنہ ایشور کے دربار میں بغیر گواہوں کے بھی معاہدے ہوجاتے ہیں۔"

یہ کہتا ہوا سدن اٹھا۔ اور گھر میں چلاگیا۔ سبھدرا نے کہا:"واہ خوب غائب ہوجاتے ہو۔ ساری رات جی لگا رہا۔ کہاں رہ گئے تھے؟"

سدن نے رات کی ساری سرگزشت مفصل بیان کی۔ چچی سے بات کرنے میں اسے وہ جھجک نہ ہوئی۔ جو شرماجی کے روبرو ہوئی تھی۔ سبھدرا نے اس کی ہمت کی تعریف کی۔ اور بولی۔"ماں باپ کے ڈرسے کوئی اپنی بیاہتا کو تھوڑے ہی چھوڑدیتا ہے۔ دنیا ہنسے گی۔ تو ہنسا کرے۔ کیا اس کے خوف سے اپنے گھر کے آدمی کی جان لے لی جائے گی؟ تمھاری اماں سے ڈرتی ہوں نہیں تو اسے اپنے گھر میں رکھتی۔"
سدن۔ مجھے اماں یا دادا کی پروا نہیں ہے۔
سبھدرا۔ بہت پروا توکی۔ اتنے دنوں تک بے چاری کو گھلاگھلاکر مار ڈالا۔ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا۔ تو پہلے ہی دن ماں باپ کو پھٹکار سنا دیتا۔ تم ہی ہوکہ اتنا برداشت کرتے ہو۔

سبھدرا! اگر یہی باتیں تم نے ہمدردی سے کی ہوتیں تو ہم تمھاری کتنی عزت کرتے، مگر تم اس وقت حسد اور کینہ کے بس میں ہو۔ تم سدن کو ابھار کر اپنی جٹھانی کو زک دینا چاہتی ہو۔ تم ایک ماں کے معصوم دل پر وار کرکے اس کے تڑپنے کا لطف اٹھانا چاہتی ہو۔

سدن چلا گیا۔ تو بٹھل داس نے پدم سنگھ سے کہا،"یہ تو آپ کے دل کی بات ہوئی۔ اس میں آپ کو اتنا پس و پیش کیوں ہے؟"

پدم سنگھ نے جواب نہیں دیا۔

بٹھل داس۔ یہ تحریک آپ کی طرف سے ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اب آپ کو اس کے قبول کرنے میں اس قدر تامل ہے؟

پدم سنگھ نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

بٹھل داس ۔ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہنا چاہتا ہے۔ تو اس میں کیا حرج ہے؟ آپ نہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ نہ الگ رہنے دیں گے۔ اس کے کیا معنی؟

پدم سنگھ نے طنزیہ لہجہ میں کہا، "بھائی صاحب جب اپنے اوپر پڑتی ہے۔ تب انسان جانتا ہے۔ جیسے مجھے آپ راہ دکھا رہے ہیں۔ اسی طرح میں بھی دوسروں کو راہ دکھاتا رہا ہوں۔ آپ ہی ابھی طوائفوں کی اصلاح پر دھواں دھار تقریریں کرتے پھرتے ہیں لیکن کام کرنے کا موقع آیا۔ تو صاف نکل گئے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھیے۔ میں سب کچھ کرسکتا ہوں پر اپنے بھائی کو ناراض نہیں کرسکتا۔ مجھے کوئی اصول اتنا عزیز نہیں ہے۔ جو میں ان کی مرضی پر قربان نہ کرسکوں۔"

بٹھل داس ۔ میں نے آپ سے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ خاندانی طوائفوں کو دیویاں بنادوں گا کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ ان عورتوں میں جو گھر والوں کے ظلم یا بدمعاشوں کے بہکانے سے خراب ہوجاتی ہیں۔ اور خاندانی طوائفوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ میرے خیال میں ان دونوں میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا ممکن اور محال میں ہے۔

پدم سنگھ۔ کم سے کم آپ کو میری مدد تو کرنی چاہیے تھی۔ آپ اگر ایک گھنٹہ کے لیے میرے ساتھ دال منڈی چلیں۔ تو آپ کو معلوم ہوجائے گا۔ کہ جسے آپ محال سمجھتے ہیں۔ وہ بالکل ممکن ہے اچھے اور برے آدمی ہر جگہ ہوتے ہیں۔ طوائفیں بھی اس کلیہ سے خارج نہیں آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا۔ کہ ان میں کتنی مذہبی ارادت، اس مکروہ زندگی سے کتنی نفرت اور اپنے اصلاح کی کتنی تمنا ہے۔ مجھے خود اس پر تعجب ہوتا ہے۔ انھیں صرف ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ جسے پکڑکر وہ غار سے باہر نکل آئیں۔ پہلے تو وہ میری صورت سے گریز کرتی تھیں۔ لیکن جب میں نے انھیں سمجھایا کہ میں نے یہ تجویز خاص تمھاری بہبودی کے لیے کی ہے۔ تاکہ تم فاسقوں اور ہوس پروروں کی دسترس سے باہر رہ سکو تو انھیں مجھ پر کچھ کچھ اعتماد ہونے لگا۔ نام تو نہ بتاؤں گا۔ لیکن مالدار طوائفیں مجھے مالی امداد

دینے پر آمادہ ہیں۔ کئی ایسی ہیں۔ جو اپنی لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن ابھی ان عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو نشہ میں ہیں۔ اور اس عیش کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ اور میری ہنسی اڑاتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ ابھی چین کرنے دیجیے۔ بڑھاپے میں توبہ کرلیں گے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ سوامی گجانند کی تلقین کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ افسوس یہی ہے۔ کہ میرا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہے۔ ہاں مضحکہ اڑانے والے ڈھیروں ہیں۔ اس وقت ایک ایسے یتیم خانہ کی ضرورت ہے۔ جہاں طوائفوں کی لڑکیاں رکھی جاسکیں۔ اور ان کی تعلیم کا معقول انتظام ہوسکے۔ لیکن میری کون سنتا ہے۔

بٹھل داس بڑے غور سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پدم سنگھ نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ ان کا ذاتی تجربہ تھا۔ اور ذاتی تجربات ہمیشہ یقین انگیز ہوتے ہیں۔ بٹھل داس کو محسوس ہوا کہ میں جس کام کو محال سمجھتا تھا۔ وہ فی الواقع محال نہیں ہے۔ بولے، ''انردھ سنگھ سے آپ نے اس کی بابت کچھ کہا یا نہیں؟''

پدم سنگھ۔ وہاں لچھے دار باتوں اور مزہ دار چٹکیوں کے سوا اور کیا رکھا ہے۔

بٹھل داس پھر خیال میں غرق ہوگئے۔

(۲۸)

سدن کا عقد شانتا کے ساتھ ہوگیا۔ جھونپڑا خوب سجایا گیا تھا۔وہی منڈپ کا کام دے رہا تھا۔ لیکن زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ بابو بٹھل داس، لالہ بھگت رام اور چند دیگر اصحاب شریک ہوگئے تھے۔

پدم سنگھ اسی دن مکان چلے گئے۔ پنڈت مدن سنگھ سے ساری کیفیت بیان کی۔ وہ یہ سنتے ہی آگ ہوگئے۔ بولے،''میں اس چھوکرے کا سر کاٹ لوں گا۔ وہ اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔'' بھاما نے کہا،''میں آج ہی جاتی ہوں۔ اسے سمجھاکر لاؤں گی۔ ابھی نادان لڑکا ہے۔ اس کٹنی سمن کی باتوں میں آگیا ہے۔ میرا کہنا ضرور مان جائے گا۔''

لیکن مدن سنگھ نے بھاما کو ڈانٹا، اور دھمکاکر کہا۔ ''اگر تم نے ادھر جانے کا نام لیا۔ تو اپنا اور تمھارا گلا ایک ساتھ گھونٹ دوں گا۔ وہ آگ میں کودتا ہے، کودنے دو۔ ایسا دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ یہ سب اس کی ضد ہے۔ بچّہ کو بھیک منگواکر نہ چھوڑوں تو کہنا۔ سوچتے ہوں گے دادا مرجائیں گے۔ تو چین سے زندگی کاٹوں گا۔ منہ دھو رکھیں۔ یہ کوئی موروثی

جائداد نہیں ہے یہ میری اپنی کمائی ہے۔ سب کی سب کرشن کے نام وقف کردوں گا۔ ایک کانی کوڑی تو ملے گی نہیں۔"

گاؤں میں چاروں طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لالہ بیجناتھ کو یقین کامل ہوگیا کہ دنیا سے دھرم اٹھ گیا۔ جب لوگوں کو ایسے ایسے نیچ کام کرنے کی جرأت ہونے لگی۔ تو دھرم کہاں رہا، نہ ہوئی نوابی۔ نہیں تو آج بچہ کی دھجیاں اڑجاتیں۔ اب دیکھیں کون منہ لے کر گاؤں میں آتے ہیں۔

پدم سنگھ رات کو بہت دیر تک بھائی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ لیکن جوں ہی سدن کا کچھ ذکر چھیڑتے مدن سنگھ ان کی طرف ایسی غضبناک نظروں سے دیکھتے کہ ان کو بولنے کی ہمت نہ پڑتی آخر جب وہ سونے چلے تو پدم سنگھ نے مایوسانہ ہمت کے ساتھ کہا، "بھیا سدن آپ سے الگ رہے تب بھی وہ آپ کا لڑکا ہی کہلائے گا۔ وہ جو کچھ نیک یا بد کرے گا۔ اس میں سارا خاندان شریک سمجھا جائے گا۔ جو لوگ اصلی حالات سے واقف ہیں۔ وہ چاہے ہم کو معذور سمجھیں۔ لیکن عوام ہمارے اور سدن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرسکتے۔ تو اس سے کیا فائدہ کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے۔ ایک طرف دو برائیاں ہیں ۔ بدنامی بھی ہوتی ہے۔ اور لڑکا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک ہی برائی ہے۔ بدنامی ہوگی۔ لیکن لڑکا اپنے ہاتھ میں رہے گا۔ اس لیے مجھے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم لوگ چل کر سدن کو سمجھائیں۔ اور اگر وہ کسی طرح راضی نہ ہو۔ تو............۔"

مدن سنگھ نے بات چھین کر کہا۔ "تو اس چڑیل سے اس کا بیاہ ٹھان دیں۔ کیوں یہی نہ کہنا چاہتے ہو۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ ایک بار نہیں، ہزار بار نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئے۔ اور ذرا دیر کے بعد پدم سنگھ کو نفریں کرتے ہوئے بولے۔ "تعجب یہ ہے۔ کہ سب کچھ تمھارے سامنے ہوا۔ اور تمھیں ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ اس نے ناؤ لی۔ جھونپڑا بنایا۔ دونوں چڑیلوں سے سانٹھ گانٹھ کی۔ اور تم آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ میں نے تو اسے تمھارے بھروسے پر وہاں بھیجا تھا۔ یہ کیا جانتا تھا۔ کہ تم کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہتے ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری سے کام لیا ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب جب ساری گوٹیاں پٹ گئیں۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔ تو چلے ہو وہاں سے مجھے صلاح

دینے۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مجھے تمھاری طرف سے اگر علانیہ حمایت نہیں۔ تو چشم پوشی کا شک ضرور ہے۔ میں نے تم سے بہت برے سلوک کیے تھے۔ اس کا تم نے بدلہ لیا۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ کل صبح اٹھ کر ہبہ نامہ لکھ دو۔ تین پائی جو موروثی جائداد ہے۔ اسے چھوڑکر میں باقی ساری جائداد کرشن کے نام وقف کرتا ہوں۔ یہاں نہ لکھ سکو تو وہاں سے لکھ کر بھیج دینا۔ میں اسے دیکھ کر دستخط کردوں گا۔ اور اس کی رجسٹری ہوجائے گی۔"

یہ کہہ کر مدن سنگھ سونے چلے گئے۔ لیکن پدم سنگھ کے قلب پر ایسا قاتل وار کرگئے۔ کہ وہ ساری رات تڑپتے رہے۔ جس الزام سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنے اصولوں کی بھی پرواہ نہ کی اور اپنے طبقہ میں محجوب ہونا پسند کیا۔ وہ الزام سر پر آہی گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بھائی کے دل میں میل پڑگیا۔ انھیں اب اپنی غلطی نظر آرہی تھی۔ بے شک اگر انھوں نے زیادہ معاملہ فہمی سے کام لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن یہ خیال کسی قدر تسکین کا باعث تھا۔ کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ایک بیگناہ کی زندگی تو ٹھکانے لگ گئی۔

صبح کو جب وہ گھر سے چلنے لگے۔ تو بھاما روتی ہوئی آئی۔ اور بولی۔"بھیا ان کی ضد تو دیکھ ہی رہے ہو۔ کہ لڑکے کی جان لینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن تم ذرا سوچ سمجھ کر کام کرنا۔ بھول چوک تو بڑے بڑوں سے ہوجاتی ہے۔ وہ بے چارہ تو ابھی نادان لڑکا ہے۔ تم اس کی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ اسے کسی کی ٹیڑھی نگاہ بھی برداشت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں دیس بدیس کی راہ لے۔ تو میں کہیں کی نہ رہوں۔ اس کی سدھ لیتے رہنا۔ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہاں رہتا تھا۔ تو ایک بھینس کا دودھ پی جاتا تھا۔ دال میں اسے گھی اچھا نہ لگتا تھا۔ لیکن میں اس سے چھپاکر لوندے کے لوندے ڈال دیتی تھی۔ اب اتنی سیوا جتن کون کرے گا۔ نہ جانے بے چارہ کیسا ہوگا۔ یہاں گھر پر کوئی کھانے والا نہیں۔ وہاں وہ انھیں چیزوں کے لیے ترستا ہوگا۔ کیوں بھیا کیا اپنے ہی ہاتھ سے ناؤ چلاتا ہے؟

پدم سنگھ۔ نہیں دو ملاح رکھ لیے ہیں۔

بھاما۔ تب بھی دن بھر دوڑدھوپ کرنی ہی پڑتی ہوگی۔ مجور لوگ بنا دیکھے بھالے تھوڑے ہی کام کرتے ہیں۔ میرا تو یہاں کچھ بس نہیں ہے۔ اسے تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ اسے اناتھ سمجھ کر کھوج خبرلیا کرنا۔ میرا رویاں رویاں تمھیں اشیرباد دے گا۔ اب کے کاتکی

اسنان میں میں اسے ضرور دیکھنے آؤں گی۔ کہہ دینا تمھاری اماں تمھیں بہت یاد کرتی تھیں۔
بہت روتی تھیں۔ یہ سن کر اسے ڈھارس ہوجائے گی۔ اس کا دل بڑا کچا ہے۔ مجھے یاد کرکے
روز روتا ہوگا۔ یہ تھوڑے سے روپے ہیں لیتے جاؤ اس کے پاس بھیجوا دینا۔
پدم سنگھ۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو وہاں ہوں ہی۔ میرے دیکھتے اسے کسی بات کی
تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ تم اطمینان رکھو۔
بھاما۔ نہیں لیتے جاؤ کیا ہوا۔ اس ہانڈی میں گھی ہے۔ یہ بھی بھیجوا دینا۔ بازاری گھی گھر کے
گھی کو کہاں پہنچتا ہے۔ نہ یہ سگندھ نہ یہ سواد اسے اماوٹ کی چٹنی بھی اچھی لگتی ہے۔
تھوڑی سے اماوٹ بھی رکھے دیتی ہوں۔ میٹھے میٹھے آم چن کر رس نکالا تھا۔ سمجھاکر کہہ
دینا۔ "بیٹا کوئی فکر مت کرو۔ جب تک تمھاری ماں جیتی ہے۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہونے
پائے گی۔ میری تو وہی ایک اندھے کی لکڑی ہے۔ اچھا ہے تو۔ اپنا ہی ہے۔ برا ہے تو۔ اپنا
ہی ہے۔ دنیا کی لاج سے آنکھوں سے چاہے دور کردوں۔ لیکن من سے تھوڑے ہی دور
کرسکتی ہوں۔"

(۲۹)

جیسے نادر تخیل سے شعر میں جان پڑجاتی ہے۔ اور خوشنما رنگ سے تصویروں میں
اسی طرح دونوں بہنوں کے آنے سے جھونپڑے میں جان پڑ گئی ہے۔ اب وہ عاشق کا
کلبۂ احزاں نہیں۔ حسن کا مسکن اور ناز کی جلوہ گاہ ہے۔ اندھی آنکھوں میں پتلیاں پڑگئی
ہیں۔ ٹھونٹھ میں پھول کھل گئے ہیں۔
وہ مرجھائی کلی شانتا اب کھل کر ایک خوشنما، جاں نواز پھول ہوگئی ہے۔ سوکھی ہوئی
ندی امنگوں پر ہے۔ جس طرح جیٹھ بیساکھ کی دھوپ کی ماری ہوئی گائیں۔ ساون میں
نکھرجاتی ہیں۔ اور چراگاہوں میں کلیلیں کرنے لگتی ہیں۔ اسی طرح وہ برہ کی ستائی ہوئی حسینہ
اب نکھرگئی ہے۔ پریم میں مگن ہے۔
روز صبح کو جھونپڑے سے دو تارے نکلتے ہیں۔ اور جاکر گنگا میں ڈوب جاتے ہیں۔
ان میں ایک بہت روشن اور تیزرو ہے۔ دوسرا مدھم اور متین۔ صبح کی زریں شعاعوں میں
ان تاروں کی روشنی ماند نہیں ہوتی۔ وہ اور بھی جگمگا اٹھتے ہیں۔
شانتا گاتی ہے۔ سمن کھانا پکاتی ہے۔ شانتا اپنا سنگار کرتی ہے۔ سمن کپڑے سیتی ہے۔

ایک حال میں خوش ہے۔ دوسری یادِ ماضی سے بیزار۔ شانتا بھوکے آدمی کی طرح تھال پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ سمن کسی مریض کی طرح اپنی پچھلی بے اعتدالیوں پر ہاتھ مل رہی ہے۔

سدن کے طور و طریق میں بھی اب تغیر ہوگیا ہے۔ وہ اب دن چڑھے اٹھتا ہے۔ گھنٹوں نہاتا ہے۔ بال سنوارتا ہے۔ کپڑے بدلتا ہے۔ عطر ملتا ہے۔ نو بجے سے پہلے وہ اپنی نشست گاہ میں نہیں آتا۔ اور آتا بھی ہے تو جم کر بیٹھتا نہیں۔ اس کا دل کہیں اور رہتا ہے۔ پل پل بھر میں اندر جاتا ہے۔ اور اگر کسی سے بات چیت کرنے میں دیر ہوجاتی ہے۔ تو اکتانے لگتا ہے۔ شانتا اس کے دل و دماغ میں بس گئی ہے۔

سمن گھر کا بھی سارا کام کاج کرتی ہے۔ اور باہر کا بھی۔ وہ گھڑی رات رہے اٹھتی ہے۔ نہانے کے بعد سدن کا ناشتہ پکاتی ہے۔ پھر ندی کنارے جاکر ناؤ کھلواتی ہے۔ ملاحوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اور نو بجے پھر کھانا پکانے بیٹھ جاتی ہے۔ گیارہ بجے یہاں سے فرصت پاکر وہ پھر کوئی نہ کوئی کام کرنے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ ۹ بجے رات کو جب سب لوگ سونے چلے جاتے ہیں۔ تو وہ پڑھنے بیٹھتی ہے۔ تلسی کی رامائن سے اسے عشق ہے۔ کبھی بھگت مالا پڑھتی ہے۔ کبھی سوامی دیوی کانند کی تقریریں اور کبھی سوامی رام تیرتھ کے مضامین۔ وہ باکمال خواتین کے حالات بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ میرا سے اُسے بے حد عقیدت ہے وہ زیادہ تر مذہبی کتابیں ہی پڑھتی ہے۔

ملاّحوں کی عورتوں میں بڑی عزت ہے۔ وہ ان کے جھگڑے چکاتی ہے۔ کسی کے بچے کے لیے کُرتہ ٹوپی سیتی ہے۔ کسی کے لیے انجن یا گھٹی بنادیتی ہے۔ ان میں کوئی بیمار پڑتی ہے۔ تواس کے گھر جاتی ہے اور دوا دارو کی فکر کرتی ہے۔ وہ اپنی گری ہوئی دیوار کو ازسرنو اٹھارہی ہے۔ اس جوار میں سب مرد عورت اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اور اس کا جَس گاتے ہیں۔ ہاں اگر قدر نہیں ہے۔ تو اپنے گھر میں۔ محبت ایک محویت ہے۔ ایک جنون۔ جو انسان کو خودغرض بنادیتا ہے۔ سمن اس طرح جی توڑکر سارے گھر کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہے۔ لیکن سدن کے منہ سے کبھی شکریہ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی نہیں نکلتا، شانتا بھی اس کی کاوش اور تندہی کی کچھ وقعت نہیں کرتی۔ دونوں اس کی طرف سے بے فکر ہیں۔ گویا وہ گھر کی لونڈی ہے۔ اور چکی میں جتے رہنا ہی اس کا کام ہے۔ کبھی کبھی اس کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ کبھی دوڑدھوپ سے بخار چڑھ آتا ہے۔ تب بھی

وہ گھر کا کام حسبِ معمول کرتی رہتی ہے۔ لیکن ان دونوں کی نگاہیں بصارت سے اس قدر عاری ہوگئی ہیں۔ کہ انھیں اس کی حالت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تنہائی میں اپنی حالت پر گھنٹوں روتی ہے۔ لیکن کوئی ہمدردی کرنے والا کوئی آنسو پوچھنے والا نہیں۔

سمن خلقتاً خودپسند مغرور عورت تھی۔ وہ جہاں کہیں رہتی تھی۔ رانی بن کررہتی تھی۔ اپنے شوہر کے گھروہ سب تکلیفیں اٹھاکر بھی رانی تھی۔ بازارِحسن میں جب تک رہی اس کا سکّہ چلتا رہا۔ آشرم میں وہ دوسروں کی خدمت کرکے سب کی مخدومہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ممتاز بن کررہنے کی خوگر تھی۔ اس لیے یہاں اسے کس مپرسی کی حالت میں رہنا انتہا درجہ شاق گزرتا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ محنت کرتی۔ اور خوش رہتی۔ اگر سدن کبھی کبھی اس کی تعریف کیا کرتا۔ اس سے مشورہ لیاکرتا۔ اپنے گھر کی مالکن سمجھتا۔ اگر شانتا کبھی کبھی اس کے پاس بیٹھ کر اس کا دل خوش کرتی۔ اس کے سر میں تیل ڈالتی۔ اس کا جوڑہ باندھتی۔ لیکن وہاں تو دونوں محبت کے نشہ میں متوالے ہورہے تھے۔ نشانہ لگاتے وقت نگاہ صرف ایک مرکز پر رہتی ہے۔ محبت میں انسان کا یہی حال ہوتا ہے۔

لیکن سدن اور شانتا کا یہ تغافل صرف محویت اور جنون کے باعث سے تھا۔ اس میں شک ہے۔ سدن اس سے اس طرح محترز رہتا تھا۔ جیسے ہم جذام کے مریض سے دور رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمدردی ہونے پر بھی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ شانتا سمن سے بدگمان رہتی تھی۔ اس کے حسن سے خائف تھی۔ یہی خیریت تھی۔ کہ سدن خود ہی اس سے دوردور رہتا تھا۔ ورنہ شانتا فکر کے مارے مرہی جاتی۔ دونوں چاہتے تھے کہ یہ روئے سیاہ اور یہ مارآستین آنکھوں سے دور جائے لیکن تنگ ظرفی کے الزام کے خوف سے ان کو باہم کبھی اس مسئلہ پر زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

سمن کو رفتہ رفتہ یہ حقیقت صاف صاف نظر آتی جاتی تھی۔

ایک بار جیتن کہار شرماجی کے یہاں سے کچھ سوغات لے کر آیا۔ اس کے قبل بھی وہ کئی بار آیاتھا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی سمن چھپ جایا کرتی تھی۔ اب کے جیتن کی نگاہ اس پر پڑگئی۔ پھرکیا تھا اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ وہ پتھر کھاکر پچا سکتاتھا۔ لیکن کسی بات کے پچانے کی طاقت اس میں نہ تھی۔ ملاحوں کے چودھری کے پاس حقہ تمباکو کے بہانے سے گیا اور زہر اُگل آیا۔"ارے! یہ تو کسبی ہے۔ کھسم نے گھر سے نکال دیا۔ تو

ہمارے یہاں کھانا پکاتی رہی۔ وہاں سے نکالی گئی تو چوک میں جابیٹھی اب دیکھتا ہوں تو یہاں براج رہی ہے۔" چودھری سناٹے میں آگیا۔ عورتوں میں اشارہ بازیاں ہونے لگیں۔ اس دن سے کوئی ملاح سدن کے گھر کا پانی نہ پیتا تھا۔ ان کی عورتوں نے بھی سمن کے پاس آنا جانا ترک کردیا۔

اسی طرح ایک بار لالہ بھگت رام اینٹوں کی لدوائی کا حساب کرنے آئے۔ پیاس معلوم ہوئی۔ تو ملاح سے پانی لانے کو کہا۔ ملاح کنوئیں سے پانی لایا۔ سدن کے گھر میں بیٹھے ہوئے باہر سے پانی منگواکر پینا سدن کے سینہ میں چھری مارنے سے کم نہ تھا۔

بالآخر دوسرا سال جاتے جاتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ سدن ذرا ذراسی بات پر سمن سے جھنجلا جاتا۔ اور چاہے کوئی لاگو بات نہ کہے لیکن لہجہ کلام کافی طور پر دل شکن ہوجاتا تھا۔

سمن کو معلوم ہوگیا کہ میرا اب نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔ اس نے سمجھا تھا۔ کہ یہیں بہن بہنوئی کے ساتھ عمر تمام ہوجائے گی۔ گھر کا کام کاج کروں گی۔ ایک ٹکڑا کھاؤں گی۔ اور ایک گوشہ میں پڑی رہوں گی۔ لیکن افسوس! یہ تختہ بھی اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گیا۔ اور اب وہ بے رحم لہروں کے پیروں تلے تھی۔

لیکن سمن کو اپنی حالت پر افسوس کتناہی ہوا ہو۔ اسے شانتا یا سدن سے گلہ نہ تھا۔ کچھ تو دینیات کے مطالعہ اور کچھ اپنی حالت کے صحیح علم نے اسے غایت درجہ حلیم اور منکسر بنادیا تھا۔ وہ بہت سوچتی کہاں جاؤں۔ جہاں سب بیگانہ ہوں۔ کوئی اپنا شناسا نہ ہو۔ لیکن اسے ایسا کوئی مامن نظر نہ آتا تھا۔ اس کا قلب ضعیف ابھی تک ایک سہارے کا محتاج تھا۔ بلا کسی کے سہارے کے بسر اوقات کرنے کا خیال کرکے اس کا کلیجہ تھرتھر کانپنے لگتا تھا۔ وہ تنہا۔ بیکس۔ طوفان دنیا کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کرسکتی۔ کون میری حفاظت کرے گا؟ کون مجھے سنبھالے گا؟ یہ خوف اسے وہاں سے پاؤں نہ نکالنے دیتا تھا۔

ایک دن سدن دس بجے کہیں سے گھوم کر آیا۔ اور بولا،"کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے۔ جلدی کرو۔ مجھے پنڈت اماناتھ سے ملنے جانا ہے۔ چچا صاحب کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

شانتا نے پوچھا،"یہاں کیسے آئے؟"

سدن۔ اب یہ مجھے کیا معلوم۔ ابھی جیتن آکر کہہ گیا ہے۔ کہ وہ آئے ہوئے ہیں۔ اور آج ہی چلے جائیں گے۔ یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن (سمن کی طرف اشارہ کرکے) کسی وجہ سے نہیں آئے۔

شانتا نے سمن کی طرف آنکھیں مٹکا کر کہا، "تو ذرا بیٹھ جاؤ۔ ابھی یہاں گھنٹوں کی دیر ہے۔"

سمن نے جھنجلا کر کہا، "دیر کیا ہے۔ سب کچھ تو تیار ہے۔ آسن بچھادو۔ پانی رکھ دو۔ میں تھالی پر ستی ہوں۔"

شانتا۔ ارے تو ذرا ٹھہر ہی جائیں گے۔ تو کیا ہوگا۔ کوئی ڈاک چھوٹی جاتی ہے۔ کچا پکا کھانے سے کیا فائدہ؟

سدن ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ دن بھر کیا ہوتا رہتا ہے۔ ذرا سا کھانا پکانے میں اتنی دیر ہوجاتی ہے۔

سدن جب کھانا کھاکر چلاگیا۔ تو سمن نے شانتا سے پوچھا،"کیوں شانتی سچ بتا تجھے میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟ تیرے دل میں جو کچھ ہے۔ وہ میں جانتی ہوں۔ لیکن جب تک تو اپنی زبان سے دتکار نہ دے گی۔ میں جانے کا نام نہ لوں گی۔ میرے لیے کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔"

شانتا۔ بہن کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمھارے رہنے سے گھر سنبھلا ہوا ہے۔ نہیں تو میرے کیے کیا ہوتا۔

سمن۔ یہ منہ دیکھی باتیں مت کرو۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں۔ میں تم دونوں کو اپنی طرف سے کچھ کھنچا ہوا پاتی ہوں۔

شانتا۔ تمھاری آنکھوں کی کیا بات ہے۔ وہ تو دل تک کی باتیں دیکھ لیتی ہیں۔

سمن۔ نظریں ملاکر بولو۔ کیا جو کچھ میں کہتی ہوں۔ جھوٹ ہے؟

شانتا۔ جب تمھیں معلوم ہی ہے۔ تو پوچھتی کیوں ہو۔

سمن۔ اسی لیے کہ سب کچھ دیکھ کر بھی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہوتا۔ سنسار مجھے چاہے کتنا ہی حقیر سمجھے۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ میرے دل کے حالات سے واقف نہیں ہے۔ لیکن تم سب کچھ دیکھ کر بھی مجھے حقیر سمجھتی ہو۔ اس کا تعجب ہے۔ میں

تمھارے ساتھ قریب دوسال سے ہوں۔ اتنے دنوں میں میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوگئی ہوگی۔ کم سے کم ہونا چاہیے تھا۔

شانتا۔ نہیں بہن پرماتما سے کہتی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے اوپر اتنا بڑا الزام مت لگاؤ۔ تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیے ہیں.وہ میں کبھی نہ بھولوں گی۔ لیکن بات ہے۔ کہ ان کی بدنامی ہورہی ہے۔ لوگ من مانی باتیں اڑایا کرتے ہیں۔ وہ (سدن) کہتے تھے کہ سبھدرا یہاں آنے کو تیار تھیں۔ لیکن تمھارے رہنے کا حال سنا تو نہیں آئیں۔ بہن برا نہ ماننا۔ جب دنیا کا یہ حال ہورہاہے۔ تو ہم لوگ کیا کرسکتے ہیں۔

سمن نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اسے اجازت مل گئی۔ اب صرف ایک رکاوٹ اور تھی۔ شانتا تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں ہونے والی تھی۔ سمن نے اپنے تئیں سمجھایا۔ اس وقت اسے چھوڑکر چلی جاؤں۔ تو اسے تکلیف ہوگی۔ کچھ دن اور جھیل لوں۔ جہاں اتنے دن کاٹے ہیں۔ مہینہ دومہینہ اور سہی۔ میرے ہی باعث یہ اپنے عزیزوں سے الگ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں انھیں چھوڑکر جانا میرا فرض نہیں ہے۔

طائرہ پربریدہ قفس میں ہی عافیت پاتا ہے۔

(۳۰)

پنڈت پدم سنگھ کے چارپانچ مہینوں کے حسن عمل کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ بیس پچیس طوائفوں نے اپنی لڑکیوں کو یتیم خانہ میں بھیجنا قبول کرلیا۔ تین عورتوں نے اپنی جائداد یتیم خانہ کے لیے وقف کردی۔ اور پانچ عورتیں نکاح کرنے پر راضی ہوگئیں۔ نیک ارادے کبھی بے اثر نہیں ہوتے۔ اگر سماج کو یقین ہوجائے کہ آپ اس کے سچے خادم ہیں۔ تو وہ آپ کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ یقین خالص خادمانہ جوش کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک ضمیر پاک اور روشن نہ ہو۔ وہ اپنا عکس دوسروں پر نہیں ڈال سکتا۔ پدم سنگھ کے دل میں یہ جوش پیدا ہوگیا تھا۔ ہم میں کتنے ہی ایسے اصحاب ہیں۔ جن کے دماغ میں کوئی خدمت انجام دینے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اس خیال کی محرک ہماری حرص، نمود ہوتی ہے۔ ہم وہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ہمارا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہو۔ کوئی ایسی تصنیف یا مضمون لکھنا چاہتے ہیں۔ جس کی لوگ قدر کریں۔ اور اکثر ہماری کوششوں کا کچھ نہ کچھ صلہ بھی مل جاتا ہے۔ لیکن ہم جمہور کے دلوں میں گھر نہیں

کر سکتے۔ کوئی شخص چاہے وہ کیسی ہی مصیبت میں مبتلا ہو۔ اس آدمی سے اپنا دردِ دل کہنا نہیں چاہتا۔ جسے وہ اپنا سچا ہمدرد نہ سمجھتا ہو۔

پدم سنگھ کو دال منڈی میں جانے کے بہت موقعے ملے تھے۔ اور وہ ارباب نشاط کے طرزِ زندگی کا جتنا بھی مطالعہ کرتے اتنا ہی انھیں صدمہ ہوتا تھا۔ ایسی نازک اندام پری جمال حسینوں کو محض حظ نفس کے لیے اپنا سب کچھ گنواتے دیکھ کر ان کا دل درد سے بیتاب ہوجاتاتھا۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ انھیں اب محسوس ہورہا تھا۔ کہ یہ عورتیں اوصاف باطن سے خالی نہیں۔ جذبات حسنہ سے عاری نہیں، نیک وبد کے امتیاز سے بے بہرہ نہیں ہیں، لیکن نفس کی مطیع ہوکر ان کی ساری اخلاقی قوتیں مردہ ہوگئی ہیں۔ ہوس نے ان کی قوائے باطن کو مفلوج اور بے حس کردیا ہے۔ پدم سنگھ اس دام ہوس کو توڑنا چاہتے تھے۔ ان گم گشتہ حوروں کو راستہ پر لانا چاہتے تھے۔ اس بے خبری کو دور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جال اتنا مضبوط تھا اور نیند اتنی گہری کہ پہلے چھ مہینوں میں انھیں اس سے زیادہ کامیابی نہ ہوسکی۔ جس کا اوپر ذکر کیاگیا ہے۔ شراب کے نشہ میں انسان کی جو کیفیت ہوجاتی ہے۔ وہی حالت ان عورتوں کی ہوگئی تھی۔

ادھر پربھاکرراؤ اور ان کے رفیقوں نے اخراج کی تجویز کے منسوخ شدہ حصوں کو پھر بورڈ میں پیش کیا۔ انھوں نے محض پدم سنگھ سے بدگمان ہوجانے کے باعث ان دونوں حصوں کی مخالفت کی تھی۔ پر ان کا جوش اصلاح دیکھ کر وہ انھیں کے بنائے ہوئے اسلحہ سے ان پر وارکر بیٹھے۔ پدم سنگھ اس دن بورڈ میں نہ گئے۔ ڈاکٹر شیاما چرن نینی تال گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں حصے بالاتفاق پاس ہوگئے۔

بورڈ کی طرف سے علی پور کے قریب طوائفوں کے لیے مکانات بنوائے جارہے تھے۔ لالہ بھگت رام بڑی مستعدی سے کام کرارہے تھے۔ کچھ کچے مکانات تھے۔ کچھ پکے۔ کچھ دو منزلے۔ ایک مختصر سا بازار، ایک چھوٹا سا شفاخانہ۔ اور ایک مدرسہ بھی زیر تعمیر تھا۔ حاجی ہاشم نے ایک مسجد کی تعمیر شروع کردی تھی۔ اور سیٹھ چمن لال کی طرف سے ایک مندر بن رہاتھا۔ دیناناتھ پٹواری نے ایک باغ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ امید تو تھی۔ کہ وقت معین پر کام مکمل ہوجائے گا۔ لیکن بہت عجلت کرنے پر بھی تعمیر میں پورا ایک سال لگ گیا۔ بس اسی کی دیر تھی۔ دوسرے ہی دن طوائفوں کو دال منڈی چھوڑکر ان نئے

مکانات میں آباد ہوجانے کا نوٹس دے دیا گیا۔

لوگوں کو اندیشہ تھا کہ طوائفوں کی جانب سے سخت مخالفت ہوگی۔ لیکن انھیں یہ دیکھ کر پُر استعجاب مسرت ہوئی کہ طوائفوں نے خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ ساری دال منڈی ایک ہی دن میں خالی ہوگئی۔ جہاں شب و روز کی بہار رہتی تھی۔ وہاں شام ہوتے ہوتے سناٹا چھاگیا۔

محبوب جان ایک بوڑھی طوائف تھی۔ اس نے اپنی ساری ملکیت یتیم خانہ کے لیے وقف کردی تھی۔ شام کو سب طوائفیں اس کے مکان پر جمع ہوئیں۔ وہاں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ شہزادی نے دوران تقریر میں کہا "بہنو آج ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہمارے ارادوں میں برکت دے۔ اور ہمیں نیک راستہ پر لائے۔ ہم نے بہت دنوں تک بے شرمی اور ذلت کی زندگی بسر کی۔ بہت دنوں تک شیطان کی قید میں رہے۔ بہت دنوں تک اپنی روح اور ایمان کا خون کیا۔ اور بہت دنوں تک مستی اور عیش پرستی میں غافل رہے۔ اس دال منڈی کی زمین ہمارے گناہوں سے سیاہ ہورہی ہے آج خداوند کریم نے ہماری حالت پر رحم کرکے ہمیں قید معصیت سے نجات دی ہے۔ اس لیے ہمیں اس کا شکر کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری اکثر بہنوں کو یہاں سے جلاوطن ہونے کا قلق ہوتا ہوگا اور اس میں بھی شک نہیں کہ انھیں آنے والے دن دور تک تاریک نظر آتے ہوں گے۔ ان بہنوں سے میری یہی التجا ہے کہ خدا نے رزق کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے۔ آپ کے پاس وہ ہنر ہے جس کے قدردان ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن خدانخواستہ ہم کو آئندہ تکلیفیں بھی ہوں۔ تو جائے ملال نہیں۔ ہمیں جتنی بھی مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ اتنا ہی ہمارے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ میں پھر خدا سے دعاکرتی ہوں کہ وہ ہمارے دلوں کو اپنی روشنی سے منور کرے۔ اور ہمیں راہ نیک پر چلنے کی توفیق دے۔

رام بھولی بائی بولی "ہمیں پنڈت پدم سنگھ شرما کا دل سے ممنون ہونا چاہیے۔ پرماتما انھیں سدا سکھی رکھے۔"

زہرہ جان نے فرمایا، "میں اپنی بہنوں سے یہی عرض کرنا چاہتی ہوں کہ وہ آئندہ سے حلال اور حرام کا خیال رکھیں۔ گانا بجانا ہمارے لیے حلال ہے۔ اسی ہنر میں کمال حاصل کرو۔ بدکار رئیسوں کی شہوت کا کھلونا بننا چھوڑ دو۔ بہت دنوں تک گناہوں کی غلامی کی۔

اب ہمیں اپنے تئیں آزاد ہونا چاہیے۔ ہمیں کیا خدا نے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ اپنا حسن، اپنی جوانی، اپنی روح، اپنا ایمان، اپنی عزت، اپنی حیا، حرام کار، شہوت پرست آدمیوں کی نذر کریں۔ جب کوئی منچلا نوجوان رئیس ہمارے اوپر دیوانہ ہوجاتا ہے۔ تو ہمیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ ہماری نائکہ پھولی نہیں سماتی۔ سفروائی بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ اور ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سونے کی چڑیا پھنس گئی۔ لیکن بہنو! یہ ہماری حماقت ہے۔ ہم نے اسے اپنے دام میں نہیں پھنسایا۔ بلکہ خود اس کے دام میں پھنس گئے۔ اس نے سیم وزر سے ہمیں خرید لیا۔ ہم اپنی عصمت جیسی بے بہا جنس کو کھو بیٹھے۔ آئندہ سے یہ ہمارا وطیرہ ہونا چاہیے کہ اگر اپنے میں کسی کو کجروی پر مائل دیکھیں تو اسے برادری سے "خارج کردیں۔"

سندربائی نے دُرفشانی کی۔"زہرہ بہن نے یہ بہت اچھی تجویز کی ہے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اگر ہمارے یہاں کسی کی آمدورفت ہونے لگے۔ تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ اگر ہمیں اس سے محبت ہو۔ اور اسے بھی ہم سے انس ہو۔ تو شادی کرلینی چاہیے۔ لیکن اگر وہ محض شہوت پرستی کے ارادہ سے آتا ہو۔ تو اسے فوراً دتکار دینا چاہیے۔ ہمیں اپنی عزت کوڑیوں پر نہ بیچنی چاہیے۔"

رام پیاری نے کہا۔"سوامی گجانند نے ہمیں ایک کتاب دی ہے۔ جس میں لکھا ہے۔ کہ خوبصورتی ہمارے پہلے جنم کے نیک کاموں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی پہلی کمائی کو بھی اس جنم میں اڑا دیتے ہیں۔ جو بہنیں زہرہ جان کی تجویز کو پسند کرتی ہوں۔ وہ ہاتھ اٹھادیں۔"

اس پر بیس پچیس عورتوں نے ہاتھ اٹھائے۔

رام پیاری نے پھر کہا،"جو بہنیں اس تجویز کو پسند نہ کرتی ہوں۔ وہ بھی اپنے ہاتھ اٹھادیں۔"

اس پر ایک ہاتھ بھی نہ اٹھا۔

ضعیفہ محبوب جان نے فرمایا،"مجھے کچھ کہتے ہوئے خوف ہوتا ہے۔ کہ تم لوگ کہوگی۔ سو چوہے کھاکے بلّی حج کو چلی۔ پر آج کے ساتویں دن میں سچ مچ حج کرنے چلی جاؤں گی۔ میری زندگی تو جیسے کٹی ویسے کٹی۔ پر اس وقت آپ کی یہ نیت دیکھ کر مجھے جتنی خوشی ہوتی ہے۔ وہ میں ظاہر نہیں کرسکتی خدا تمھارے پاک ارادوں کو پورا کرے۔"

چند مستورات آپس میں سرگوشیاں کررہی تھیں۔ ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ باتیں انھیں ناگوار گزرر ہی ہیں۔ لیکن انھیں زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سفلہ خیالات پاک جذبات کے سامنے دب جاتے ہیں۔

مجلس ختم ہوئی۔ سارا مجمع برہنہ پا علی پور کی طرف چلا۔ جیسے زائرین متبرک مقامات کی طرف چلتے ہیں۔

دال منڈی میں اندھیرا چھایا ہواتھا۔ نہ طبلوں کی گمک تھی، نہ سارنگیوں کی الاپ، نہ نغمۂ دل نواز، نہ رنگین مزاجوں کے جھمگٹے۔ اناج کے کٹ جانے پر کھیت کی جو حالت ہوجاتی ہے وہی حالت بازارِ حُسن کی ہورہی تھی۔

(۳۱)

پنڈت مدن سنگھ کی کئی ماہ تک یہ کیفیت تھی۔ کہ جو کوئی ان کے پاس آتا۔ اسی سے سدن کی برائی کرتے۔ ناخلف ہے، آوارہ ہے، شودا ہے، لچا ہے۔ ایک کانی کوڑی تو دوں گا نہیں۔ بھیک مانگتے پھریں گے۔ تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ پدم سنگھ کو ہبہ نامہ لکھنے کے لیے کئی بار یاد دلایا۔ بھاما کبھی سدن کا چرچا کرتی تو اس سے بگڑ جاتے۔ گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیتے۔ جوگی ہوجاؤں گا۔ سنیاسی ہوجاؤں گا۔ مگر اس چھوکرے کا منہ نہ دیکھوں گا۔

اس کے بعد ان کے مزاج میں ایک انقلاب ہوا۔ انھوں نے سدن کا ذکر کرنا ہی چھوڑدیا۔ اگر کوئی اس کی برائی کرتا۔ تو کچھ اَن سُنے سے ہوجاتے۔ کہتے بھائی اب کیوں اسے کوستے ہو؟ جیسا اس نے کیا ہے۔ اس کی سزا آپ بھگتے گا۔ اچھا ہے یا برا ہے میرے پاس سے تو دور ہے۔ اپنے چار پیسے کماتا ہے، کھاتا ہے۔ پڑا ہے، پڑا رہنے دو۔ لالہ بیجناتھ ان کے بہت منہ لگے تھے۔ ایک دن وہ خبر لائے۔ کہ اماناتھ نے سدن کو کئی ہزار روپے دیے ہیں۔ اب ندی پار ایک مکان بن رہا ہے۔

ایک باغیچہ لگ رہا ہے۔ چونا پیسنے کی ایک کل لے لی ہے۔ خوب روپے کماتا ہے۔ اور اڑاتا ہے۔ مدن سنگھ نے جھنجلا کر کہا، "تو کیا چاہتے ہو۔ کہ وہ بھیک مانگے؟ دوسروں کی روٹیاں توڑے۔ اما ناتھ بے چارے اسے کیا روپے دیں گے۔ خود ٹکے ٹکے کو محتاج ہورہے ہیں۔ سدن نے جو کچھ کیا ہوگا۔ اپنی قوت بازو سے کیا ہوگا۔ وہ لاکھ برا ہو۔ لیکن اپاہج نہیں

ہے، نکما نہیں ہے۔ ابھی جوان ہے۔ شوقین ہے۔ اگر کماتا ہے۔ اور اڑاتا ہے تو کسی کو کیوں برا لگے۔ تمھارے اس گاؤں میں کتنے ہی لونڈے ایسے ہیں۔ جو ایک پیسہ نہیں کماتے۔ لیکن گھر سے روپے اڑالے جاتے ہیں۔ اور گل چھرے اڑاتے ہیں۔ سدن ان سے تو اچھا ہی ہے۔ منشی بیجناتھ بہت خفیف ہوئے۔

مسئلہ حرکت کے مطابق کچھ عرصہ کے بعد مدن سنگھ کے دل پر ایک عمل معکوس نے غلبہ کیا۔ دل ایک انتہا سے دوسری انتہا پر جا پہنچا۔ اب سدن کی صورت ہردم آنکھوں میں پھرا کرتی۔ اسی کی باتیں یاد آیاکرتیں سب سے اسی کا ذکر کیا کرتے۔ ''دیکھو تو کیسا ظالم ہے۔ بے ایمان مجھ سے روٹھنے چلا ہے۔ گویا میں گھر، زمین، مال اور اسباب۔ سب اپنے سرپر لادکر لے جاؤں گا۔ ایک بار یہاں آتے نہیں بنتا۔ پیروں میں مہندی رچاکے بیٹھا ہے۔ بے حیا کہیں کا۔ بے رحم مجھ سے دماغ کرتا ہے۔ کڑھ کڑھ کر مرجاؤں گا۔ تو بیٹھا میرے نام کو روئے گا۔ تب بھلے وہاں سے دوڑا آئے گا۔ ابھی نہیں آتے بنتا۔ اچھا دیکھیں تم مجھ سے بھاگ کر کہاں جاتے ہو۔ وہیں چل کر تمھاری خبر لیتا ہوں۔''

کھاپی کر اطمینان سے لیٹتے۔تو بھاما سے سدن کی باتیں کرنے لگتے،''یہ لونڈا لڑکپن میں بھی ضدی تھا۔ جس چیز کے لیے اڑجاتا تھا۔ اسے لے ہی کر چھوڑتا تھا۔ تمھیں یاد ہوگا۔ ایک بار میری پوجا کی جھولی کے لیے کتنا منھما متھ مچایا۔ اور اسے لے ہی کر چپ ہوا۔ بڑا ھٹیلا ہے۔ دیکھو! اس کی سخت دلی۔ ایک خط بھی نہیں ڈالتا۔ چپ چاپ کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہے۔ گویا ہم لوگ مرگئے۔'' بھاما یہ باتیں سنتی اور روتی۔ مدن سنگھ کے غرور خاندان نے محبت پدری کے آگے سر جھکا دیاتھا۔

اس طرح ایک سال سے زیادہ گزرگیا۔ مدن سنگھ باربار سدن کے پاس جانے کا ارادہ کرتے۔ مگر اس ارادہ پر عمل نہ کرسکتے۔ ایک بار اسباب بندھوا چکے تھے۔ پر تھوڑی دیر کے بعد اسے کھلوادیا۔ ایک بار اسٹیشن سے لوٹ آئے۔ ان کا دل غرور اور محبت کا کھلونا بنا ہوا تھا۔

اب گرہستی کے کاموں میں ان کی طبیعت نہ لگتی۔ کھیتوں میں وقت پر پانی نہ دیاگیا۔ فصل خراب ہوگئی۔ اسامیوں سے لگان کے روپے نہیں وصول کیے گئے۔ وہ بے چارے روپے لے کر آتے۔ لیکن مدن سنگھ کو روپے لے کر رسید دینی مشکل تھی۔ گڑ گھر میں

دھرے دھرے پگھل گیا۔ اسے بیچنے کی فکر نہ کی۔ بھاما کچھ کہتی تو جھنجلا پڑتے۔ "چولھے میں جائے یہ گھر بار۔ جس کے لیے سب کچھ کرتا تھا۔ جب وہی نہیں ہے۔ تو گرہستی کس کام کی ہے۔" اب انھیں محسوس ہوا۔ کہ میری ساری تمنائیں۔ ساری آل اندیشیاں، ساری مذہب پرستی۔ سارا شوق زیست صرف ایک بنیاد پر قائم تھا۔ اور وہ بنیاد سدن تھا۔

ادھر کئی مہینوں سے پدم سنگھ بھی مکان پر نہیں آئے تھے۔ ایک مہم عظیم کے بعد دل پر کسل کا جو غلبہ ہوجاتاہے۔ وہی کیفیت اس وقت پدم سنگھ پر طاری تھی۔ مدن سنگھ ان کے پاس بھی خطوط نہ بھیجتے تھے۔ ہاں ان کے خطوط آتے۔ تو بڑے شوق سے پڑھتے۔ لیکن سدن کا کوئی ذکر نہ پاکر دل شکستہ ہوجاتے تھے۔

ایک دن مدن سنگھ دروازہ پر بیٹھے ہوئے پریم ساگر پڑھ رہے تھے۔ کرشن کی داستان طفلی میں انھیں بچوں کا سا لطف آتا تھا۔ شام ہوگئی تھی۔ حروف نظر نہ آتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت ایسی لگی ہوئی تھی۔ کہ اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دفعتاً کتوں کے بھونکنے نے کسی نوآئند کی خبر دی۔ مدن سنگھ کی چھاتی ڈھڑکنے لگی۔ کہیں سدن تو نہیں آرہا ہے! کتاب بندکرکے اٹھے۔ تو پدم سنگھ کو آتے دیکھا۔ "پوچھا سب خیریت ہے؟"

پدم سنگھ۔ جی ہاں سب ایشور کی دیا ہے۔

مدن۔ بھلا اس بے ایمان کی بھی کچھ کھوج خبر ملی ہے؟

پدم ۔ جی ہاں۔ اچھی طرح ہیں۔ دسویں پانچویں دن میرے یہاں آیا کرتے ہیں۔ میں بھی کبھی خیریت دریافت کرالیتا ہوں۔ کوئی تردد کی بات نہیں ہے۔

مدن۔ بھلا ظالم کبھی ہم لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یا بالکل مرا سمجھ لیا۔ کیا یہاں آنے کی قسم کھالی ہے۔ ہم لوگ مرجائیں گے۔ تب آئے گا؟ اگر اس کی یہی منشا ہو۔ تو ہم لوگ کہیں کی راہ لیں۔ اپنا گھربار لے۔ اپنا انتظام کرے۔ سنتا ہوں وہاں مکان بنوارہا ہے۔ وہ تو اس مکان میں رہے گا۔ اور یہاں کون رہے گا؟ یہ کس کے لیے چھوڑے دیتا ہے؟

پدم ۔ جی نہیں۔ مکان وکان تو کہیں نہیں بنواتے۔ یہ آپ سے کسی نے جھوٹ ہی اڑادیا۔ ہاں ایک چونے کی کل کھڑی کرلی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ ندی پار تھوڑی سی زمین بھی لینا چاہتے ہیں۔

مدن ۔ تو اس سے کہہ دینا۔ پہلے یہاں آکر گھر میں آگ لگاجائے۔ تب وہاں جگہ زمین جو

چاہے خریدے۔

پدم ۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ وہ محض آپ لوگوں کی ناخوشی کے خوف سے یہاں نہیں آتا۔ آج اسے معلوم ہوجائے۔ کہ آپ نے اس کی خطا معاف کردی۔ تو سر کے بل دوڑ آئے۔ میرے پاس آتا ہے۔ تو گھنٹوں آپ ہی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ آپ کی مرضی ہو تو وہ کل یہاں حاضر ہوجائے۔

مدن ۔ نہیں میں اسے بلاتا نہیں۔ ہم اس کے کون ہوتے ہیں۔ کہ وہ یہاں آئے گا۔ لیکن یہاں آئے تو کہہ دینا۔ ذرا اپنی پیٹھ مضبوط کررکھے۔ اسے دیکھتے ہی میرے سر پر شیطان سوار ہوجائے گا۔ اور میں ڈنڈا لے کر پل پڑوں گا۔ احمق مجھ سے روٹھنے چلا ہے۔ تب نہیں روٹھا تھا۔ جب میرے پوجا کے وقت پوتھی پر رال ٹپکاتا تھا۔ کھانے کی تھالی کے پاس پیشاب کرتاتھا۔ اس کے مارے میرے کپڑے صاف نہ رہنے پاتے تھے۔ اجلے کپڑوں کو ترس کے رہ جاتا تھا۔ مجھے صاف کپڑے پہنے دیکھتا تو بدن میں دھول مٹی لپیٹے ہوئے آکر سر پر سوار ہوجاتا۔ تب کیوں نہیں روٹھتا تھا۔ آج روٹھنے چلا ہے۔ اب کے ایسی گوشمالی کروں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔

دونوں بھائی گھر میں گئے۔ بھاما بیٹھی ہوئی گائے کو بھوسی کھلا رہی تھی۔ پدم سنگھ کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اور بولی،"بھلا تمھارے درشن تو ہوئے۔ چارقدم پر رہتے ہو۔ لیکن اتنا بھی نہیں ہوتا کہ مہینہ میں ایک بار تو جاکر دیکھ آئیں کہ گھروالے مرے یا جیتے ہیں۔ کہو کشل سے تو ہو؟

پدم سنگھ۔ ہاں سب آپ کی دعا ہے۔ کہو کھانا کیا پک رہا ہے۔ مجھے اس وقت کھیر، حلوا اور ملائی کھلاؤ تو وہ مژدہ سناؤں۔ کہ پھڑک جاؤ۔ پوتا مبارک ہو۔

بھاما کے افسردہ چہرہ پر مسرت کی سرخی چھاگئی۔ اور آنکھوں کی پتلیاں پھول کی طرح کھل گئیں۔ بولی،"چلو گھی شکر کے مٹکے میں ڈبا دوں۔ جتنا کھاتے بنے کھاؤ۔"

مدن سنگھ نے منہ بناکر کہا،"ارے! یہ تم نے بری خبر سنائی۔ کیا ایشور کے دربار میں الٹا انصاف ہوتا ہے۔ میرا بیٹا چھن جائے۔ اور اسے بیٹا مل جائے۔ اب وہ ایک سے دو ہوگیا۔ میں اس سے کیوں کر جیت سکوں گا۔ ہارنا پڑا۔ وہ مجھے ضرور کھینچ لے جائے گا۔ میرے تو قدم ابھی سے اکھڑ گئے ۔ سچ مچ ایشور کے یہاں برائی کرنے پر بھلائی ہوتی ہے۔

ہے الٹی بات یا نہیں؟ اب میں الٹی چال چلوں گا۔ آپ ہی منانے جاؤں گا۔ کے دن کا ہو؟"
پدم ۔ آج چوتھا دن ہے۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی ۔ ورنہ پہلے ہی دن آتا۔
مدن ۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم چھٹی تک پہنچ جائیں گے۔ بس کل سویرے چلو۔

بھاما پھولی نہ سماتی تھی۔ جی چاہتا تھا۔ کسے کیا دے دوں، کیا لٹادوں، امنگ ہورہی تھی۔ کہ گھر میں گانا ہو۔ دروازہ پر شہنائی بجے۔ پڑوسنیں بلائی جائیں۔ نغمۂ طرب سے سارا گاؤں گلزار ہوجائے۔ اسے ایسا معلوم ہورہا تھا۔ گویا آج دنیا میں ایک غیر معمولی واقعہ ہوگیا۔ گویا ساری دنیا اولاد سے محروم ہے۔ ایک میں ہی بیٹے پوتے والی خوش نصیب ہوں۔

ایک مزدور نے آکر کہا، "بھابی درواجے پر ایک سادھو آئے ہیں۔"

بھاما نے فوراً اتنی جنس بھیج دی جو چار آدمیوں کی خوراک سے بھی زیادہ تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بھاما اپنی دونوں لڑکیوں کو لے کر بیٹھ گئی۔ اور آدھی رات تک گاتی بجاتی رہی۔

(۳۲)

جس طرح کوئی آدمی طمع میں پڑکر کوئی زیور چرا لیتا ہے۔ لیکن بیدار ہونے پر اسے اس چیز کو دیکھنے سے بھی شرم آتی ہے۔ اسی طرح سدن بھی سمن سے محترز رہتا تھا۔ وہ اسے ذلیل سمجھتا تھا۔ اور اس کی توہین کرتا تھا۔

دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو اس کی طبیعت اس پیشہ سے بیزار ہوجاتی۔ بالخصوص چونے کے کام میں اسے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہ سوچتا اس سمن کے باعث میں گھر سے جلاوطن ہورہا ہوں اسی نے مجھے راندۂ درگاہ بنا رکھا ہے۔ کیسے آرام سے مکان پر رہتا تھا۔ چین سے کھاتا تھا۔ اور موج کرتا تھا۔ اسی نے میرے سرپر یہ مصیبت ڈال دی۔ اس کا پکاپکایا ہوا کھانا کھانے میں بھی اب اسے عار ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس سے گلا چھوٹ جائے۔ یہ وہی سدن ہے۔ جو سمن پر جان دیتا تھا اس کے دلآویز تبسم پر، اس کی نگاہ شوخ پر، اس کی شریں اداؤں پر نثار ہوتا تھا۔ پر آج سمن اس کی نگاہوں میں اس قدر گر گئی ہے!

سدن نے ادھر برسوں سے لکھنا پڑھنا چھوڑدیا تھا۔ اور جب سے چونے کی کل لے لی تھی تب سے اسے روزانہ اخبار دیکھنے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اب وہ سمجھتا تھا۔ اخبار

بنی ان لوگوں کا کام ہے۔ جنھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ جو سارے دن پڑے مکھیاں مارا کرتے ہیں۔ لیکن اپنے بالوں کو سنوارنے کے لیے، ہارمونیم بجانے کے لیے نہ جانے کیوں کر وقت مل جاتا تھا۔

کبھی کبھی پچھلی باتیں یاد کرکے وہ دل میں کہتا۔ اس وقت میں کیسا اندھا ہوا تھا۔ اسی سمن پر لٹو ہورہا تھا۔ اب وہ اپنی ثقاہت پر ناز کرتا تھا۔ ندی کے کنارے وہ روزانہ ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا تھا۔ لیکن کبھی اس کے دل میں فاسد خیالات نہ پیدا ہوتے۔ سدن اسے اپنا اخلاقی استحکام سمجھتا تھا۔

لیکن جب شانتا کے وضع حمل کا زمانہ قریب آیا۔ اور وہ زیادہ تر اپنے کمرہ میں مضمحل اور مجہول پڑی رہنے لگی۔ تو سدن کو معلوم ہوا کہ میں بڑے مغالطہ میں پڑا ہوا تھا۔ جسے میں اخلاقی استحکام سمجھتا تھا۔ وہ فی الواقع محض میری خواہشات کی سیری کا نتیجہ تھا۔ اب وہ شام کو کام کرکے واپس آتا تو شانتا کا روئے شگفتہ اس کا خیر مقدم نہ کرتا۔ وہ اپنی چارپائی پر اداس پڑی رہتی۔ کبھی اس کے سر میں درد ہوتا۔ کبھی جسم میں۔ کبھی بخار ہوجاتا۔ کبھی متلی ہونے لگتی۔ اس کا رخ روشن زرد ہوگیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ سدن کو اس کی یہ حالت دیکھ کر رنج ہوتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کا دل بہلایا کرتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے یہاں بیٹھنا ناگوار گزررہا ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھ آتا۔ نفس نے پھر سرکشی شروع کی خواہشات میں پھر ہیجان ہونے لگا۔ وہ نوخیز ملاحنوں سے مذاق کرتا۔ گنگا کنارے جاتا عورتوں کو پُراشتیاق نظروں سے دیکھتا۔ یہاں تک کہ ایک دن تقاضائے نفس سے بیتاب ہوکر دال منڈی کی طرف چلا۔ وہ کئی مہینوں سے ادھر نہیں آیا تھا۔ آٹھ بج گئے تھے۔ وہ ایک وارفتگی کے عالم میں قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ وہ کبھی دوقدم آگے چلتا۔ تب چپ چاپ کھڑا ہوکر کچھ سوچتا۔ اور پیچھے پھرتا۔ لیکن دوچار قدم چل کر پھر لوٹ پڑتا۔ اس وقت اس کی حالت اس مریض کی سی ہورہی تھی۔ جو خوان لذت سامنے دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور بدپرہیزی کے انجام کی مطلق پروا نہیں کرتا۔

لیکن جب وہ دال منڈی میں پہنچا تو وہاں وہ پہلے کی سی رونق نہ دکھائی دی۔ دوچار تمبولیوں کی دکانیں تھیں۔ لیکن ان پر رنگین مزاجوں کا ہجوم نہ تھا۔ حلوائیوں اور نان بائیوں

کی دکانیں بند تھیں۔ بالاخانوں پر ماہ رویوں کے جلوے نہ نظر آئے، نہ طبلے اور سارنگی کی صدائیں سنائی دیں۔ اب سدن کو یاد آیا کہ بازار حسن یہاں سے اٹھ گیا۔ اس کی طبعیت کچھ منقبض ہوگئی۔ لیکن ایک ہی لمحہ کے بعد اسے ایک عجیب مسرت کا احساس ہوا۔ گویا وہ کسی بے رحم سپاہی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ وہ سپاہی اسے کشاں کشاں لیے جاتا تھا۔ اس کے پنجہ سے اپنے تیئں چھڑا لینے کی اس میں قدرت نہ تھی۔ پر تھانہ میں پہنچ کر سپاہی نے دیکھا، کہ تھانہ بند ہے، نہ تھانیدار ہے، نہ کوئی کانسٹبل، نہ چوکیدار! سدن کو اب اپنے دل کی کمزوری پر ندامت ہوئی۔ اپنے استحکام پر اسے جو غرور تھا۔ وہ پاش پاش ہوگیا۔

وہ لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن جی میں آیا۔ کہ جب یہاں تک آیاہوں۔ تو خوب سیر ہی کیوں نہ کرلوں۔ آگے بڑھا تو وہ مکان نظر آیا۔ جس میں سمن رہتی تھی۔ وہاں ایک نغمۂ دل نواز کی صدا اس کے کانوں میں آئی اس نے تعجب سے اوپر دیکھا تو ایک سائن بورڈ لگا ہواتھا۔ اس پر لکھا ہواتھا۔ سنگیت پاٹ سالا، سدن اوپر چڑھ گیا۔ اس کمرے میں اس نے مہینوں سمن کی نازبرداریاں کی تھیں۔ وہ پچھلی صحبتیں اس کی نظروں میں پھرنے لگیں۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور گانا سننے لگا۔ بیس پچیس آدمی بیٹھے ہوئے گانا بجانا سیکھ رہے تھے۔ کوئی ستار بجا رہاتھا۔ کوئی پکھاوج۔ کوئی سرود۔ ایک بوڑھا استاد باری باری سے ان کی اصلاح کررہاتھا۔ وہ اس فن میں ماہر تھا۔ سدن کا گانا سننے میں ایسا جی لگا کہ وہ قریب آدھ گھنٹہ تک وہاں بیٹھا رہا۔ اسے بڑی خواہش ہورہی تھی کہ میں بھی یہاں گانا سیکھنے آیاکرتا۔ لیکن ایک تو اس کا مکان دور تھا۔ دوسرے رات کو عورتوں کو تنہا چھوڑکر یہاں آنا مشکل تھا۔

وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اتنے میں اسی بوڑھے استاد نے ستار پر یہ گیت گانا شروع کیا۔

دیا مئی ۔ بھارت کو اپناؤ

اس پد نے سدن کے دل میں اعلیٰ جذبات کا ایک چشمہ سا کھول دیا۔ فلاح قوم خدمت ملک اور قومی عروج کے ولولے اس کے دل میں جوش مارنے لگے۔ اس کا ساز قلب ان سروں سے گونج اٹھا۔ ایک دیوی کی روحانی صورت اس کی نگاہ باطن کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ ایک لاغر، نحیف خستہ حال غمگین بوڑھا عاجزانہ نظروں سے دیوی کی طرف دیکھ رہاتھا۔ اور دونوں ہاتھ اٹھائے دیوی سے الحاح کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

بھارت کو اپناؤ

سدن نے عالمِ خیال میں اپنے تئیں مفلس کسانوں کی دل جوئی کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ زمیندار کے کارندے سے منت کررہا تھا کہ ان بیکسوں پر رحم کرو۔ کسان اس کے پیروں پر گرپڑے تھے۔ ان کی عورتیں اسے دعائیں دے رہی تھیں۔ وہ خود اس خیالی بارات کا دولہا بنا ہوا تھا۔ وہ جب یہاں سے اٹھا تو قومی خدمت کا مصمم ارادہ کرچکا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دور چلا تھا۔ کہ اسے سندربائی کے مکان کے مقابل ایک ہجوم نظر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج یہاں کنورانردھ سنگھ ایک ''کسان سبھا'' قائم کرنے والے ہیں۔ سبھا کا مقصد یہ ہوگا کہ کسانوں کو زمینداروں کے دست ظلم سے بچائے۔ سدن کے دل میں ابھی ابھی کسانوں سے جو ہمدردی پیدا ہوگئی وہ سرد پڑگئی۔ وہ زمیندار تھا اور کسانوں پر رحم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یہ منظور نہ تھا۔ کہ کوئی زمیندار کو دباکر انھیں رعایتوں پر مجبور کرے۔ اس نے دل میں کہا۔ شاید یہ لوگ زمینداروں کے حقوق کے مخالف ہیں۔ ان کے اختیارات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اس لیے اب ہم کو بھی ہوشیار ہوجانا چاہیے۔ اور محافظت کی فکر کرنی چاہیے۔ طبع انسانی کو دباؤ سے کتنی نفرت ہے۔ سدن نے یہاں ٹھہرنا بیکار سمجھا۔ نوبج گئے تھے گھر لوٹ آیا۔

(۳۴)

شام کا وقت ہے۔ آسمان پر شفق چھائی ہوئی ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے لہروں کو گدگدا رہے ہیں۔ لہریں مسکراتی ہیں۔ اور کبھی کبھی کھل کھلاکر ہنس پڑتی ہیں۔ تب ان کے موتی کے سے دانت چمک اٹھتے ہیں۔ سدن کا خوشنما جھونپڑا آج پھولوں اور لتاؤں سے خوب سجا ہوا ہے۔ دروازے پر ملاحوں کی بھیڑبھاڑ ہے۔ اندر ان کی عورتیں بیٹھی ہوئی شادیانے گارہی ہیں۔ آنگن میں بھٹی کھدی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی ترنگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ آج سدن کے نوزائیدہ بچے کی چھٹی ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔

لیکن سدن بہت غمگین نظر آتا ہے۔ وہ سامنے چبوترے پر بیٹھا ہوا گنگا کی طرف تاک رہا ہے۔ اس کے دل میں انھیں موجوں کی طرح خیال کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ نہ! وہ لوگ نہ آئیں گے! آنا ہوتا۔ تو آج چھ دن گزرگئے۔ اب تک آ نہ جاتے۔ اگر میں جانتا۔ کہ وہ نہ آئیں گے۔ تو میں چچا صاحب کو بھی اس کی خبر نہ دیتا۔ ان لوگوں نے مجھے سمجھ لیا ہے کہ مرگیا۔ وہ مجھ سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے۔ میں جیؤں یا مروں۔ انھیں پروا

نہیں ہے۔ لوگ ایسی تقریبوں میں اپنے دشمن کے گھر بھی جاتے ہیں۔ میں دشمن سے بھی بدتر ہوں۔ محبت سے نہ آتے ۔ رسماً ہی آتے۔ دکھاوے کے لیے ہی آتے۔ مجھے معلوم ہوجاتا۔ کہ دنیا میں میرا کوئی ہے۔ اچھا نہ آئیں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کام سے مہلت پاؤں تو ایک بار میں خود وہاں جاؤں گا۔ اور ہمیشہ کے لیے نبٹارا کر آؤں گا۔ بچہ کیسا خوبصورت ہے! کیسے لال لال ہونٹ ہیں۔ بالکل مجھی کو پڑا ہے۔ ہاں آنکھیں شانتا کی ہیں۔ میری طرف کیسا ٹک ٹک تاکتا تھا۔ دادا کو تو میں نہیں کہتا۔ لیکن اماں اسے دیکھیں تو ایک بار گود میں ضرور لے لیں۔ دفعتاً سدن کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ اگر میں مرجاؤں تو کیا ہو؟ اس لڑکے کی پرورش کون کرے گا؟ کوئی نہیں، سنسار میں میرے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ نہیں نہیں دادا کو اس پر ضرور رحم آئے گا۔ وہ اتنے سخت دل نہیں ہیں۔ ذرا دیکھوں سیونگ بینک میں میرے کتنے روپے ہیں۔ ابھی ایک ہزار بھی پورے نہیں! زیادہ نہیں۔ اگر میں پچاس روپے ماہوار جمع کرتا جاؤں۔ تو سال میں چھ سو ہوجائیں گے۔ جونہی دوہزار پورے ہوئے۔ میں نے گھر بنوانا شروع کیا۔ دو کمرے باہر۔ پانچ کمرے اندر۔ دروازے پر محرابدار سائبان۔ پٹاؤ کے اوپر دو کمرے۔ جب ایسا مکان بنے تو البتہ کچھ زندگی کا لطف آئے۔ کرسی خوب اونچی دوں گا۔ کم سے کم پانچ فٹ۔ اس سے مکان کی شان دوبالا ہوجائے گی۔

سدن اسی خیالی پلاؤ کے مزے لے رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا تھا کہ ناگاہ اس نے سڑک کی طرف سے ایک گاڑی آتے دیکھی۔ گاڑی کی دونوں بتیاں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کون آرہا ہے؟ چچا صاحب کے سوا اور کون ہوگا! میرا اور ہے ہی کون؟

اتنے میں گاڑی قریب آگئی۔ اس میں سے مدن سنگھ اترے۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی۔ سبھدرا اور بھاما اس میں سے اتریں۔ سدن کی دونوں بہنیں بھی تھیں۔ جیتن کوچ بکس پر سے اتر کر لالٹین دکھانے لگا۔ سدن نے انھیں دیکھا۔ پر ان سے ملنے کے لیے دوڑا نہیں۔ وہ موقع گزر چکا تھا جب وہ انھیں منانے جاتا۔ اب اس کے روٹھنے کی باری تھی۔ وہ چبوترے پر سے اٹھ کر جھونپڑے میں چلاگیا۔ گویا کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ یہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے بغیر میں بے حال ہوا جاتا ہوں۔ لیکن جس

طرح انھیں میری پروا نہیں۔ اسی طرح میں بھی ان کی پروا نہیں کرتا۔

سدن جھونپڑے میں جھانک رہا تھا۔ کہ دیکھیں یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ جیتن نے آکر دروازے پر آواز دی۔ کئی ملّاح اِدھر اُدھر سے دوڑے۔ سدن باہر نکل آیا۔ اور دور ہی سے اپنی ماں کو پرنام کرکے ایک کنارے کھڑا ہوگیا۔

مدن سنگھ بولے۔ "تم تو اس طرح کھڑے ہو۔ گویا مجھے پہنچانتے ہی نہیں۔ میرے نہ سہی پر ماں کے قدم چوم کر دعا تو لے لو۔"

سدن نے بیگانہ پن سے کہا۔ "میرے چھونے سے آپ کا دھرم بگڑ جائے گا۔"

مدن سنگھ نے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا، "دیکھتے ہو ان کی باتیں۔ میں تم سے کہتا نہ تھا کہ وہ ہم لوگوں کو بھول گیا ہوگا۔ لیکن تم خواہ مخواہ کھینچ لائے۔ اپنے ماں باپ کو دروازہ پر کھڑے دیکھ کر بھی اسے درد نہیں آتا۔"

سدن اس سے زیادہ سردمہری نہ کرسکا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے باپ کے پیروں پر گر پڑا۔ مدن سنگھ بھی رونے لگے۔ اس کے بعد وہ ماں کے پیروں پر گرا۔ اس نے اٹھاکر چھاتی سے لگایا۔ اور دعائیں دیں۔ شفقت، سعادت اور عفو کا کیسا روشن، کیسا نشاط انگیز منظر تھا۔ ماں باپ کے دل مسرت سے اڈے ہوئے ہیں۔ اور بیٹے کے دل میں حسن ارادت کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ اس خلوصِ جذبات سے دل کے تاریک گوشے بھی روشن ہوگئے ہیں۔ غرور باطل اور خوف رسوائی حشرات کی طرح نکل بھاگے ہیں۔ اور وہاں اب حق اور انسانیت کا مسکن ہے۔

خوشی کے مارے سدن کے پیر زمین پر نہیں پڑتے۔ اب وہ ملّاحوں کو کوئی نہ کوئی کام کرنے کا حکم دے کر دکھارہا ہے۔ کہ میرا یہاں کتنا رعب ہے۔ کوئی چارپائی نکالنے جاتا ہے۔ کوئی گنگا جل لانے جارہا ہے۔ کوئی بازار دوڑا جاتا ہے۔ مدن سنگھ پھولے نہیں سماتے۔ اور اپنے بھائی کے کانوں میں کہتے ہیں، "یہ تو بڑا ہوشیار نکلا۔ میں سمجھتا تھا کہ کسی طرح پڑا ہوا دن کاٹ رہا ہوگا۔ لیکن یہاں تو بڑے ٹھاٹ ہیں۔"

ادھر بھاما اور سبھدرا اندر گئیں۔ بھاما حیرت سے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ کیسی صفائی ہے۔ سب چیزیں قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ اس کی بہن بڑی گن وان معلوم ہوتی ہے۔

دونوں زچہ خانہ میں گئیں۔ شانتا نے دونوں کے قدم چومے۔ بھاما نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا یہ کرشن کا اوتار ہے۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

تھوڑی دیر میں اس نے آکر مدن سنگھ سے کہا، "اور جو کچھ ہو پر تم نے بہو بڑی سندر پائی ہے۔ گلاب کا پھول ہے۔ اور لڑکا تو بھگوان کا اوتار ہی معلوم ہوتا ہے۔"

مدن سنگھ نے کہا، "ایسا صاحب اقبال نہ ہوتا تو۔ مدن سنگھ کو کھینچ کیوں کر لاتا۔"

بھاما۔ بہو بڑی سوشیل معلوم ہوتی ہے۔

مدن۔ تبھی تو سدن نے ماں باپ کو تیاگ دیا تھا۔

سب کے سب اپنی دھن میں مگن تھے۔ پر کسی کو خبر نہ تھی۔ کہ ابھاگنی سمن کہاں ہے؟

(۳۴)

سمن گنگا کنارے سندھیا کرنے گئی ہوئی تھی۔ لوٹی تو اسے جھونپڑے کے دروازہ پر گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ اس نے پدم سنگھ کو پہچانا۔ سمجھ گئی۔ کہ سدن کے باپ آگئے۔ وہ آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس کے پیروں میں بیڑی سی پڑگئی اسے معلوم ہوگیا کہ اب میرے لیے وہاں جگہ نہیں ہے۔ اب یہاں سے میرا ناتا ٹوٹتا ہے۔ وہ صورت تصویر کھڑی سوچنے لگی کہ کہاں جاؤں؟

ادھر ایک ماہ سے دونوں بہنوں میں خاصی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی وہ ہی شانتا، جو بدھوا آشرم میں سوز اور درد اور الم کی مورت بنی ہوئی تھی اب ہمیشہ سمن کو جلانے اور رُلانے پر آمادہ رہتی تھی۔ اس وقت شانتا کو ہمدرد کی ضرورت تھی۔ وہ ایک غمگسار کی طالب تھی۔ دردالفت نے اسے دردشناس، رفیق اور فیاض بنادیا تھا۔ پر اب اپنا پریم رتن پاکر اس کا دل کسی نوعروج آدمی کی طرح سخت اور خشک ہوگیا تھا۔ اسے یہ خوف کھائے جاتا تھا۔ کہ کہیں سدن سمن کے دام الفت میں اسیر نہ ہوجائے۔ سمن کو پوجاپاٹ ترک اور زہد کی اس نگاہوں میں کچھ وقعت نہ تھی۔ وہ اسے ریاکاری خیال کرتی تھی۔ سمن سر میں تیل ڈالنے یا صاف کپڑے پہننے کے لیے ترس جاتی تھی۔ شانتا اسے سمجھتی تھی۔ وہ سمن کے طور وطریق کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھاکرتی تھی۔ سدن سے سمن کو جو کچھ کہنا ہوتا۔ وہ شانتا

سے کہتی۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی شانتا کسی نہ کسی حیلہ سے رسوئیں میں آ بیٹھتی تھی۔ وہ وضع حمل کے قبل ہی سمن کو کسی طرح وہاں سے ٹالنا چاہتی تھی۔ کیونکہ زچہ خانہ میں مقید ہوکر وہ سمن کی قرار واقعی دیکھ بھال نہ کرسکے گی۔ اسے اور سب تکلیف منظور تھی۔ لیکن یہ جلن نہ سہی جاتی تھی۔

مگر سمن سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھتی تھی۔ سب کچھ سنتے ہوئے بھی کچھ نہ سنتی تھی۔ ندی میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح وہ اس سہارے کو چاہے وہ تنکا ہی کیوں نہ ہو نہ چھوڑسکتی تھی۔ پراس وقت سدن کے والدین کو وہاں دیکھ کر اسے یہ سہارا چھوڑنا پڑا۔ ارادہ جو کچھ نہ کرسکتاتھا وہ محل نے کر دکھایا۔ اس نے ندی میں ڈوبنے کا تہیہ کرلیا۔

وہ پاؤں دباتے ہوئے آہستہ آہستہ جھونپڑے کے پچھواڑے آئی اور کان لگاکر سننے لگی کہ دیکھوں یہ لوگ میرا کچھ چرچا تو نہیں کررہے ہیں۔ وہ آدھ گھنٹہ تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بھاما اور سبھدرا ادھر ادھر کی باتیں کررہی تھیں۔ آخر اس نے بھاما کو یہ کہتے ہوئے سنا۔"اب اس کی بہن یہاں نہیں رہتی کیا؟"

سبھدرا۔ رہتی کیوں نہیں۔ وہ کہاں جانے والی ہے۔

بھاما۔ دکھائی نہیں دیتی۔

سبھدرا۔ کہیں گئی ہوگی۔ گھر کا سارا کام وہی سنبھالے ہوئے ہے۔

بھاما۔ آئے تو اس سے کہہ دینا۔ وہیں باہر لیٹ رہے۔ سدن اسی کا بنایا کھاتا ہوگا؟

شانتا زچہ خانہ کے اندر سے بولی،"نہیں ابھی تک تو میں ہی بناتی تھی۔ آج کل وہ اپنے ہاتھ سے بنالیتے ہیں۔"

بھاما۔ تب بھی گھڑے برتن تو وہ چھوتی ہی ہوگی۔ یہ گھڑے مٹکے پھینکوادو۔ برتن پھر سے دھل جائیں گے۔

سبھدرا۔ باہر کہاں سونے کی جگہ ہے؟

بھاما۔ ہوچاہے نہ ہو۔ لیکن میں اسے نہ سونے دوں گی۔ ایسی عورت کا کیا اعتبار؟

سبھدرا۔ نہیں بہن۔ وہ اب ایسی نہیں ہے۔ وہ بڑے نیم دھرم سے رہتی ہے۔

بھاما۔ چلو۔ وہ بڑے نیم دھرم سے رہنے والی۔ سات گھاٹ کا پانی پی کے آج نیم والی بنی ہے۔ وہ اب دیوی ہوجائے۔ تو بھی میں اس کا اعتبار نہ کروں۔

سمن کو اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ رہی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے لوہا لال کر کے دل میں چبھا دیا۔ الٹے پاؤں لوٹی۔ اور اسی تاریکی میں ایک طرف کو چل کھڑی ہوئی۔

خوب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راستہ بھی صاف نظر نہ آتا تھا۔ پر سمن گرتی پڑتی چلی جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں؟ کدھر؟ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ لاٹھی کھا کر تیورائے ہوئے کتے کی طرح وہ بدحواس بھاگی چلی جاتی تھی۔ سنبھلنا چاہتی تھی۔ پر سنبھل نہ سکتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے پیر میں ایک بڑا کانٹا چبھ گیا۔ وہ پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چلنے کی طاقت نہ رہی۔

غشی کے بعد ہوش میں آنے والے آدمی کی طرح اس نے ادھر اُدھر چونک کر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ خوب گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صرف گیدڑ اپنا راگ بے سرا الاپ رہے تھے۔ یہاں میں اکیلی ہوں۔ یہ سوچ کر سمن کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ اکیلاپن کسے کہتے ہیں۔ یہ اسے آج معلوم ہوا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اکیلی ہوں۔ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ اسے اپنے چاروں طرف انواع و اقسام کی مخلوق فضا میں چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تنہائی میں واہمہ انتہا درجہ صورت کش ہو جاتا ہے۔

سمن سوچنے لگی ۔ میں کیسی بدنصیب ہوں۔ اور تو اور اپنی ہی سگی بہن اب میری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں نے اسے کتنا اپنانا چاہا۔ مگر وہ میری نہ ہوئی۔ میرے ماتھے پر کلنک کا داغ لگ گیا۔ اور وہ اب دھونے سے نہیں دھل سکتا۔ میں اس کو یا کسی غیر کو کیوں الزام دوں۔ یہ سب میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ آہ! ایڑی میں کیسا درد ہو رہا ہے۔ یہ کانٹا کیسے نکلے گا۔ اندر اس کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ کیسا ٹپک رہا ہے۔ نہیں میں کسی کو الزام نہیں دے سکتی۔ کانٹے تو میں نے بوئے ہیں پھل کون کھائے گا۔ میں کیسی اندھی ہو گئی۔ کہ محض نفس کی لذت کے لیے اپنی روح کا خون کر بیٹھی مجھے تکلیف ضرور تھی۔ میں گہنے کپڑے کو ترستی تھی، اچھا کھانے کو ترستی تھی، پریم کو ترستی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی زندگی اجیرن معلوم ہوتی تھی۔ مگر وہ حالت بھی تو میرے پچھلے جنم کے کاموں ہی کا نتیجہ تھی! اور کیا ایسی عورتیں نہیں ہیں۔ جو اس سے کہیں زیادہ مصیبتیں جھیل کر اپنی عصمت کو بچاتی ہیں۔ دمینتی پر کیسی کیسی آفتیں آئیں۔ سیتاجی کو رام چندر نے گھر سے نکال دیا۔ اور وہ برسوں جنگلوں میں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتی رہیں۔ ساوتری پر کیسے

کیسے سانحے گزرے۔ پر وہ ثابت قدم رہیں۔ اتنی دور کیوں جاؤں۔ میرے ہی پڑوس میں کتنی عورتیں رو روکر دن کاٹ رہی تھیں۔ امولا میں وہ بے چاری اہیرن کیسی کڑیاں جھیل رہی تھی۔ شوہر برسوں پردیس سے نہ آتا تھا۔ بے چاری فاقے کرکے پڑرہتی تھی۔ ہائے اسی حسن نے میری مٹی خراب کی۔ اپنے حسن کے غرور نے میری یہ حالت کی!

ایشور! تم پھول کے ساتھ کانٹا کیوں رکھ دیتے ہو؟ حسن دے کر من کو چنچل کیوں بنا دیتے ہو، میں نے حسین عورتوں کو اکثر چنچل ہی پایا۔شاید ایشور اس حکمت سے ہماری آزمائش کرتے ہیں روح کو حسن کی آگ میں ڈال کر اسے چمکانا چاہتے ہیں۔ پر افسوس! نفسانیت ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ہم اس آگ میں چمکنے کے بدلے جل جاتے ہیں!

یہ ٹیس کیسے بند ہو۔ جانے کس چیز کا کانٹا تھا۔ جو کوئی آکے مجھے پکڑلے تو کیا ہو۔ یہاں چلاؤں بھی تو کون سنے گا؟ ارے! یہ پتیاں کیوں کھڑکھڑا رہی ہیں؟ کوئی جانور تو نہیں آتا؟ نہیں ضرور کوئی نہ کوئی آرہا ہے۔

سمن کھڑی ہوگئی۔ اس کا جگر مضبوط تھا۔ وہ خوف پر غالب آگئی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی۔ بسنت کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سمن نے ساڑی سمیٹ لی۔ اور گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ اسے وہ دن یاد آیا۔ جب اسی موسم میں۔ اسی وقت وہ اپنے شوہر کے دروازہ پر بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ کہاں جاؤں۔ اس وقت وہ خواہشات کے جھکولے کھارہی تھی۔ آج اس پر سکونِ باطن غالب تھا۔

یکایک اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دیکھا کہ سوامی گجانند مرگ چھالا اوڑھے میرے سامنے کھڑے میری طرف نگاہِ رحم سے دیکھ رہے ہیں۔ سمن ان کے قدموں پر گر پڑی اور عاجزی سے بولی،"سوامی! مجھے بچایئے۔"

سمن نے دیکھا۔ کہ سوامی نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے،"ایشور نے اسی لیے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ بولو کیا چاہتی ہو؟ دولت؟

سمن۔ نہیں مہاراج دولت کی ہوس نہیں۔

سوامی ۔ عزت؟

سمن۔ نہیں مہاراج۔ اس کی بھی خواہش نہیں۔

سوامی ۔ اچھا تو سنو۔ ستیہ جگ میں آدمیوں کی مکتی گیان سے ہوتی ہے۔ دواپر میں بھگتی سے۔ ترتیا میں ستیہ سے۔ پر اس کلجگ میں اس کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ سیوا ہے۔ اس راستہ پر چلوگی۔ تو تمھاری مکتی ہوجائے گی۔ جو لوگ تم سے بھی بیکس، دکھی، مصیبتوں کے مارے ہیں۔ ان کی خبر لو۔ اور ان کی دعائیں تمھارے آڑے آئیں گی۔

سمن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ میں جاگ رہی تھی۔ اتنی جلد سوامی جی کہاں غائب ہوگئے۔ دفعتاً اسے ایسا معلوم ہوا کہ سوامی جی درختوں کے سایہ میں لالٹین لیے کھڑے ہیں۔ وہ اٹھ کر لنگڑاتی ہوئی ان کی طرف چلی۔ اس نے اندازہ کیا تھا کہ سوامی جی مجھ سے ایک سو قدم کے فاصلے پر ہوں گے۔ پر وہ ایک سو کے بدلے دوسو تین سو چار سو قدم چلی گئی اور وہ درختوں کا کنج اور ان کے سایہ میں سوامی جی لالٹین لیے اتنی ہی دور کھڑے تھے!

سمن کو شبہ ہوا کہ میں سوتو نہیں رہی ہوں۔ یہ خواب ہرگز نہیں ہے۔ اس نے زور سے چلاکر کہا، ’’مہاراج میں آتی ہوں۔ آپ ذرا ٹھہر جائیے۔‘‘

اس کے کانوں میں آواز آتی،’’ چلی آؤ۔ میں کھڑا ہوں۔‘‘

سمن پھر چلی۔ پر دوسو قدم چلنے پر وہ تھک گئی بیٹھ گئی۔ درختوں کا کنج اور سوامی جی جوں کے توں اس سے ایک سو گز کے فاصلہ پر نظر آتے تھے۔

دہشت کے مارے سمن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ اور پیر تھر تھر کانپنے لگے۔ اس نے چلانا چاہا پر منہ سے آواز نہ نکلی۔

سمن نے ہوش سنبھال کر خیال کرنا چاہا کہ یہ کیا راز ہے۔ میں کوئی بھوتوں کا تماشہ تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ لیکن کوئی دست غیب اسے اسی طرف کھینچے لیے جاتا ہے۔

وہ آگے چلی۔ اب وہ شہر کے قریب آگئی تھی۔ اسے نظر آیا کہ سوامی جی ایک کٹی میں چلے گئے۔ درختوں کا کنج غائب ہوگیا۔ سمن نے سمجھا یہی سوامی جی کی کٹی ہے۔ اسے اطمینان ہوا۔ اب سوامی جی سے ضرور ملاقات ہوگی۔ انھیں سے یہ حقیقت کھلے گی۔

اس نے کٹی کے دروازہ پر جاکر کہا، ’’سوامی جی۔ میں سمن ہوں۔‘‘

یہ کٹی گجانند ہی کی تھی۔ پر وہ سو رہے تھے۔ سمن کو کوئی جواب نہ ملا۔

سمن نے کٹی میں جھانکا۔ آگ جل رہی تھی۔ اور گجانند کمبل اوڑھے پڑے تھے۔

سمن کو حیرت ہوئی کہ یہ تو ابھی چلے آرہے ہیں۔ اتنی جلد سو کیوں کر گئے۔ اور وہ لالٹین کہاں چلی گئی۔ زور سے پکارا۔ "سوامی جی۔"

سوامی جی اٹھ بیٹھے اور تعجب سے سمن کی طرف دیکھ کر کہا،"کون، سمن؟"

سمن۔ ہاں مہاراج میں ہی ہوں۔

گجانند۔ میں ابھی تمھیں خواب میں دیکھ رہا تھا۔

سمن نے چکراکر کہا،"آپ تو ابھی ابھی کٹی میں آئے ہیں۔"

گجانند ۔ نہیں تو۔ مجھے سوئے ہوئے بہت دیر ہوئی۔ میں تو کٹی سے نکلا ہی نہیں۔ ابھی تمھارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا۔

سمن۔ اور میں آپ ہی کے پیچھے پیچھے گنگا کنارے سے چلی آرہی ہوں۔ آپ لالٹین لیے میرے سامنے چلے آتے تھے۔

گجانند نے مسکراکر کہا، "نہیں دھوکا ہوا۔"

سمن۔ دھوکا ہوتا۔ تو میں بلا دیکھے سنے یہاں کیسے پہنچ جاتی۔

یہ کہہ کر سمن نے اس وقت کا ماجرا کہہ سنایا۔

گجانند۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔

سمن۔ کوئی دیوتا تو نہیں تھے۔ جو آپ کی صورت بدل کر مجھے آپ کے پاس لائے ہیں۔

گجانند۔ یہ بھی ممکن ہے۔ تم نے جو کچھ کہا۔ وہی میں ابھی خواب میں دیکھ رہا تھا۔ اور تمھیں سیوا دھرم کا اپدیش کررہاتھا۔ سمن تم مجھے خوب جانتی ہو۔ میرے ہاتھوں تم نے بہت تکلیف جھیلیں ہیں۔ تم جانتی ہو۔ میں کتنی کمینی طبیعت کا آدمی تھا۔ اب ان بے رحمیوں کو یاد کرتا ہوں تو چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ تم عزت کے قابل تھیں۔ میں نے تمھارے ساتھ ظلم کیا۔ یہی ہماری مصیبتوں کا خاص سبب تھا۔ ایشور وہ دن کب لائیں گے، کہ یہاں عورتوں کی قدر ہوگی۔ عورت میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر۔ آدھے پیٹ روکھی روٹی کھاکر۔ جھونپڑے میں رہ کر۔ محنت مزدوری کرکے۔ سب طرح کی مصیبتیں جھیل کر آرام سے زندگی بسر کرسکتی ہے۔ صرف گھر میں اس کی قدر ہونی چاہیے۔ اس سے پریم ہونا چاہیے۔ عزت اور پریم کے بغیر کوئی عورت محلوں میں بھی سکھ سے نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس وقت میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہواتھا۔ تمھارے چلے آنے کے بعد جب

سادھو مہاتماؤں کی صحبت سے میری آنکھیں کھلیں۔ تب مجھے اپنی عاقبت کی فکر ہوئی۔ میرے پاس نہ گیان تھا۔ نہ علم تھا۔ اس لیے میں نے اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی راستہ میرے لیے سب سے آسان تھا۔ تب سے میں اسی راستہ پر چلنے کی کوشش کررہاہوں۔ اس راستہ پر چل کر میرے دل کو راحت ملی ہے اور میں تمھارے لیے بھی یہی راستہ سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں نے تمھیں بدھوا آشرم میں دیکھا۔ سدن کے گھر میں دیکھا۔ تم دل و جان سے خدمت کرنے میں مصروف تھیں۔ تمھارے دل میں رحم ہے پریم ہے۔ ہمدردی ہے۔ اور اس راستہ پر چلنے کے بھی یہی لوازمات ہیں۔ تمھارے لیے خدمت کا دروازہ تھامے وہ تمھیں اپنی طرف بلا رہی ہے۔ اس میں قدم رکھو۔ ایشور تمھارا کلیان کریں گے۔ سمن کو گجانند کے چہرہ پر ایک روحانی جلال کا جلوہ نظر آیا۔ اس کے دل میں ان سے باطنی ارادت پیدا ہوئی۔ بولی۔"مہاراج میں آپ ہی کو اپنا گرو مانتی ہوں۔ میں اپنے تئیں آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں۔ یہی عہد آپ سے میں نے ایک بار پہلے کیا تھا۔ لیکن اپنی نادانی کے باعث اسے پورا نہ کرسکی۔ وہ عہد میرے دل سے نہ نکلا تھا۔ آج میں سچے دل سے یہ عہد کرتی ہوں۔"

گجانند کو اس وقت سمن کے چہرہ پر خلوص باطن کی روشنی دکھائی دی۔ وہ بیتاب ہوگئے۔ وہ جذبات جنھیں وہ برسوں سے فنا کررہے تھے۔ پیدا ہونے لگے۔ زندگی کی دلفریبیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ انھیں اپنی موجودہ زندگی خشک، بے مزہ، ویران معلوم ہونے لگی وہ ان ترغیبات سے کانپ اٹھے۔ انھیں خدشہ ہوا کہ اگر یہ خیالات میرے دل میں جاگزیں ہوگئے تو میری برسوں کی عبادت اور عزت دم زدن میں خاک میں مل جائے گی۔ وہ بول اٹھے، "تمھیں معلوم ہے کہ یہاں ایک یتیم خانہ کھول دیاگیا ہے؟"

سمن ۔ ہاں اس کا چرچا سنا تھا۔

گجانند ۔ اس یتیم خانہ میں زیادہ تر وہی لڑکیاں ہیں۔ جنھیں طوائفوں نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ کوئی پچاس لڑکیاں ہوں گی۔

سمن۔ یہ سب آپ ہی کے اپدیش کا نتیجہ ہے۔

گجانند۔ نہیں۔ یہ پنڈت پدم سنگھ کی کارگزاری ہے۔ میں تو محض ان کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اس یتیم خانہ کے لیے ہمیں ایک سچے دل کی ضرورت ہے۔ اور وہ تمھیں میں ہے۔ میں نے

بہت تلاش کی۔ لیکن کوئی ایسی عورت نہ ملی۔ جسے اس کام سے سچا عشق ہو۔ جو ماں کی طرح لڑکیوں کی پرورش کرے۔ جو اپنی محبت سے ان کی ماں بن جائے۔ وہ بیمار پڑیں تو ان کی ایسی اصلاح کرے کہ ان کی پرانی ناہمواریاں مٹ جائیں۔ ایشور نے تمھیں فہم اور فراست دی ہے۔ درد اور ایثار ہے۔ اور تمھیں اس فرض کا بوجھ اٹھاسکتی ہو۔ میری یہ عرض قبول کروگی۔

سمن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سوامی گجانند میری نسبت ایسا حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس خیال سے اس کا دل سرشار ہوگیا۔ اسے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ کہ مجھ پر اتنا اعتماد کیاجائے گا۔ اور میں ایسی عظیم الشان خدمت بجالانے کے قابل سمجھی جاؤں گی۔ اسے یقین ہوگیا کہ پرماتما نے گجانند کی زبان سے یہ تحریک کی ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے اگر وہ کسی لڑکے کو کیچڑ میں لپٹا ہوا دیکھتی تو اس کے قریب نہ جاتی۔ لیکن گجانند نے اس پر اعتماد کرکے اس کے حس اشکراہ کو مسخر کرلیا تھا۔ ہم اپنے اوپر اعتماد کرنے والوں کو مایوس کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اور اکثر ایسے بوجھ اٹھانے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ جنھیں ہم پہلے ناقابل برداشت سمجھتے تھے۔ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

سمن نے عاجزی سے کہا، ''آپ لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔ یہ میری عین خوش نصیبی ہے۔ میں کسی کے کچھ کام آسکوں۔ کسی کی کچھ خدمت کرسکوں۔ یہ میری دلی تمنا تھی۔ آپ کے معیار تک پہنچنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ لیکن میں اپنے مقدور بھر آپ کی حکم کی تعمیل کرونگی۔''

یہ کہتے کہتے سمن کا سر جھک گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی زبان سے جو کچھ نہ ہوسکا۔ وہ اس کے انداز نے ظاہر کردیا۔ گویا وہ کہہ رہی تھی۔ یہ آپ کی شفقت ہے جو مجھ پر اتنا اعتماد رکھتے ہیں۔ کہاں مجھ جیسی گری ہوئی عورت اور کہاں یہ پاک خدمت! ایشور نے چاہا تو آپ کو اس اعتماد کے لیے پچھتانا نہ پڑے گا۔

گجانند بولے، ''مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوپھٹ رہی تھی۔ پپیہے کی رسیلی صدا کانوں میں آرہی تھی۔ انھوں نے اپنا کمنڈل اٹھایا۔ اور گنگا اشنان کرنے چلے گئے۔

سمن نے کٹی سے باہر نکل کر دیکھا۔ جیسے نیند سے جاگ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔

موسم کتنا سہانا ہے۔ کتنا پُر سکون، کتنا فرحت بخش! کیا اس کی آئندہ زندگی میں بھی سحر نمودار ہو گی۔ اس میں بھی کبھی صبح کی تنویر نظر آئے گی۔ کبھی آفتاب کی زریں شعاعیں چمکیں گی؟

(۳۵)

ایک سال گزر گیا۔ پنڈت مدن سنگھ پہلے تیرتھ یاترا پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا سدن کے گھر آتے ہی وہ ایک دن بھی نہ ٹھہریں گے۔ سیدھے بدری ناتھ پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ پر جب سے سدن گھر آگیا ہے انھوں نے کبھی بھول کر بھی تیرتھ یاترا کا نام نہیں لیا۔ پوتے کو گود میں لیے اسامیوں کا حساب کرتے ہیں۔ کھیتوں کی نگرانی کرنے جاتے ہیں۔ ہوس نے اور بھی جکڑلیا ہے۔ ہاں گھر میں بھاما کے سر سے اب فکر کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا ہے۔ اب اسے پڑوسنوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کے زیادہ موقع ملتے تھے۔ گھر کا کاروبار شانتا انجام دیتی ہے۔

پنڈت پدم سنگھ نے وکالت چھوڑدی۔ اب وہ میونسپلٹی کے چرمین ہیں۔ اس کام سے انھیں طبعی مناسبت ہے۔ شہر روزبروز ترقی کررہاہے۔ سال کے اندرہی اندر کئی نئی سڑکیں نکل گئی ہیں۔ اور تین نئے باغ تیار ہوگئے ہیں۔ اب ان کا ارادہ ہے۔ کہ یکہ اور گاڑی والوں کے لیے شہر کے باہر ایک محلّہ بنوادیں۔ شرماجی کے کئی پہلے کے دوست اب ان کے مخالف ہوگئے۔ اور کئی سابق کے مخالفین اب دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر مہاشے بٹھل داس پر ان کی عقیدت روزبروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ بہت چاہتے ہیں کہ مہاشے جی کو میونسپلٹی میں کوئی منصب دیں۔ پر بٹھل داس اس پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ بے غرض خدمت کے عہد کو توڑنا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے کہ صاحب منصب ہوکر میں شہر کی اتنی خدمت نہیں کرسکتا جتنی الگ رہ کر۔ ان کا بدھوا آشرم آج کل فروغ پر ہے۔ اور میونسپلٹی سے اسے معقول امداد ملتی ہے۔ آج کل وہ مزارعین کی امداد کے لیے ایک فنڈ کھولنے کی کوشش کررہے ہیں۔ جس سے کسانوں کو بیج وغیرہ کے لیے برائے نام سود پر روپیہ قرض دیا جائے۔اس کار خیر میں سدن ان کا داہنا بازو بنا ہوا ہے۔

سدن کی طبیعت اپنے گاؤں میں نہیں لگتی۔ وہ شانتا کو مکان پر چھوڑکر پھر گنگا کنارے آگیا ہے۔ اور اپنے کاروبار کو پھیلا رہاہے۔ اس کے پاس اب پانچ کشتیاں ہیں۔ اور

سینکڑوں روپیہ ماہوار نفع ہوتا ہے۔ اب وہ ایک اسٹیمر مول لینے کا ارادہ کررہا ہے۔

سوامی گجانند زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ انھوں نے غربا کی لڑکیوں کی حمایت پر اپنے تئیں وقف کردیا ہے۔ شہر میں آتے ہیں تو دوچار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتے۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ پدم سنگھ سبھدرا کو گنگا اشنان کرانے لے گئے تھے۔ لوٹتی بار وہ علی پور کی طرف سے چلے آتے تھے۔ سبھدرا گاڑی کے جھرکوں سے جھانک رہی تھی کہ یہاں ایسے سناٹے میں کوئی کیوں کررہتا ہوگا۔ ان کا جی کیسے لگتا ہوگا۔ دفعتاً اسے ایک عالی شان عمارت نظر آئی۔ جس کے دروازہ پر جلی حروف میں یہ سائن بورڈ لٹک رہاتھا۔

"سیوا سدن"

سبھدرا نے شرماجی سے پوچھا، "کیا یہی سمن بائی کا سیوا سدن ہے۔"

شرماجی نے اندازِ فکر سے کہا، "ہاں"۔ وہ پچھتا رہے تھے۔ کہ ناحق اس راستہ سے آیا۔ سبھدرا اب ضرور یتیم خانہ دیکھنے جائے گی۔ مجھے بھی اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ برا پھنسا۔ شرماجی نے اب تک ایک بار بھی سیوا سدن کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ گجانند نے بارہا چاہا کہ انھیں یہاں کھینچ لائیں۔ پروہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیلہ کرکے ٹال دیا کرتے تھے۔ وہ سب کچھ کرسکتے تھے۔ پر سمن سے دوبدو ہونا ان کے لیے غایت درجہ مشکل تھا۔ انھیں سمن کی وہ باتیں کبھی نہ بھولتی تھیں۔ جو اس نے انھیں کنگن دیتے وقت پارک میں کہی تھیں۔ ان کے دل سے کبھی یہ خیال نہ دور ہوتا تھا کہ ایسی پاک باطن، نیک سیرت عورت میری ہی حماقت کے باعث گمراہ ہوئی۔ میں نے ہی اسے کنوئیں میں گرایا۔

سبھدرا نے کہا، "ذرا گاڑی رکواؤ۔ میں اسے دیکھوں گی۔"

شرما جی۔ آج بہت دیر ہوگئی۔ پھر کبھی آجانا۔

سبھدرا ۔ سال بھر سے تو آرہی ہوں۔ پر کبھی نہ آسکی۔ اب دروازہ پر آگئی ہوں تو دیکھ ہی کیوں نہ لوں۔

پدم سنگھ۔ تم خود نہیں آئیں، کوئی روکتا تھا۔

سبھدرا ۔ بھلا جب نہیں آئی، تب نہیں آئی۔ اب تو آئی ہوں اب کیوں نہیں چلتے؟

پدم سنگھ ۔ چلنے سے مجھے انکار تھوڑے ہی ہے۔ صرف دیر ہوجانے کا خوف ہے۔ نو بجتے ہوں گے۔

سبھدرا ۔ یہاں کون بہت دیر لگے گی۔ دس منٹ میں تو لوٹ آئیں گے۔
پدم سنگھ ۔ تمھاری ضد کرنے کی پرانی عادت ہے۔ کہہ دیا کہ اس وقت مجھے دیر ہوگی لیکن مانتی نہیں ہو۔
سبھدرا ۔ ذرا گھوڑا تیز کردینا کسر پوری ہوجائے گی۔
پدم سنگھ ۔ اچھا تو تم جاؤ۔ اب سے شام تک جب جی چاہے لوٹنا۔ میں چلتا ہوں ۔ راستہ میں کوئی سواری کرایہ کرلوں گا۔
سبھدرا ۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں ابھی چلی آتی ہوں۔

پدم سنگھ گاڑی سے اترتے ہی بولے، ''میں چلتا ہوں۔ تمھارا جب جی چاہے آجانا۔''

سبھدرا اس ٹال مٹول کا باعث سمجھ گئی۔ اس نے 'جگت' میں کتنی بار 'سیوا سدن' کی تعریف دیکھی تھی۔ پنڈت پربھاکرراؤ کی سیوا سدن پر خاص نظر عنایت تھی۔ اس لیے سبھدرا کو اس یتیم خانہ سے ایک تعلق خاطر ہوگیا تھا۔ اور وہ دل میں سمن کا بہت احترام کرنے لگی تھی۔ وہ سمن کو اس نئی حالت میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ سمن اتنی نیچے گرکر کیوں کر روشن دل ہوگئی کہ اخباروں میں اس کی تعریفیں چھپتی ہیں۔ گاڑی سے اترکر آشرم میں داخل ہوئی۔

وہ جونہی برآمدے میں پہنچی کہ ایک عورت نے اندر جاکر سمن کو اس کے آنے کی اطلاع دی اور ایک لمحہ میں سبھدرا نے سمن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اس سادہ پوش سمن کو دیکھ کر حیرت میں آگئی۔ اس میں وہ نزاکت نہ تھی، نہ وہ شوخی تھی، نہ وہ رعنائیاں، نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں، نہ وہ ہنستے ہوئے ہونٹ۔ ملاحت اور شوخی کی جگہ متانت اور ثقاہت جھلک رہی تھی۔

سمن قریب آکر سبھدرا کے پیروں پر گرپڑی۔ اور بہ چشم پُرآب بولی، ''بہوجی آج میرے بھاگ دھن ہیں کہ تمھیں یہاں دیکھ رہی ہوں۔''

سبھدرا کی آنکھیں بھی بھرآئیں۔ اس نے فوراً سمن کو اٹھاکر سینے سے لگایا اور رقت آمیز لہجہ میں بولی، ''بائی جی۔ آنے کو تو بہت جی چاہتا تھا۔ لیکن فرصت ہی نہ ملتی تھی۔''
سمن۔ شرماجی بھی ہیں یا اکیلی آئی ہو؟
سبھدرا ۔ ساتھ تو تھے۔ پرانھیں دیر ہورہی تھی۔ ایک دوسری گاڑی کرایہ کرکے چلے گئے۔

سمن نے اداس ہوکر کہا،"دیر کیا ہوتی تھی۔ ان کی یہاں آنے کی طبیعت ہی نہیں تھی۔ میری بدنصیبی، افسوس صرف یہی ہے کہ جس یتیم خانہ کے وہ خود بانی ہیں۔ اس سے انھیں میرے ہی باعث نفرت ہے۔ میری دلی تمنا تھی کہ ایک بار تم اور وہ دونوں یہاں آتے۔ آدھی تو آج پوری ہوگئی۔ دوسری آدھی نہ جانے کب پوری ہوگی۔ وہ میری زندگی کا مبارک دن ہوگا۔"

یہ کہہ کر سمن نے سبھدرا کو یتیم خانہ کی سیر کرانی شروع کی۔ عمارت میں پانچ بڑے کمرے تھے پہلے کمرہ میں کوئی پچیس تیس لڑکیاں فرش پر بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اتالیقہ نے سبھدرا کو دیکھ کر مصافحہ کیا۔ سمن نے دونوں کا تعارف کرایا۔ سبھدرا کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ خاتون مسٹر رستم بھائی بیرسٹر کی بیوی ہیں۔ وہ روزانہ دو گھنٹے کے لیے یتیم خانہ میں لڑکیوں کو پڑھانے آیا کرتی تھیں۔

دوسرے کمرہ میں بھی اتنی ہی لڑکیاں تھیں۔ ان کی عمر آٹھ سے بارہ سال تک تھی۔ اس میں کوئی کپڑے کاٹتی تھی۔ کوئی سیتی تھی۔ اور کوئی اپنی قریب کی لڑکی کو چٹکیاں کاٹ رہی تھی۔ یہاں مدر کے بجائے ایک بوڑھا درزی بیٹھا ہوا تھا۔ سمن نے لڑکیوں کے بنائے ہوئے کرتے، جاکٹ وغیرہ سبھدرا کو دکھائے۔

تیسرے کمرہ میں پندرہ بیس چھوٹی چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ پانچ سال سے زیادہ کسی کی عمر نہ تھی۔ ان میں کوئی گڑیاں کھیلتی تھی۔ کوئی دیوار پر لگی ہوئی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ سمن خود اس درجہ کی معلمہ تھی۔

اس کے بعد سمن نے اسے باغیچہ کی سیر کرائی۔ یہاں کے گل بوٹے لڑکیوں ہی نے لگائے تھے۔ کئی لڑکیاں وہاں آلو، گوبھی کی کیاریوں میں پانی دے رہی تھیں۔ انھوں نے سبھدرا کو ایک خوبصورت گلدستہ پیش کیا۔

باورچی خانہ میں کئی لڑکیاں بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں۔ سمن نے سبھدرا کو ان لڑکیوں کے بنائے ہوئے اچار، مربے، سموسہ وغیرہ دکھائے۔

سبھدرا کو یہاں کا حسن انتظام، ترتیب، اور لڑکیوں کا سلیقہ اور اخلاق دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ سمن اتنے بڑے یتیم خانہ کا کیوں کر انتظام کرتی ہے۔ مجھ سے تو ہرگز نہ ہو۔ کوئی لڑکی میلی یا غمگین نہیں نظر آتی۔

سمن بولی، "میں نے یہ بوجھ اپنے سر لے تولیا ہے پر مجھ میں اس کے سنبھالنے کی قوت نہیں ہے۔ لوگ جو صلاح مشورے دیتے ہیں۔ انھیں پر عمل کرتی ہوں۔ آپ کو بھی جو کچھ عیب یا کمی نظر آئے وہ بتا دیجیے۔ جس سے یتیم خانہ کی بھلائی ہوگی۔"

سبھدرا نے ہنس کر کہا: "بائی جی مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے تو جو کچھ دیکھا ہے اسی پر حیران ہوں۔ تمھیں کیا صلاح دوں گی۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ایسا اچھا انتظام بدھوا آشرم میں بھی نہیں ہے۔"

سمن۔ آپ تکلف کررہی ہیں۔

سبھدرا ۔ نہیں سچ کہتی ہوں۔ میں نے جیسی اس کی تعریف سنی تھی اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ ہاں یہ بتلاؤ۔ ان لڑکیوں کی مائیں کبھی انھیں دیکھنے آتی ہیں۔

سمن ۔ آتی ہیں۔ پر میں زیادہ آمدورفت نہیں ہونے دیتی۔

سبھدرا ۔ اچھا ان کی شادیاں کہاں ہوں گی؟

سمن ۔ یہی تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہمارا فرض یہی ہے کہ ان لڑکیوں کو خانہ داری کے قابل بنادیں۔ قوم ان کی قدر کرے گی ۔ یا نہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی۔

سبھدرا ۔ بیرسٹر صاحب کی بیوی کو اس کام سے بہت پریم ہے کیا؟

سمن ۔ یہ کہیے کہ وہی اس یتیم خانہ کی روح ہیں۔ میں تو صرف ان کے حکم کی تعمیل کرتی ہوں۔

سبھدرا ۔ کیا کہوں۔ میں کسی قابل نہیں، ورنہ میں بھی یہاں کچھ کام کیا کرتی۔

سمن ۔ آتے آتے تو آپ آج آئی ہیں۔ اس پر شرماجی کو ناراض کرکے۔ شرماجی اب پھر آپ کو ادھر آنے ہی نہ دیں گے۔

سبھدرا ۔ نہیں اب کے اتوار کے دن میں انھیں ضرور لاؤں گی۔ بس میں لڑکیوں کو پان بنانا اور کھاکر سونا سکھلایا کروں گی۔

سمن ۔ ہنس کر ۔ اس کام میں آپ کتنی ہی لڑکیوں کو اپنے سے ہوشیار پائیں گی۔

اتنے میں دس بارہ لڑکیاں خوشنما کپڑے پہنے ہوئے۔ سبھدرا کے سامنے کھڑی ہوکر خوش الحانی سے گانے لگیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں

گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

سبھدرا یہ نغمۂ وطن سن کر بہت محظوظ ہوئی۔ اور پانچ روپے لڑکیوں کو انعام دیے۔ جب وہ چلنے لگی۔ تو سمن نے دردناک لہجہ میں کہا، ”میں اس اتوار کو آپ کی راہ دیکھوں گی۔“

سبھدرا ۔ میں ضرور آؤں گی۔

سمن ۔ شانتا تو خیریت سے ہے؟

سبھدرا ۔ ہاں خط آیا تھا۔ وہاں سب خیریت ہے۔ سدن تو یہاں نہیں آئے تھے؟

سمن ۔ وہ آئے تو نہیں۔ لیکن دو روپیہ ماہوار چندہ بھیج دیا کرتے ہیں۔

سبھدرا ۔ اب آپ بیٹھیے میں چلتی ہوں۔

سمن ۔ آپ نے یہاں آکر مجھ پر بڑا احسان کیا۔

سبھدرا ۔ اور میں تو آپ کے درشنوں سے تر ہوگئی۔ آپ کی سرگرمی، آپ کا حسن انتظام۔ آپ کی مروت اور اخلاق کس کس کی تعریف کروں۔ آپ واقعی اپنی جنس کا سنگار ہیں۔

سمن نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا،”میں تو اپنے تئیں آپ کی وہی لونڈی سمجھتی ہوں۔ میں جب تک جیوں گی۔ آپ لوگوں کا جس گاتی رہوں گی۔ آپ لوگوں نے میری بانہہ پکڑ کر بچا نہ لیا ہوتا۔ تو اب تک میں کب کی ڈوب گئی ہوتی۔ پرماتما آپ لوگوں کو سدا خوش و خرم رکھے۔“

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چنڈی گڑھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔

کلیاتِ پریم چند

2

مرتبہ: مدن گوپال